

واقف کربلا

اور اس کا پس منظر

www.KitaboSunnat.com

ایک نئے مطالعے کی روشنی میں

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَبِي بَرْزَةَ

ابن عباس بن عبد المطلب

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب

← عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔

← مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload)

کی جاتی ہیں۔

← دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹوکاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشر و اشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

← کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔

← ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

← نشر و اشاعت، کتب کی خرید و فروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

واقعہ کربلا

اور اس کا پس منظر

ایک نئے مطالعے کی روشنی میں

جدید ایڈیشن، اہم اضافوں اور ضروری ترمیمات کے ساتھ

مولانا عتیق الرحمن سنہلی

افغانستان بک ڈپو ۳۱- نیا گاؤں مغربی نظیر آباد لکھنؤ

(حقوق طبع محفوظ ہیں)

پانچواں ایڈیشن _____ ۲۰۰۸ء

صفحہ _____ ۳۱۶

کتابت _____ مولانا عبدالسیح

کمپیوٹر کمپوزنگ _____ پرنٹ لائن کمپیوٹرس، لکھنؤ

طباعت _____ کاکوری آفسیٹ پریس، لکھنؤ

ناشر _____ الفرقان بک ڈپو، نظیر آباد لکھنؤ

قیمت: -/۸۵ روپے صرف

یہ کتاب درج ذیل پتے سے بھی حاصل کی جاسکتی ہے

FURQAN PUBLICATIONS

90B HANLEY ROAD

LONDON N4 3DW (U.K.)

انتساب

والد ماجد حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے نام

جن کے

فیضِ قلب و نظر کے لئے

میری ساری زندگی ممنون ہے

اور

اسی فیض کا اثر میری نظر میں یہ کتاب بھی ہے

جو انھیں کے ارشاد کی تعمیل میں لکھی گئی۔

فہرست

واقعہ کربلا اور اس کا پس منظر

صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات
۲۹	اصلی بات جو کہنا تھی	۱	دیباچہ طبع سوم
۳۰	سنی معاشرے پر شیعیت کے اثرات	۷	مکاتیب گرامی ڈاکٹر محمد امجد اللہ صاحب (پیرس)
۳۱	حضور کی قربت کا احترام یا عصمت کا عقیدہ	۹	دیباچہ طبع دوم
۳۲	بے انصافی کی ایک مثال	۱۱	افتتاحیہ از والد ماجد حضرت مولانا نعمانی
۳۳	لکیر کی فقیری یا طلب علم و تحقیق	۱۱	بچپن کی باتیں
۳۷	مومن کا معیار اور اس کی ذمہ داری	۱۲	سنجھل کے ذہول
۳۹	اس کام کی ضرورت	۱۲	عشرہ محرم کے معمولات
۴۰	کچھ حوالوں کے سلسلہ میں	۱۳	ہمارے گھر کی مجلس
۴۱	تشکر و امتنان	۱۳	کچھ اپنا رونا رانا
باب اول - ۱		۱۳	تبدیلی کا آغاز
۲۳	شہادت عثمان - خانہ جنگی - صلح حنین	۱۵	شہرت عام کی تاثیر
۲۳	شہادت عثمان اور خانہ جنگی	۱۶	الفرقان ۳۷ کا مضمون
۲۳	جنگ جمل اور صفین	۱۷	یہ کتاب
۲۷	حضرت علی کی شہادت	۱۹	مقدمہ (از مصنف)
۲۷	حضرت حسن کی خلافت	۲۱	تاریخی روایتوں کا حال اور اس کی مثال
۲۸	عالی مقام بیٹا	۲۲	طبری کا اپنا اعتراف
۵۲	امن و بچھتی کے بیس سال	۲۳	پھر کونسی بات بعید ہے
۵۳	حضرت معاویہ اور حضرات حسنین	۲۳	کربلا کے واقعہ میں غلط بیانی کے اسباب
باب دوم - ۲		۲۵	کام مشکل بھی اور ضروری بھی
۶۱	کوئی مزاج - ریشہ دوانیاں - اور حضرت حسین	۲۶	ایک ناگزیر ضمنی بحث

۹۴	نہ صرف ابن عباسؓ بلکہ ابن ابوبکرؓ بھی	۶۱	اہل کوفہ
۹۷	ابن کثیر کا بیان	۶۵	حضرت حسینؓ کی رائے
۹۸	طبری کی روایت		
۱۰۰	ایک سوال اور اس کا حل		
۱۰۲	وفود کی کہانی		
؟	سوالیہ نشان		
۱۰۹	ابن اثیر اور حضرت معاویہؓ کا سفر حجاز		
۱۱۳	ایک لمحہ فکریہ		
۱۱۷	واقعہ کی قرین قیاس صورت		
۱۲۳	فیصلہ کن بات		
	باب ششم - ۶		
	یزید کی ولیدہ کی پر حضرت معاویہؓ کو اصرار کیوں؟		
۱۲۵	اور دیگر حضرات کو اس سے اختلاف کیوں؟		
۱۲۵	اصرار اور اس کی بنیاد	۸۱	حاصل کلام
۱۲۸	ابن خلدون کا کلام	۸۲	ایک اور پہلو
۱۳۲	اس کلام پر ایک تنقیدی نظر	۸۳	طبری کی روایت کا سقم
۱۳۷	اہل اختلاف کے اختلاف کی بنیاد	۸۴	ایک اور سوال
۱۴۲	یزید اپنے ایک خطبے کے آئینہ میں	۸۶	اور اب سند کی بات
۱۴۷	ضمیمہ - ایک اہم فائدہ		
	باب ہفتم - ۷		
	حضرت امیر معاویہؓ کی وفات - عہد یزید کا آغاز		
۱۵۱	حضرت حسینؓ کی ہجرت		
۱۵۱	یزید کو معاویہؓ کی وصیت		
۱۵۵	مخالفین سے بیعت کا مطالبہ		
	باب چہارم - ۴		
	ولیدہ کی راہ میں زیاد کا وجود رکاوٹ؟	۸۷	
	قرین قیاس بات	۸۹	
	ایک اور فائدہ -	۹۱	
	باب پنجم - ۵		
	ولیدہ کی بیعت اور مخالفین کا قصہ	۹۳	

۱۴۸	حسلے کی پسپائی اور مسلم بن عقیلؓ کی بے کسی	۱۵۶	اسی واقعہ کی دوسری روایت
باب نہم - ۹		۱۵۹	نتیجہ بحث
۱۸۱	قافلہ حسین اپنی آخری منزل کی طرف	۱۵۹	امام باقرؑ کی روایت
۱۸۲	حج سے ایک دن پہلے روانگی	۱۶۰	مکہ کو روانگی
۱۸۳	خیر خواہ ایک بار پھر روکتے ہیں	۱۶۱	پورے کتبہ کے ساتھ
۱۸۳	۱- حضرت عبد اللہ بن عباسؓ	۱۶۲	شاہراہ سے سفر
۱۸۶	۲- ابو بکر بن عبد الرحمنؓ	۱۶۲	خیر خواہوں اور عقیدہ مندوں کے مشورے
۱۸۷	۳- کنی اور مخلصین	۱۶۵	ایک اور روایت
۱۸۸	عبد اللہ بن جعفرؓ کی سعی	۱۶۶	دونوں روایتوں کے لہجے کا فرق
۱۸۹	والی حرمین کی طرف سے بھجرواکنے کی روایت	باب ہشتم - ۸	
۱۹۱	نوٹ کرنے کی بات	۱۶۹	مکہ میں ورود - اہل کوفہ کے خطوط - اور وفود
۱۹۲	ذی الحجہ ۸ یا ۱۰	۱۶۹	مسلم بن عقیلؓ کا مشن
	کربلا تک کی روداد سفر	۱۷۰	مسلم بن عقیلؓ کو کوفہ کو
۱۹۳	اور یوم شہادت کی روایتیں	۱۷۱	والی کوفہ حضرت نعمان بن بشیرؓ کا انتباہ
۱۹۵	فرزدق سے ملاقات	۱۷۱	امیر یزید کو شکایت
۱۹۷	انجام حضرت مسلمؓ کی خبر	۱۷۲	عبد اللہ بن زیاد کا تقرر
۱۹۸	ساتھیوں کو آگاہی	۱۷۲	کوفے میں تقریر
۱۹۹	واپسی کا مشورہ	۱۷۳	عملی کارائی
۲۰۰	حضرت محمد باقرؑ کی روایت	۱۷۳	مسلم کی تبدیلی مکان
۲۰۱	سمت سفر کی تبدیلی اور نزول کربلا	۱۷۳	ایک معرہ
باب دہم - ۱۰		۱۷۵	ایک اور معرہ
کربلا کی سرگذشت		۱۷۵	مزید بر آں
۲۰۳	عمر بن سعد کی آمد	۱۷۶	کیا ہونا چاہئے تھا؟
۲۰۳	صلح کی بات اور ناکامی	۱۷۷	جناب مسلمؓ کا انجام

باب یازدہم - ۱۱

۲۵۱	شہادت کے بعد کی کہانی
۲۵۱	خواتین کی بے حرمتی
۲۵۲	لاش کی بے حرمتی
	سر کی بے حرمتی
۲۵۲	اور باقیات قافلہ سے بدسلوکی
۲۵۳	تحقید کی ایک نظر
۲۵۴	تحمد بن مسلم کے تضادات
۲۵۷	قصر یزید میں
۲۵۹	حضرت محمد الباقری کی روایت اور یہ قصے
۲۶۳	امام ابن تیمیہ کا ارشاد

باب دوازدہم - ۱۲

۲۶۵	ایک نوشتہ تقدیر تھا جو پورا ہوا
۲۶۸	نوشتہ تقدیر کا راز؟
۲۶۸	حضرت حسین کا اقدام اور ابن تیمیہ
۲۷۳	ظلم کی ذمہ داری کس پر؟
۲۷۴	ابن زیاد کو سزا کیوں نہیں دی؟
۲۷۶	ابن زیاد کیوں بغد ہوا؟
۲۷۹	آہ یہ بے توفیقی
۲۸۱	اختتامیہ
۲۹۵	اشاریہ
۳۰۸	کتابیات

☆☆☆

۲۰۴	ایک دوسری روایت سے تائید
۲۰۶	جنگ اور شہادت
۲۰۸	خربن یزید دوسری روایات میں
۲۱۰	دونوں روایتوں میں تطبیق
۲۱۰	خربن کے کردار کی کچھ اور تفصیلات
۲۱۴	اور یوم عاشورہ کی باقی کہانی
۲۱۵	حضرت حسین اور رفقاء کی تقریریں
۲۲۱	معاملہ کا ایک اور پہلو
۲۲۳	زہیر بن قین کی تقریر
۲۲۶	ایک خاص نکتہ
۲۲۷	کبھی کچھ تصنیف
۲۲۷	مبارزانہ جنگ کے قصے
۲۲۸	صبح سے سہ پہر تک کے معرکے
۲۳۰	لپے وقت کے دامن میں لپٹے قصے
۲۳۲	دامان اہل بیت کے لیے ننگ
۲۳۴	سب سے بڑی مثال
۲۳۴	ایک تاویل لا طائل
۲۳۸	قصہ مختصر
۲۳۹	بندش آب
۲۴۰	معاملے کے کچھ اور پہلو
۲۴۲	روایت کی اندرونی شہادت
۲۴۳	اور خود راوی کے اوصاف
۲۴۵	خلاصہ کلام
۲۴۶	روایت حضرت باقر کی خطا
۲۴۸	نا قابل انکار حقیقت

دیباچہ طبع سوم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن جنوری ۱۹۹۲ء میں نکلا تھا۔ مصنف کے لیے کوئی سوال اس گمان کا نہ تھا کہ چھ مہینے کے اندر ہی دوسرے ایڈیشن کی ضرورت پیش آجائے گی۔ اس لیے دوسرا ایڈیشن جولائی ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا تو اس میں نظر ثانی کا وہ ضروری کام بالکل ہوسکا جس کے لیے کچھ مناسب مہلت درکار تھی۔ سوچ لیا گیا کہ جو کام رہ گیا ہے وہ انشاء اللہ تیسرے ایڈیشن میں ہوجائے گا جس کی ضرورت پیش آنے میں شاید زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ مگر کتاب کی منجانب اللہ مقبولیت کہ دوسرے ایڈیشن کے ساتھ ہی ساتھ مختلف مقامات پر۔ خاص طور سے پاکستان میں۔ لوگوں نے مصنف یا پبلشر کی اجازت کے تکلف میں پڑے بغیر ہی اپنے اپنے طور پر اس کے ایڈیشن نکال ڈالے، جن میں سے چار تو خود مصنف تک بھی پہنچے۔ اسکے بعد ظاہر ہے کہ لکھنؤ کے تیسرے ایڈیشن کی لوبت کہاں جلدی آسکتی تھی۔ تاہم اب وہ ضرورت پیش آچکی ہے اور یہ نیا ایڈیشن اب ان تمام اضافوں اور ترمیموں کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ جن کی ضرورت مصنف نے طبع اول کے بعد کتاب پڑھ کر خود محسوس کی یا بعض حضرات کے خطوط سے یہ ضرورت محسوس ہوئی۔

ترمیمات کا حصہ تو بہت معمولی سا ہے جزوی قسم کا ہے۔ البتہ اضافوں میں ایک تو مستقل ایک باب "اختتامیہ" کے عنوان سے آخر میں بڑھایا گیا ہے۔ اس کے بعد ایک مستقل اندکس ہے جس کی کمی خاص طور پر کتاب میں دل چسپی لینے والے اہل علم نے محسوس کی۔ ان دو مستقل اضافوں کے علاوہ باب اول اور باب دوم میں کئی صفحات کا اضافہ ہوا ہے۔ اور بعض مقامات پر حواشی

(۱) حاشیہ آئندہ صفحہ پر

بڑھائے گئے ہیں۔

انسان کا کوئی کام نقائص سے سو فی صدی خالی تو کسی منزل پر بھی نہیں ہو پاتا۔ لیکن ان اضافوں اور ترمیموں کے ذریعے کوشش کی گئی ہے کہ کتاب علمی اور تحقیقی حیثیت سے مزید بہتر معیار کو پہنچے اور اپنے موضوع پر زیادہ بہتر علمی و دینی خدمت ثابت ہو۔

کتاب کی اس پذیرائی کے پہلو بہ پہلو جس کی طرف اوپر کی سطروں میں اشارہ گزرا کچھ دوسرے قسم کے تبصرے اور تاثرات بھی سامنے آئے۔ چند الفاظ اس نئی اشاعت کے موقع پر ان کے بارے میں کہنا بھی مناسب ہوگا۔

یہ کتاب جیسا کہ اس کا نام بتا رہا ہے اس چودہ سو سالہ قدیم واقعے کے بارے میں دہی باتیں دہرانے کے لیے تو ظاہر ہے، نہیں لکھی گئی تھی جو باتیں مسلسل لکھی جاتی رہی ہیں اور لوگوں کو ازبر ہیں۔ نام کے اشارے کے علاوہ کتاب کے مقدمے سے اس کی ایک مختلف نوعیت کا بھرپور اظہار بھی ہوتا تھا۔ اس لیے یہ تو عین متوقع تھا کہ کتاب کا استدلال اور اس کا علمی اور تحقیقی انداز کتنا بھی ٹوٹا ہو جائے، پھر بھی ایک روایتی تصور پر اگر اس کے یہی ضرب پڑے گی تو ایسے لوگ ضرور ایک تعداد میں نکلیں گے جو ایک مخالفانہ رد عمل کا اظہار کریں، یا کم از کم کچھ چونکنے کا سرا۔ چنانچہ یہ دونوں ہی باتیں سامنے آئیں۔

چونکنے کا سرا اظہار کرنے والوں نے یہ تاثر دیا کہ اس میں زبردستی کچھ طرفداری نظر آتی ہے۔ یہ تاثر کتاب کی مجموعی طور پر تحسین کے ساتھ دیا گیا تھا۔ اس لیے کچھ زیادہ ہی قابل توجہ تھا۔ لیکن نظر ثانی

کلمہ
 (حاشیہ صفحہ گذشتہ کا) باب اول میں دو باتیں خاص طور سے اضافہ طلب تھیں ایک جنگ حمل اور جنگ مضمین کا ذکر آیا تھا تفصیل بالکل نہ تھی جس کی محسوس کی گئی۔ دوسرے جو بعض بڑے صحابہؓ حضرت علیؓ سے بیعت کر لینے کے باوجود ان جنگوں کے سلسلے میں آپ سے متفق نہ تھے ان کے مقابل میں حضرت علیؓ نے ہوئی جسٹا بالکل نہ ہو سکی تھی۔ ان دونوں کو تاہم ہونے کو ان اضافوں کے ذریعہ دور درستی کوشش کی گئی ہے۔ باقی میں کو بیوں کے مزاج و کردار کو کچھ تاریخی حوالوں کی روشنی سے اور زیادہ واضح کیا گیا ہے۔ اختتام میں کتاب کا خلاصہ اور کچھ مضامین دیے۔

کے لیے کتاب اول سے آخر تک بغور، بلکہ بار بار پڑھنے کے باوجود ہمیں کوئی لفظ اور کوئی عبارت ایسی نہ مل سکی جس میں اس تاثر کی تصدیق کا پہلو نظر آتا ہو اور اس لیے اس پر نظر ثانی کر لی جائے۔ تاثر دینے والے حضرات بھی کسی خاص مقام کی نشاندہی نہ فرما سکے۔ اس لیے ان کے اس تاثر کی بنیاد سوا کے سوا کچھ نہیں سمجھ میں آتی کہ یزید کے سلسلے میں دو باتیں جو روایتی اور شیعینی تصور کے خلاف کافی صراحت اور وضاحت سے آئی ہیں بس وہی ان کو یہ تاثر دے گئی ہیں۔ ۱۔ یہ کہ یزید کے خلاف حضرت حسینؑ کے موقف کے سلسلے میں جو یزید کے فسق و فجور کی بات لائی جاتی ہے اس کا کوئی ثبوت حضرت حسینؑ کی زبان سے بھی نہیں ملتا۔ ۲۔ یہ کہ اس کا ثبوت بھی فی الواقع دستیاب نہیں کہ ابن زیاد نے کربلا میں جو روایت حضرت حسینؑ کے خلاف اختیار کیا جس سے تاریخ میں کربلا کا المیہ ثبت ہو گیا۔ اس میں یزید کی مرضی بھی شامل تھی اور نہ اس کا کہ اس نے باقیات اہل بیت سے ان کو دمشق پہنچنے پر ناشائستہ برتاؤ بھی کیا۔ اس کی بھی روایتیں ہیں اور اس کے خلاف بھی۔

ان دونوں باتوں کے بارے میں ہم نے اپنے موقف کی ضروری وضاحت اس ایڈیشن کے آخری باب "اختتامیہ" میں کی ہے وہ انشاء اللہ قارئین کی نظر سے گزرے گی۔ یہاں البتہ اتنی بات یاد دلانی مناسب ہوگی کہ یزید کے بارے میں ایسی جو بات بھی لکھی گئی ہے جس سے اس کی روایتی شبہہ میں فرق پڑتا ہے وہ خود ہی بے دھڑک ہو کر نہیں بلکہ واقعی معنی میں "ڈر ڈر کر" لکھی گئی ہے چنانچہ ایسے ایک موقع پر یہ الفاظ بھی قلم سے نکل ہی گئے ہیں کہ :

"یزید کا معاملہ اتنا نازک ہے کہ اس کے حق میں بالکل سیدھی اور معقول

بات کہتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔" (مکمل ۱۳ طبع اول)

مگر تحقیق واقعہ کی نیت سے کیے جانے والے مطالعے میں جو بات واقعی نظر آتی ہے اسے ایک فریق کے حق میں اس لیے دبا جانا کہ شاید کچھ لوگ ناراض یا بدگمان ہو جائیں، یہ کوئی ایسا انداز بات تو نہیں ہو سکتی۔ اس لیے "ڈرتے ڈرتے" بھی بات تو کہنی لازم ہو جاتی ہے۔ اور نہ ہی حضرت حسینؑ کی عزت اس پر موقوف ہے کہ یزید کے بارے میں ہر برائی آنکھ بند کر کے مان لی جائے۔

جن لوگوں نے مخالفانہ رد عمل ظاہر کیا ان میں سے خاص طور سے ایک کا اظہار اس بات کا ایک مثالی نمونہ تھا کہ واقعہ کربلا کے روایتی تصور سے محبت نے ہمارے خوب اچھے پڑھے لکھے لوگوں کو بھی تیزائی شیعیت سے کس درجہ ہم آہنگ کر دیا ہے۔ یہ ہماری ایک ناموردینی درگاہ میں نظام تعلیم کی نگرانی کا منصب رکھنے والے ایک عالم و فاضل تھے، جنہوں نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کتاب اور صاحب کتاب کو توجہ کچھ کہا وہ اپنی جگہ رہا، صاف صاف لکھا کہ واقعہ کربلا بدر کی شکست کا بدلہ تھا۔ اصلی الفاظ یہ تھے:

..... انھوں (مصنف) نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ تاریخ کا کوئی حادثہ یا واقعہ ماضی سے جدا کر کے ایک اکائی کی شکل میں نہیں دیکھا جاسکتا، کربلا کا واقعہ جو امیاد و جنون کی دیرینہ عداوتوں کا ایک منطقی نتیجہ CONSEQUENCE تھا، وہ عداوتیں جو ظہور اسلام کے بعد بہت طاقتور شکل میں ابھر کر سہنے آئیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ۲۳ سالہ عرصہ نبوت میں ۲۱ سال تک بلکہ ساڑھے ۲۱ سال تک شد و مد سے قائم رہیں غزوہ بدر میں مسلمان فوج کی کامرانی نے جس طبقہ کو سب سے زیادہ برا فرودختہ کیا اسکے سربراہ ابرو سفیان تھے اسی طرح غزوہ احد میں ان کا اور ان کی اہلیہ جگر خوار حمزہ ہند کا کردار یہ سب وہ باتیں ہیں جن میں مؤرخین کا کوئی اختلاف نہیں ہے، فتح مکہ کے بعد یہ گروہ اسلام لایا (یا بقول سید قطب شہید کے استسلام کیا، مگر اس استسلام کے بعد اچانک ایک پل میں ایسی تبدیلی ہو گئی کہ وہ بدر کا عزم بھول گئے، اپنی امانیت کو بھول گئے عقلاً محال بات ہے اور صحاح کی مستند روایات سے ثابت ہے کہ ہندہ نے حجت کے الفاظ دہراتے ہوئے بھی اپنے اندر دنی کرب و عزم اور غیظ و غضب کا اظہار کیا تھا۔

..... اسلام کے پورے طور پر فاتح ہو جانے کے بعد جب مقاومت کی تمام راہیں مسدود ہو گئی تھیں اس عرصہ مختصر میں ہر گروہ کی طرف سے

لے اس کے ایک پہلو کا کچھ تذکرہ "اختتامیہ" میں آیا ہے وہاں اپنی نظر سے گزر لیا۔ لے فی الواقع اسلام نہیں قبول کیا بلکہ شکست پائی۔

کسی واضح دشمنی کا ثبوت تاریخ میں نہیں ملتا ہے مگر جس طرح انگریزوں کے دل میں صلیبی جنگوں کا عم و غصہ آج تک موجود ہے اسی طرح اس گروہ میں بدر کے انتقام کا جذبہ سینہ کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح جوش مارتا رہا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت نے البتہ اسلام کی طرف سے ان کے عناد کو ختم کیا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ان کا دل صاف نہیں ہوا۔“

اور پھر چند سطروں میں مصنف کو صحیح طریق تحقیق کا مشورہ دیتے ہوئے ان الفاظ پر اسے ختم کیا گیا ہے:

”اس حادثہ کا سراہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد سے نہیں غزوہ بدر کے واقعات سے مربوط کیا جائے تو تاریخی احداث کی کڑیاں ایک دوسرے سے زیادہ پیوست نظر آئیں گی۔“ ۱۷

اگر شیعی تبرائیت دل و دماغ پر حاوی نہ ہو چکی ہو تو آدمی اور بھی کچھ اگر نہ سوچ سکے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں! وہ لوگ جنہیں اہل سنت کے یہاں بلاشک و شبہ صحابہ اور صحابیات کا درجہ حاصل ہے ان کے بارے میں فتویٰ دے رہا ہوں کہ ان کے دل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صاف نہ تھے! کہہ رہا ہوں کہ بدر کے انتقام کی آگ ان کے سینوں میں بھڑکتی رہی تھی اور ان کے اسی جذبہ انتقام نے کربلا کے حادثے کی شکل اختیار کر لی! (یہ کچھ بھی آدمی اگر نہ سوچے) تب بھی غزوہ احد کا نام قلم پر آجانے کے ساتھ تو اُسے خیال آ ہی جانا چاہیے تھا کہ بدر کا انتقام تو اس دوسرے غزوے میں ان لوگوں نے حالت کفر ہی میں لے لیا تھا اور اتنا لے لیا تھا کہ کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے!

ہم نے کتاب کے مقدمہ میں لکھا تھا کہ

”واقعہ کربلا سے اور جو کچھ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، شیعیت کو اپنی دوکان چمکانے اور اپنے اثرات پھیلانے کا وہ بے پناہ موقع ملا ہے کہ کچھ کہا نہیں جاتا۔ اور اسی لیے ضرورت ہے کہ نہایت ٹھنڈے دل سے پورے معاملے کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔“ (مقدمہ ص ۲۲)

عہ گو یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ ۱۷ تعمیر حیات۔ لکھنؤ۔ ۱۰ مارچ ۱۹۹۲ء

لیکن یہ بات کہ شیعیت کے اثرات ہماری بڑی بڑی دینی درس گاہوں تک میں اس حد تک داخل ہو گئے ہیں اس کا اندازہ مقدمہ کی اس تحریر کے وقت بھی نہ تھا۔ فالی اللہ المشتکی۔

مصنف کے لیے نہایت اطمینان و مسرت کا مقام ہے کہ محترم ڈاکٹر محمد حمید الرحمن صاحب (پیرس) جیسے صاحبِ علم و فضل نے کتاب کو اپنی دلچسپی کے اظہار سے نوازا اور بعض گراں قدر مشورے بھی مصنف کو تجویز فرمائے۔

اس قابلِ مسرت بات کا ذکر بطور شکرِ نعمت یا تحذیرِ نعت، طبیعت کا تقاضہ تھا۔ مگر اس کے نتیجے میں ضرورتاً قرآن میں طبیعت کا تقاضہ ہو گا کہ ڈاکٹر صاحب زید لطفم کی تحریر بھی ان کے سامنے آئے۔ اس لیے اس سلسلے کے دو خط بھی نذرِ قارئین ہیں۔ آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

عقیق الرحمن سنہلی

لندن ۳۱ اکتوبر ۱۹۹۵ء

نوٹ: گذشتہ سال بعض حلقوں میں کسی غلط فہمی سے ڈاکٹر صاحب کی خبر و فوات شائع ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب بھلا لائے تا اب دم (۶/۱/۹۹) حیات ہیں۔ البتہ پرنسپل کے عوارض کے ساتھ۔ قارئین سے دعائے خیر کی درخواست ہے۔

۱۔ ان دونوں خطوط کا بعینہ عکس شائع کیا جا رہا ہے مگر ڈاکٹر صاحب کا غزبِ عید ہکا اور بادامی رنگ کا استعمال فرماتے ہیں۔ نتیجے میں عکس اچھا نہ آسکا اسلئے متعدد الفاظ کو پڑھنے کے قابل بنانے کیلئے ہکا ساٹچ (TOUCH) بھی دینا پڑا۔ خاص طور سے پہلے خط میں اس کی خاص ضرورت پڑی ہے۔

مکاتیب گرامی

محترم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب (پیرس)

(۱)

باسمہ تعالیٰ
Le Bureau de Transcription

Paris - 6 / France

۱۳ جمادی الاول ۱۴۱۳ھ

مخدوم و صرح ہر ظلم

سلام مسنون درجہ اولیٰ اور گمانہ
حیدر دہلی ہونے لگراں قدر سخیفہ " واقعہ کربلا اور اس کا منظر " ملا۔
سرفراز کیا۔ بعض دیگر نوریں مستحق لیریزوں کے تھامٹ رہے
سینا ظہیر ہوئی۔ ساف فرانس۔

ما سنا و اسد کتہ - معلومات سے بیترے
دو چیزیں عرصہ گزرتا ہوں جلدوں نہیں کہ میں راغ

بہتر ہو:
(۱) کاش کتاب میں استاریہ (انڈیکس) بھی ہوتا تاکہ

تلاش میں سہولت ہو
(۲) صورت عثمانہ کہ ہینا دست کے سلسلے میں ابن سبأ
اور اس کے ساتھیوں کی کار فرمائیوں کا ذکر مناسب ہوتا
کہ اس کے نتائج میں سے ایک واقعہ کربلا ہے۔ خاص کر صورت
عثمان کا عند مصر کے والی کے نام کہ محمد بن ابی بکر نے وہاں پہنچیں
تو ان کو قتل کر دیا جائے (دقیق) یہی وجہ سبأ کا کلام تھا۔

صفتکم اتقد و عا کلم

صاحب
محمد سعید

(۲)

با احترام
4, Rue de Taurin
Pisto - 6 / France

۱۹۹۳/۸/۱۲

مذہب الاحقرم مد ظلالکم

سلام مسنون درجہ اللہ دبر کا بندہ۔ کاؤ نمبر
سداہ آپ نے واقعہ کر بلا نامی تالیف مجھے بھیج کر میں
عمدت اجزاں فرمایا تھی۔ جزالکمال احسن الجزاء۔ اب تو یہ
مجھ یاد نہیں کہ رسید بھیجی یا نہیں۔ میں بچار رہا۔ آپ
بہت متفاحاتے ہیں مہربا۔ ابرہین ہوا۔ ابم جنزدی
پہرے ہیں کہ گھر آنے اجازت ملی لیکن علاج اب تک
جامد ہے۔ ۱۹۹۱ء میں ادب سے اتنا ہے کہ میرا
ظہور اعاف و تائیں۔ اب تالیف تالیف پرانے قرآن
ادا کر رہا ہوں۔ آپ کی اہم کتاب کو ہر دماغی مترجم
کیا ہے۔

کیا آپ میرے رسالے "جنگ جہاد میں اللہ اور
کا کردار" سے واقف ہیں؟ اگر ضرورت ہو تو اس کے
ڈنگر بڑی پاکستان اڈیشن کا عنوان سنا ہے ادا ہے خدمت

میرا سکوٹنگا۔

محمد سعید اللہ

دیباچہ طبع دوم

یہ کتاب اس سال جنوری میں شائع ہوئی تھی، مصنف کسی بنیاد پر بھی یہ توقع نہیں کر سکتا تھا کہ صرف چھ ماہ کے اندر اس کے دوسرے ایڈیشن کی نوبت آجائے گی۔ یہ محض اللہ رب العزت کا کرم ہے کہ جولائی میں دوبارہ پریس کو جا رہی ہے۔

ناشرین نے مجھ سے چاہا کہ اگر پہلے ایڈیشن کی طباعت میں کچھ غلطیاں رہ گئی ہوں یا کوئی ضروری ترمیم معمولی قسم کی ہو تو اس کی فہرست انھیں ہتیا کر دی جائے۔ میری نظر میں جو ایسی چیزیں آئی تھیں ان کی فہرست تیار تھی، وہ ناشرین کے حوالے کی جا رہی ہے۔ امید ہے کہ یہ دوسرا ایڈیشن ان تصحیحات اور ترمیمات کے ساتھ قارئین تک پہنچے گا۔ بعض کچھ ضروری اضافے بھی ذہن میں تھے لیکن اس وقت جو عجلت ناشرین کے پیش نظر ہے اس کی بنا پر یہ کام آئندہ کے لیے مؤخر رہے گا۔

شکر اور اعتراف کرم کے ساتھ اللہ ہی سے شکوہ بھی ہے کہ ایسے لوگوں کی طرف سے کتاب کے خلاف محاذ آرائی ہوئی ہے جن کے بارے میں محاذ آرائی تو کیا سادہ سی مخالفت کا اندیشہ بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہ چیز جہاں رنج و الم کی ہے وہاں اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کتاب کی جو ضرورت اس کے مقدمے میں بتائی گئی تھی وہ نہ صرف واقعی تھی بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ بڑے اور وسیع درجے کی تھی جس درجے کی مقدمے میں ظاہر کی گئی تھی۔ انشاء اللہ اس پر مزید روشنی

کتاب کے کسی اگلے ایڈیشن میں ڈالی جا سکے گی۔

والسلام !

عقیق الرحمن سنہلی

یکم محرم الحرام ۱۴۱۳ھ

مطابق ۳ جولائی ۱۹۹۲ء

۱۱/۲۸ حوض رانی ایکسٹینشن۔ نئی دہلی ۱۱

اقتناجبہ

از والد ماجد حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

یہ کتاب جیسا کہ آئندہ صفحات سے معلوم ہوگا، راقم مصنف کے والد ماجد حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی خواہش کا نتیجہ ہے، کتاب مکمل ہو جانے پر راقم نے گزارش کی کہ اگر مناسب خیال فرمایا جائے تو چند دعائیہ کلمات ملازم فرمائیے جائیں جن سے کتاب کا آغاز ہوا، ذیل کی المانی تحریر میری اسی خواہش کا نتیجہ ہے۔ عقیقۃ الرحمن سنہ ۱۳۵۷ھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اس عاجز (محمد منظور نعمانی) کا وطن سنہل (مراد آباد یوپی) ہے۔ ۱۳۲۳ھ (۱۹۰۵ء) سن پیدا ہوا ہے۔ سنہل مسلمانوں کی غالب اکثریت کی بستی ہے اور یہ سب سنی تھی ہیں۔ صرف ایک محلے میں جو شہر کے کسی کنارے پر ہے اور جسے میں نے آج تک دیکھا بھی نہیں ہے شیعہ صاحبان کی بھی کچھ آبادی ہے۔ یوں تو ہندوستان میں کم دیش سبھی جگہ سنیوں کے اندر بھی تعزیرہ داری کا رواج سراپتہ کیے ہوئے ہے۔ لیکن میرا خیال ہے۔ اور دوسرے لوگوں نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔ کہ سنہل کے سنیوں میں جس شان سے عزاداری منائی جاتی ہے اس شان کی عزاداری شاید ہی کہیں اور ہوتی ہو۔

بچپن کی باتیں

مجھے ۶-۷ سال کی عمر سے پورا شعور ہو گیا تھا اور ان چند برسوں کو چھوڑ کر جو تعلیم کے سلسلے میں باہر گزرے تقریباً تیس سال کی عمر تک زیادہ ترقیام وطن ہی میں رہا۔ ہمارا محلہ خالص سنی مسلمانوں کا محلہ ہے۔ اس کے اندر ۲۰-۲۵ گھروں میں تعزیرہ رکھے جاتے تھے، جن پر محرم کی پہلی

سے دسویں تک برابر چڑھائے چڑھائے جاتے تھے۔ جن گھروں میں بچے کم زندہ رہتے تھے ان گھروں میں امام حسینؑ کا فقیر بنایا جاتا تھا اور ہر بچے پھانسیے جاتے تھے، ہمارا نانا یہاں اس معاملے میں بہت آگے تھا۔ ایک قریبی رشتے کے ماموں فقرو کے نام سے مشہور تھے۔ میں بڑا ہو کر بھی ایک مدت تک سمجھتا رہا کہ ان کا نام اصل میں فخر الدین یا فخر الحسن ہوگا اور فقرو کہا جانے لگا بعد میں معلوم ہوا کہ اصل نام تو انوار حسین ہے لیکن بچپن میں امام حسینؑ کے فقیر بنادینے گئے تھے اسی سے فقرو کہے جاتے ہیں۔

سنہل کے ڈھول

سنہل کی تعریف داری کی دو خصوصیتیں شاید اپنا جواب نہ رکھتی ہوں گی۔ ایک تعزلیوں کی اونچائی (بعض تو تقریباً چالیس فٹ اونچے ہوتے تھے) اور دوسرے ڈھولوں کا سائز۔ بعض ڈھول تو اتنے بڑے ہوتے تھے کہ ان کے لیے گائے یا بھینس کی بہت بڑی کھال تلاش کرنا پڑتی تھی۔ ان میں سے بعض کے اندر سے آدمی کھڑا نکل آتا تھا اور بچے تو تقریباً سبھی ڈھولوں کے اندر سے اسی طرح نکل جاتے تھے۔ ہمارے خاص محلے میں کئی ایسے ڈھول تھے مگر ایک ڈھول جو چوک کا ڈھول کہلاتا تھا وہ ان میں سب سے بڑا تھا اور چونکہ ہمارے نانا کا مکان چوک میں واقع تھا اس لیے اس کو ہم اپنا ڈھول سمجھتے تھے اور اس پر فخر کیا کرتے تھے۔

عشرہ محرم کے معمولات

محرم کا ہینہ آیا اور ہزدی استطاعت گھر میں لازم ہو گیا کہ پہلی سے دسویں تک روزانہ کوئی میٹھی چیز کچے۔ عموماً میٹھے چاول یا حلویہ یا مالیدہ۔ اور مغرب کی نماز سے کچھ پہلے یا بعد میں گھر کا کوئی آدمی گھر کے دروازے پر وہ بیٹھا بچوان لے کر کھڑا ہوتا اور بچوں میں تقسیم کرتا۔ روزِ روضہ کے اس دس روزہ عمل سے چند ہی گھر محلے میں مستثنیٰ ہوں گے، انھیں میں سے ایک ہمارا گھر بھی تھا۔ ہمارا

گھر جو کچھ ہوتا تھا اس کا ذکر آگے آئے گا۔

محلے کا ایک گھرانہ رانفیبوں کا گھرانہ ہی کہلاتا تھا۔ اگرچہ تھے وہ سستی۔ ان کے یہاں امام بارہ تھا جس میں ایک کاٹھ کا تعزیہ رہتا تھا۔ ان کے یہاں ان دس دنوں میں رات کو مجلس ہوتی تھی اختتام مجلس پر حاضرین کو تہیہ رکھی ہوتی ایک (یادو) تندوری روٹی بطور تبرک ملتی تھی۔ دس دن برابر یہ سلسلہ چلتا تھا۔ اس دس روزہ مجلس کے علاوہ کم از کم ایک دن تو اس طرح کی مجلس اکثر گھروں میں ہی ہوا کرتی تھی۔ خود ہمارے گھر میں بھی یہ مجلس ۹ اور ۱۰ ارکی درمیانی شب یعنی شب شہادت میں ہوتی تھی

ہمارے گھر کی مجلس

والد ماجد مرحوم تعزیہ داری کے سلسلے کی چیزوں میں تو شرکت نہیں کرتے تھے بلکہ ایک حد تک اسے صحیح بھی نہیں سمجھتے تھے، مگر ۹ محرم کو شب کی مجلس بڑے اہتمام سے کراتے تھے جیسے کہ ۱۱ یا ۱۲ ربیع الاول کو مجلس میلاد شریف اہتمام سے ہوتی تھی۔ میلاد میں تو مٹھائی (جلیبی یا لڈو) گھر ہی پر حلوائی بٹوار کر بنوائی جاتی تھی۔ بانار سے اس موقع کے لیے مٹھائی خریدنا والد ماجد پسند نہیں فرماتے تھے اور مجلس شہادت کے لیے ایک بکرہ خود خرید کر لاتے تھے اور اس کا پلاڈیکوایا جاتا تھا جو اہل مجلس میں بٹر کا تقسیم ہوتا۔ اس ضمن میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہمارے یہاں بکرے کے گوشت کا رواج شادیوں تک میں بھی نہ تھا، عام طور سے گائے کا گوشت ہی استعمال ہوتا تھا لیکن مجلس شہادت کے لیے ہمارے گھر نے خصوصی اہتمام برتنا جاتا تھا۔ ایام عزاکر کی مجلسیں ہمارے حنفی ماموں حافظ سید احمد مرحوم (اپنی پارٹی کے ساتھ) پڑھا کرتے تھے۔ ان مجلسوں کا ایک شراب تک یوں یاد ہے کہ

خدا کے نور سے پیدا ہوئے یہ بچپن
محمد علی و فاطمہ حسین و حسن

کچھ اپنا رونا رلانا

جیسا کہ اوپر عرض کر آیا ہوں، مجھے ۶۷ سال کی عمر میں پورا شعور آگیا تھا، مجلسوں میں جو کچھ

سننا تھا اسے سمجھتا تھا۔ واقعہ شہادت کو سن کر خوب رویا کرتا تھا بلکہ اتنی دلچسپی اس واقعہ سے ہو گئی تھی کہ عشرہ محرم کے علاوہ بھی جو اس دلچسپی کا خاص موسم ہوتا ہے میں نانا کے گھر جاتا اور جس کتاب سے ماموں صاحب شہادت کے واقعات پڑھا کرتے تھے اُس کتاب کو لے کر پڑھتا اور روتا جاتا تھا۔ یہ بات ۱۰۹ سال کی عمر کی ہے۔

جہاں تک یاد کرتا ہوں میرا حال یہ تھا کہ حضرت ابو بکرؓ و حضرت عمرؓ وغیرہ اصحاب کرام کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ دنیا کی اور اسلام کی سب سے بڑی شخصیت بس حضرت حسینؓ کو سمجھتا تھا اور سب سے بڑا خبیث یزید کو جانتا تھا۔ اس سلسلے کا ایک لطیفہ بھی ہے۔ غالباً عمر کا آٹھواں سال تھا جبکہ میں قرآن مجید ناظرہ پڑھ رہا تھا؛ بند رہیں پارہ میں سورہ بنی اسرائیل کی جب وہ آیت آئی جس میں ذَلَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا الْإِحْسَاءَ آتا ہے تو میں نے دل میں سوچا کہ اُوہ! یزید ایسا خبیث تھا کہ اللہ میاں نے اس کو ظالمین۔ یعنی بہت بڑا ظالم۔ کہا ہے۔ یہ بھی یاد ہے کہ اس پر دل میں یہ شبہ پیدا ہوا کہ حضرت حسینؓ کی شہادت کا واقعہ تو بہت بعد کا ہے، قرآن مجید میں اس کا ذکر کیسے آگیا؟ اور پھر اس کا جواب بھی دل میں یہ آگیا کہ اللہ میاں تو سب کچھ جانتے ہیں؛ انہیں خبر تھی کہ یزید اتنا بڑا ظالم ہوگا اس لیے انہوں نے مسلمانوں کو پہلے ہی سے خبردار کر دیا۔

تبدیلی کا آغاز

میرے ایک قریبی رشتے کے نانا حضرت مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے اور صاحب درس تھے۔ میری عمر جب ۱۴-۱۵ سال ہوئی تو تعلیم کے سلسلے میں مجھے ان کے سپرد کر دیا گیا اور پھر تین سال تک جہاں وہ اپنی تدریسی ذمہ داری کے سلسلے میں رہے میں ان کے ساتھ ہی رہا۔ یہ پہلی صحبت تھی جس کی بدولت مجھے دین کی کچھ سمجھ آئی اور جو باتیں ماحول کے اثر سے خواہ مخواہ دین بن کر ذہن میں جم گئی تھیں ان کی حقیقت مجھ پر ظاہر ہوئی۔ اس کے بعد تعلیم کی تکمیل کے لیے دو سال دارالعلوم دیوبند میں رہنا نصیب ہوا۔ الحمد للہ کہ میری

تعلیم کے اس پانچ سالہ دور میں والد ماجد کے خیالات میں بہت کافی تبدیلی آگئی۔ اب ہمارے گھر میں سہی مجلس میلاد کی جگہ بیان سیرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس ہوتی تھی اور عاشورہ کی مجلس میں شہادت ناموں کے بجائے ہمارے بڑے بھائی مولوی محمد حسن صاحب مرحوم تاریخ ابن خلدون کے اردو ترجمے سے واقفہ کر بلا کا بیان پڑھتے اور میں کچھ زبانی بیان کیا کرتا تھا۔ لیکن واقفہ کے سلسلے میں تصور وہی تھا جو سنی سنائی باتوں سے قائم ہو گیا تھا۔ کبھی خود براہ راست تاریخی کتابوں کا مطالعہ کر کے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ قصے کی واقعی حقیقت کیا تھی۔

شہرت عام کی تاثیر

۱۳۵۳ھ (۱۹۳۴ء) میں بریلی میں قیام اختیار کر کے الفرقان جاری کیا۔ الفرقان کے بیسے الاول کے شمارہ میں اکثر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کچھ لکھا جاتا اور اس کے لیے میں سیرت اور احادیث کی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ لیکن واقفہ کر بلا کے سلسلے میں جہاں تک یاد ہے میرا سب سے بڑا ناخیز مولانا آزاد کا مضمون شہید کر بلا تھا جو الہلال کے فائل میں میرے پاس موجود تھا۔ اس سے زیادہ تاریخی مطالعہ کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی۔ یا یوں کہیے کہ شہرت عام کے اثر سے جو ذہن اس مسئلہ میں بن گیا تھا اس نے یہ ضرورت محسوس ہی نہ کی اور واقعہ یہ ہے کہ شہرت عام ایسی ہی طاقتور چیز ہے خواہ وہ کسی کے حق میں ہو یا کسی کے خلاف۔ اس کی ایک بہت قریبی مثال شیخ محمد بن عبدالوہاب بخاری (متوفی ۱۲۵۰ھ) ادران کی جماعت کے بارے میں بہت سے نہایت قابل احترام اکابر علماء حق کا رویہ ہے۔ ان میں سرفہرست

سہ میری یادداشت کے مطابق مترجم الآبار کے کوئی صاحب تھے اور انہوں نے لکھا تھا کہ اس واقعے (واقفہ کر بلا) کے بیان میں اصل کتاب (تاریخ ابن خلدون) کے اندر کچھ نہ تھا بلکہ چند صفحات خالی چھوڑے ہوئے تھے اور ترجمہ میں واقفہ کا بیان جو بہت طویل تھا مترجم نے دوسری کتابوں کی مدد سے از خود لکھا ہے۔ اب مولوی عتیق الرحمن نے اصل کتاب دیکھ کر بتایا ہے کہ ابن خلدون نے ۶ صفحات خالی چھوڑے تھے جن کی کمی کو مترجم نے ۶۵ صفحے لکھ کر پورا کیا ہے اور مترجم کا نام حکیم احمد حسین الہ آبادی مرحوم ہے۔

ہیں کہ مکرمہ کے شہور عالم و محدث اور محقق شیخ احمد زینی دحلان^{۲۲}۔ نیز خود ہمارے اکابر میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی^{۲۳}۔ شرک و بدعت کے خلاف شیخ محمد ابن عبدالوہاب کے بے لاگ موصداند جہاد نے (نیز سیاسی میدان میں ال سعود کے لیے ان کی حمایت نے) مخالفانہ پروپیگنڈہ کا وہ طوفان اٹھایا کہ ہر بڑی سے بڑی بات ان کے حق میں لائق یقین بن گئی۔ اس کی تفصیل کے لیے اس عاجز کی کتاب "شیخ محمد ابن عبدالوہاب کے خلاف پروپیگنڈہ اور علماء حق پر اس کے اثرات" دیکھی جاسکتی ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ شیخ احمد زینی دحلان^{۲۲} نے اپنی کتاب "خلاصۃ الکلام" اور "الدرر التبتی" رد الوہابیتہ" میں ان کی طرف ایسی باتیں منسوب کی ہیں جن کی بنیاد پر ان کو یہودی نصاریٰ وغیرہ کا فرسوں سے بھی بتردد رجحان کا فر قرار دینا صحیح اور برحق ہوگا۔ اور اسی طرح کی باتیں ہمارے حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے رسالہ "رجوم المدنیین" میں تحریر فرمائی تھیں لیکن بعد میں حضرت مدنی^{۲۳} نے ایک اخباری بیان کے ذریعہ اعتراف فرمایا کہ انہوں نے "رجوم المدنیین" میں جو کچھ اس سلسلے میں لکھا تھا وہ عام شہرت ہی کی بنیاد پر لکھا تھا۔

الفرقان ۳۷ کا مضمون

الغرض واقعہ کربلا کے سلسلے میں اپنا وہی پرانا ذہن چلتا رہا جو اس عام اور روایتی تصور سے بہت زیادہ مختلف نہیں تھا جس کا کچھ ذکر اوپر کی سطروں میں آیا ہے حتیٰ کہ سوال یا ذیقعدہ ۳۷ء کی بات ہے کہ میں کسی لمبے سفر پر جانے کی تیاری کر رہا تھا جبکہ اُتھین (مدھیہ پریش) کے ایک صاحب کا خط آیا جو الفرقان کے بہت قدر داں تھے انہوں نے لکھا تھا کہ محرم کا ہینہ آنے والا ہے اس میں اٹنے سیدھے شہادت نامے پڑھے جاتے ہیں اور غلط سلط روایتیں دہرائی جاتی ہیں۔ جی چاہتا ہے الفرقان میں اس موضوع پر کوئی مستند قسم کا مضمون آجائے اور ہم کو شش کریں کہ ہمارے یہاں مجلسوں میں وہی پڑھا جانے لگے۔ میں یہ ذمہ داری مولوی عتیق الرحمن کے سپرد کر کے اپنے سفر پر روانہ ہو گیا تھا مولوی عتیق الرحمن نے واقعہ کربلا کے عنوان سے یہ مضمون لکھا اور ذی الحجہ ۳۷ء کے الفرقان میں شائع

ہو گیا، میں سفر سے واپس آیا اور یہ مضمون پڑھا تو اس کی دو باتوں کی وجہ سے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی، غصے سے میرا دماغ کھول اٹھا۔ ان باتوں میں سے ایک یہ تھی کہ سیدنا حسینؑ کے اقدامات کے لیے بغاوت کا لفظ اس مضمون میں استعمال کیا گیا تھا۔ دوسری بات مضمون کا یہ بیان تھا کہ جب حضرت حسینؑ کوفے کے قریب پہنچ کر اس حقیقت سے آگاہ ہوئے مگر کوفے والے خداری کر گئے ہیں اور پھر زبیدی لشکر کے پہنچ جانے سے آپ کے لیے واپسی کا راستہ بھی نہ رہا تو زبیدی سالار عمر بن سعد کے سامنے آپ نے تین شکلیں رکھی تھیں کہ ان میں سے کسی کو قبول کر لیا جائے جن میں سے ایک یہ تھی کہ انھیں زبیدی کے پاس جانے دیا جائے تاکہ وہ براہ راست اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدیں۔“

میں زبیدی کو جتنا بڑا ظالم خبیث اور ناہنجار ساری عمر سے جانتا آ رہا تھا اس کی بنا پر میرے نزدیک یہ ناممکن بات تھی کہ حضرت حسینؑ ایسی پیش کش فرمائیں، حضرت حسینؑ کے لیے یہ بات سوچنی بھی میرے لیے محال تھی۔ میں غصہ میں اٹھا اور مولوی عتیق کے گھر کی طرف کوروا نہ ہوا تاکہ ان سے باز پرس کروں کہ یہ کیا لکھ دیا ہے؟

تسوقم کے قریب چلا ہوں گا کہ لفظ بغاوت کے بارے میں یہ بات ذہن میں آئی کہ بغاوت ہر جگہ تو میسب نہیں ہے بلکہ اگر ایک ظالم اور کافر نظام کے خلاف ہو تو ایک طرح کا جہاد ہے۔ آخر ۱۸۵۷ء میں ہمارے بزرگوں نے انگریزوں کے خلاف جو کچھ کیا تھا وہ بغاوت ہی تو تھی جس پر ہم آج بھی فخر کرتے ہیں۔ البتہ زبیدی کے ہاتھ میں ہاتھ دینے والی بات ویسی ہی ناقابل قبول بنی رہی، میں اسی حال میں مولوی عتیق کے گھر پہنچا اور بڑے غصے کے ساتھ ان سے پوچھا کہ تم نے یہ بات کیسے اور کہاں سے لکھ دی؟ مولوی عتیق کے پاس اس طرح کے غصے کے کچھ خطوط پہلے ہی آپکے تھے اور وہ اس سلسلے میں ایک دوسرے مضمون کی تیاری کر چکے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے تاریخ کی متعدد کتابوں سے عبارات اور حوالے نقل کر کے رکھے ہوئے تھے انھیں دکھا کر مجھے بھی ماننا پڑ گیا کہ پھر تو غلط نہیں لکھا ہے۔

یہ کتاب | اس واقعے پر تقریباً تیس سال گزر گئے تھے کہ آج سے ۸۰ سال پہلے جب میری

کتاب "ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت" شائع ہوئی تو بعض مخلص دوستوں نے توجیہ دلائی کہ جس مقصد سے یہ کتاب لکھی ہے اسی مقصد کی خدمت کے لیے یہ بھی مفید ہوگا کہ مولوی عتیق الرحمن صاحب کا مضمون واقعہ ذکر بلا اور اس کے بعد کا وصاحتی مضمون بابت محرم ۱۳۷۲ء بھی کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے۔ میں نے اس رائے کو پسند کیا اور ۱۳۷۳ء میں جب مولوی عتیق الرحمن کا ہندوستان آنا ہوا تو میں نے ان سے کہا کہ وہ پرانی قائل سے اپنے وہ دونوں مضمون نکلوا کر ایک نظر ڈال لیں اور مکتب خانہ الفرقان کے حوالے کر دیں۔ مگر ان کی رائے یہ ہوئی کہ اس سلسلہ پر تو اب بالکل از سر نو لکھا جانا چاہیے۔

یہ کتاب جو اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے اس کی اساس تو وہی ۱۳۷۳ء اور ۱۳۷۴ء کے مضامین ہیں لیکن عزیز مصنف نے اس پر نظر ثانی میں جو نئی محنت کی ہے اس نے اسے ایک بالکل نئی چیز بنا دیا ہے۔ کتاب کے منتزعات میں سے مجھے خاص طور پر اس کے آخری باب میں آنے والے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے اقتباس کی بابت یہ عرض کرنا ہے کہ اس اقتباس نے خود مجھے بڑا اہم فائدہ پہنچایا ہے۔ حضرت مسلم بن عقیلؓ کی شہادت کی خبر پانے پر واپسی کے ارادے کے بعد بھی صرف بعض برادرانِ مسلم بن عقیلؓ کی دلداری میں حضرت حسینؓ کے سفر جاری رکھنے پر مجھے ایک خلش تھی۔ اللہ تعالیٰ شیخ الاسلام کو اور اس کتاب کے عزیز مصنف کو جزائے خیر دے کہ شیخ الاسلام کے اس اقتباس میں اس خلش کے رنج ہونے کا سامان مل گیا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو اپنے بندوں کے لیے نافع بنائے اور اگر اس میں کوئی بات غلط آگئی ہو تو اس کے اثر سے بندوں کی حفاظت فرمائے نیز عزیز مصنف کو اس سے رجوع کی توفیق بخشے۔ واللہ یقول الحق دھو یدھی السبیل۔



مقدمہ

(طبعِ اول)

مصحفی ہم تو سمجھتے تھے کہ ہو گا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بڑا کام رفو کا نکلا

۱۹۳۳ء تا ۱۹۵۳ء کے مابین الفرقان (لکھنؤ) کی ترتیب و ادارت کی نئی نئی ذمہ داری اٹھانی تھی۔ ایک نجیبی کی فرمائش آئی کہ محترم کاہینہ قریب آ رہا ہے ساتھ ذکر بلا شہادت حضرت حسین ابن علیؑ کے سلسلے میں غلط سلط روایات والے شہادت نامے اس ماہ مسلمانوں میں پڑھے جاتے ہیں۔ جن سے کتنے ہی نارواییات و عقائد پھیلتے ہیں۔ الفرقان میں اگر ایک مستند مضمون اس موقع پر واقعہ ذکر بلا کے موضوع پر آجائے تو مفید ہوگا۔ غالباً یہ فرمائش الفرقان کے مدیر اعلیٰ میرے والد ماجد (مولانا محمد منظور نعمانی) کے نام آئی تھی۔ مجھے حکم ہوا کہ لکھو۔

والد ماجد کے کتب خانے ہی میں ایسی کتابوں کی جستجو شروع کی جن کی مدد سے یہ فرمائش پوری کی جاسکے۔ ایک مصری مصنف کی کتاب ہاتھ آئی جو بہت قابلِ اعتماد اور قابلِ بھروسہ محسوس ہوئی۔ زمامِ نصاب کتاب کا یاد ہے نہ مصنف کا، اس کتاب کی روشنی میں "واقعہ ذکر بلا" کے عنوان سے ایک مضمون تیار کر کے ذی الحجہ ۱۳۷۲ھ اگست ۱۹۵۲ء کے الفرقان میں دے دیا گیا۔

مضمون میں کوئی بہت خاص بات نہ تھی۔ واقعے کا سادہ سا بیان تھا اور اس معاملے میں جو فکری اور عملی بے اعتدالیات شیعیت کے اثر سے یا اس کے رد عمل کے طور پر پیدا ہو گئی ہیں ان کے سلسلے میں اپنے

لے نظر ثانی کے بعد - ۱۹۵۳ء مابین الفرقان مصنف کے والد ماجد مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے ۱۹۳۳ء میں ہندوستان کے معروف شہر بریلی سے جاری کیا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں اسکو لکھنؤ منتقل کر دیا اور آج بھی شائع ہوتا ہے۔

ہم کے مطابق نقطہ اعتدال واضح کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ تاہم ایک بات نے اس کو منحرف انگیز بنا دیا اور وہ ایک روایت تھی جس کے مطابق حضرت حسینؑ نے میدانِ کربلا میں یہ صورتِ حال دیکھ کر کہہ کر کہنے کے جن لوگوں کی خواہش اور باہر دعوت پر آپ نے ادھر کا سفر کیا تھا ان میں کتنے ہی لوگ اس فوج میں تو شریک ہیں جو آپ کے خلاف کاروائی کے لئے کوفہ کے یزیدی گوزار بن زیاد نے بھیجی ہے مگر آپ کی حمایت کے لیے نکل کر آنے والا کوئی نہیں ہے، یزیدی فوج کے سردار عمر بن سعد کو تین باتوں کی پیش کش کی تھی جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ آپ کو دمشق جانے دیا جائے جہاں آپ اپنا ہاتھ یزید کے ہاتھ میں دیدیں۔“

”یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دینے والی“ یہ بات بہت سے لوگوں کے لیے ناگواری کا باعث ہوئی جیسے کہ اپنی طرف سے گھر دکھادی گئی ہو۔ چنانچہ بہت سے خطوط لکھے استعجابی اور کچھ احتجاجی، اس سلسلے میں آئے۔ اور ان کی بنا پر الفرقان کی آئندہ اشاعت میں اس مسئلے پر باقاعدہ تاریخی حوالوں کے ساتھ تفصیل سے لکھنا پڑا جس سے یہ حقیقت بالکل بے غبار ہوئی کہ حضرت حسینؑ کی پیش کش کے بیان میں کوئی ذرا سی بھی غلط بیانی یا بے احتیاطی نہیں تھی بلکہ یہ ایک حقیقت تھی جو عیسوی اثرات کے ماتحت کچھ دبی ڈھکی چلی آ رہی تھی خطوط لکھنے والے بعض حضرات نے اس دوسرے مضمون کے بعد یہ لکھ کر اپنا اخلاقی فرض بھی ادا کیا کہ بے شک تم نے حضرت حسینؑ کی پیش کش کے بیان میں کوئی بے احتیاطی یا غلط بیانی نہیں کی تھی۔

اس قصے پر ۳۳-۳۴ برس گزر گئے تھے اور مجھے اب ودانہ نے لکھنؤ سے اٹھا کر لندن میں بسا دیا تھا، کہ ۱۸۶۶ء میں لکھنؤ جانا ہوا تو والد ماجد نے ان دونوں مصناہین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تمہارا مضمون ”واقعہ کربلا“ کتابی شکل میں چھپ جانا چاہیے، کچھ نظر ثانی کی ضرورت سمجھو تو ایک نظر ڈال لو اور کتب خانہ الفرقان کے حوالے کر دو۔ مضمون پر نظر ڈالی تو محسوس ہوا کہ نئے سرے سے لکھے جانے کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ ۳۴ برس پہلے کے مقابلے میں اپنا علم اور اپنے خیالات دونوں بہت بدل چکے ہیں۔ مگر یہ لمبا کام ان دنوں ممکن نہ تھا۔ مناسب

وقت کے لیے مؤخر کرنا پڑا، حتیٰ کہ گزشتہ سال ۸۹ء میں، والد ماجد کے ضعف و انحلال کی اطلاعات پر لکھنؤ کے سفر کا خیال پیدا ہوا تو یہ مؤخر کر دیا اور مضمون کی نئے سرے سے تسوید کے لیے تاریخ طبری وغیرہ کا مطالعہ شروع کیا۔ اس مطالعے نے اس نتیجے پر پہنچا یا جس کا اظہار سرنامے کے شعریں ہو ا جے کہ اس پرانے مضمون کا معاملہ کچھ تبدیل و ترمیم کے عمل کا طالب نہیں ہے بلکہ وہ جس ضرورت کے ماتحت لکھا گیا تھا اس کا دوسری حق ادا ہونے کے لیے تاریخ کے اس حصے کے مکمل پوسٹ مارٹم کی ضرورت ہے جو حصہ واقعہ کربلا اور اس کے پس منظر والے واقعات کی روایتوں پر مشتمل ہے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کے نتیجے میں یہ کتاب تیار ہوئی جو آپ کے ہاتھ میں ہے۔

تاریخی روایتوں کا حال اور اس کی مثال

میں تاریخ کا طالب علم رہا نہ کسی اور حیثیت سے تاریخ دانی کا دعویٰ یا نکل ممکن ہے کہ میں نے اس مطالعے میں جو کچھ محسوس کیا اور جو نتائج نکالے وہ اہل فن کی نگاہ میں قابل اتفاق نہ ہوں۔ مگر میرا احساس بالکل اسی نوعیت کا احساس ہے جیسے کسی بدیہی چیز کا احساس ہوتا ہے اور اس نوعیت کے احساسات کو آدمی زرد کر سکتا ہے نہ خواہ مخواہ شک کی نگاہ سے دیکھ سکتا ہے۔ میرا احساس یہ ہے کہ ہماری تاریخ کا ایسا نازک حصہ جس قدر احتیاط اور جس قدر احساس ذمہ داری کے ساتھ قلمبند کیے جانے کی ضرورت تھی اسی قدر بے احتیاطی اور غیر ذمہ داری یہاں کا فرما نظر آتی ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو :-

طبری ج ۶ ۲۳۲ پر ایک روایت بتاتی ہے کہ حضرت حمینؓ کربلا میں اترے تو وہ جعرات کا دن اور محرم ۱۱ء کی دوسری تاریخ تھی۔ پھر ۲۳ پر ایک روایت آتی ہے کہ جعرات کا دن اور محرم کی ۹ تاریخ تھی کہ مخالف لشکر کے سالار عمر بن سعد، عبید اللہ بن زیاد کے ایک فوری حکم کے ماتحت عصر کے بعد اپنے کیمپ سے اٹھ کر حضرت حمینؓ پر چڑھانی کرنے کے لیے پہنچ گئے۔ مگر پھر مفاہمت ہو گئی اور

آئندہ صبح تک کے لیے کاروائی روک دی گئی۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد آئندہ صبح جو لے گی تو وہ جمعہ کی صبح ہوگی۔ جب ۲ محرم کو بھی جمعرات بتائی گئی پھر ۹ محرم کو بھی جمعرات کہا بتائی گئی تو ۱۰ محرم کو سوائے جمعہ کے اور کوئی دن نہیں ہو سکتا۔ مگر آگے منظر ۲ پر دوسری صبح کو عمر بن سعد کی کاروائی (یعنی اپنے لشکر کو حرکت میں لانے کا بیان آتا ہے تو ہمیں یہ الفاظ ملتے ہیں کہ:-

قال فلما صلی عمر بن سعد لعداء	راوی کہتا ہے پھر جب ہفتہ کو عمر بن سعد
یوم السبت وقد بلغنا ایضاً انہ	نے فجر کی نماز پڑھ لی۔ اور ہمیں یہ بھی روایت
کان یوم الجمعة وكان ذالک	ملی ہے کہ وہ جمعہ کا دن تھا۔ اور وہ دن
الیوم یوم عاشوراء خرج فیمن	عاشوراء (۱۰ محرم) کا تھا تو ابن سعد
معه من الناس۔	اپنے لوگوں کو لے کر نکلا۔

فرمائیے کہ ۲۳۲ اور ۲۳۴ والی روایتوں کے پس منظر میں جن میں ۲ تاریخ کو جمعرات کا دن اور پھر ۹ تاریخ کو جمعرات کا دن بتایا گیا ہے، کوئی ٹھگ اس طور پر نہ ۲۳ کی اس روایت کو لینے کی ہے جس میں ۱۰ تاریخ کو ہفتے کا دن بتایا گیا ہے؟

ہمیں نہیں معلوم کہ ”وقد بلغنا ایضاً“ اور ہمیں یہ بھی روایت ملی ہے کہ یہ جمعہ کا دن تھا، ایہ الفاظ طبری کے ہیں، یارادی کے۔ اگر راوی کے ہیں اور طبری نے کچھ کہا ہی نہیں تب تو کہنا ہی کیا ہے اور اگر راوی کے نہیں طبری کے ہیں، تب بھی ایک مؤرخ کی ذمہ داری کے لحاظ سے اس انداز کلام کو کوئی ذمہ دارانہ انداز نہیں کہا جاسکتا جس سے ۱۰ محرم کو جمعہ کا دن ایک مشکوک دن بن جاتا ہے۔ حالانکہ گذشتہ بیانات کی رو سے وہ قطعاً جمعہ کا دن ہے، کہنے کی بات یہ تھی کہ ”یہ دن ہفتے کا نہیں جمعہ کا ہونا چاہیے، اور اگر ہفتہ ہی ثابت ہے تو پھر اگلے دونوں بیانات غلط ہیں۔“

طبری کا اپنا اعتراف

یہ مثال سامنے لا کر ہم طبری کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں کہہ رہے ہیں کہ اگر

ان کی زندگی میں کبھی جاتی تو شاید وہ کوئی صفائی دے سکتے۔ اُن کا خود اپنا اعتراض ہے کہ اُن کے قاری کو ایسی روایات مل سکتی ہیں جو کسی طرح صحیح نہ ہو سکتی ہوں جو کسی طرح سمجھ میں نہ آ سکتی ہوں۔ کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ :-

”میں نے اس کتاب میں جو کچھ ذکر کیا ہے اس میں میرا اعتماد اپنی اطلاعات اور راویوں کے بیانات پر رہا ہے نہ عقل و فکر کے نتائج پر۔ کسی قاری کو اگر میری جمع کردہ خبروں اور روایتوں میں کوئی چیز بائیں و جہ نا قابل فہم اور ناقابل قبول نظر آئے کہ نہ کوئی اس کی تک مٹھتی ہے نہ کوئی معنی بنتے ہیں تو اُسے جانتا چاہیے کہ ہم نے یہ سب اپنی طرف سے نہیں لکھا ہے بلکہ اگلوں سے جو بات ہمیں جس طرح پہنچی ہے ہم نے اسی طرح نقل کر دی ہے۔“ (جلد اول صفحہ)

پھر کونسی بات بعید ہے ؟

مؤرخ کا دامن جب اتنا وسیع ہو کہ اتنی موٹی اور دور سے نظر آنے والی عجوبگی کے ساتھ بھی جیسی کہ مذکورہ بالا مثال میں پائی جاتی ہے۔ ایک روایت کو اس کے یہاں بے چون و چرا جگہ مل سکتی ہے تو پھر راویوں کی کون سی غلطی، مبالغہ آرائی یا غلط بیانی رہ جاتی ہے جس کی توقع ہمیں اپنے ان مؤرخین کی کتابوں میں نہیں کرنی چاہیے؟ خاص کر کربلا کے جیسے واقعات میں کہ جن سے جذبات متعلق ہوتے ہیں۔ تعصبات متعلق ہوتے ہیں اور مثبت و منفی (POSITIVE & NEGATIVE) مفادات بھی متعلق ہو جاتے ہیں۔

لے تاریخ تو پھر تاریخ ہے کہ جس میں بہت سی گنجائش مانی گئی ہیں طبری کی تو تفسیر میں ہی ایسی درجہ کی عجوبہ روایتیں ایسے معاملات تک میں پائی جاتی ہیں جن میں ادنیٰ درجہ کی گنجائش نہیں مانی جاسکتی۔ سورۃ النجم کی تلاوت کے دوران میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر معاذ اللہ مشرکین کے بتوں کی تعریف و توثیق میں ”تلك الغرانيق الصلى“ والے شیطانی کلمات جاری ہونے کی روایت کئی کئی سندوں سے بلا کسی نقد و نظر کے اس تفسیر میں دی گئی ہے۔

چنانچہ اس واقعے (واقعہ کربلا) اور اس کے پس منظر کے واقعات کے سلسلے میں جہاں نظر صحیح اور قابل قبول روایات موجود ہیں، وہیں نہایت منکر اور ناقابل قبول روایات کا بھی ڈھیر لگ گیا ہے۔ اور فی الواقع یہ صورت پیدا ہو گئی ہے کہ کسی روایت کو صحیح مانتے ہوئے بھی یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ گو عقلاً صحیح نظر آتی ہے مگر ہو سکتا ہے کہ واقعہ میں یہ بھی صحیح نہ ہوں۔ روایات کی اس صورت حال کا اندازہ آپ کو آگے بڑھ کر کتاب میں ہو گا۔ خاص کر کربلا کے میدان والی روایات میں۔ اور اسی لیے ہم نے اگرچہ کچھ روایات کو عقل، عادت، حالات و ماحول اور دوسرے قابل لحاظ پہلوؤں کی روشنی میں قابل قبول اور کچھ کو ناقابل قبول ٹھہرایا ہے۔ کچھ کو ترجیح دی ہے اور کچھ کو رد کر دیا ہے، مگر جس کو صحیح ٹھہرایا ہے اور جس کو ترجیح دی اس کو بھی فی الواقع اور سو فیصد صحیح کہنے کی ذمہ داری ہم نہیں اٹھا سکتے۔ جھوٹ اور سچ اور من گھڑت روایات کی وہ آمیزش نظر آتی ہے کہ اللہ کی پناہ۔

کربلا کے واقعے میں غلط بیانی کے اسباب

اور اس کی وجہ وہی ہے کہ کربلا کا سانحہ (چاہے جس شکل میں ہوا ہو) اول تو بجائے خود بہت جذبات انگیز ہے اور پھر اس کے پیچھے سیاسی صفت آرائی کی ایک لمبی رزم از کم ۲۵ سالہ تاریخ ہے جو ناگزیر طور پر دوطرفہ تعصبات کو بھی جنم دے چکی ہے اور مفادات میں دلچسپی رکھنے والے حلقے بھی بنا چکی ہے۔ مزید کو فیول کی جس بے وفائی اور غداری نے یہ سانحہ کرایا اس کا بھی تقاضہ ہے کہ (قبائلی رقابتوں کے ماتحت) ایک دوسرے کو الزام دینے اور اپنے آپ کو اندر سے باوناد کھلانے والی روایتیں گھڑی جائیں، خاص کر جبکہ واقعہ کے چند سال بعد ہی یزیدی وفات سے حالات نے ایک دم پلٹا کھالیا تھا۔ پھر ان سب باتوں سے اوپر بہت سے راویوں اور مقتل نگاروں کا وہ ”شعبی“ جذبہ جو اگر اس نہایت ”قیمتی“ موقع کو ایما نذاری کی نذر کر دیتا اور شیعیت کے مفاد کے لیے حسب ضرورت اور حسب انتظامات

رنگ آمیزی اور روایت آفرینی کی خدمت انجام نہ دیتا تو یہ ایک غیر فطری بات ہوتی۔ غرض ان مختلف قسم کے محرکات و عوامل نے مل کر واقعہ کربلا اور اس کے پس منظر سے تعلق رکھنے والے واقعات کے بیان میں وہ غضب ڈھایا ہے کہ حقیقت کی یافت مشکل بن گئی۔ نہایت بلاگ طریقے سے روایتوں کا تجزیہ کیا جائے تبھی ممکن ہے کہ صداقت تک رسائی ہو سکے۔

کام مشکل بھی اور ضروری بھی

اس قصے میں صداقت تک رسائی اور اس کا اظہار کس قدر مشکل (یعنی پُرخطر) کام ہے، اس کا اندازہ کسی اور کو ہو یا نہ ہو، اس راقم کو تو اُس وقت سے ہے جب اس موضوع پر ۲۶ سال پہلے والے مضمون میں بغیر یہ جانے ہوئے کہ کسی چھپائی گئی صداقت کا اظہار ہوا جا رہا ہے، وہ روایت نقل کر دی گئی جس کے مطابق حضرت حسینؑ نے یہ آمادگی ظاہر کی تھی کہ:-

(اور یا) میں یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدوں پھر وہ جو مناسب سمجھے میرے اور اپنے معاملے میں فیصلہ کرے۔

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ اس بیان کی بنا پر یہ مضمون بڑا ہنگامہ خیز ہو گیا اور آئندہ ماہ کے الفرائین میں جب پانچ چھ کتابوں کے حوالے سے یہ بیان مدلل کر دیا گیا تب بات قابو میں آئی۔ لیکن وہ بھی صرف سچے علم دوست اور صداقت پسند لوگوں کی حد تک۔ باقی جن لوگوں کیلئے ایک تاریخی حقیقت کے مقابلے میں یہ شاعری جزو ایمان بن چکی تھی کہ ع

سر داد و نداد دست در دست یزید
وہ اپنے بے دلیل ایمان پر اس کے بعد بھی قائم اور سرگراں رہے۔

لے تاریخ طبری جزو ۶ ص ۲۳۵ - الباریہ والنہایہ جلد ۸ ص ۱۴۰

ایک ناگزیر ضمنی بحث

اگرچہ یہ موقع کسی بحث اور تفصیل کا نہیں ہے تاہم اس اندیشے کے پیش نظر کہ آج کی ان سطروں کو پڑھ کر بھی ایسے تمام حضرات کو گرانی لاحق ہو، اس قدر بات یہاں کہہ دینا مناسب معلوم ہوتی ہے کہ یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دینے اور فیصلہ اس پر چھوڑنے کی بات طبری، ابن اثیر اور البدایہ والنہایہ وغیرہ سب کے صفحات میں اس قدر روشن حقیقت ہے کہ جو لوگ اس کے بیان پر ناراض ہوتے ہیں وہ سچائی سے ناخوش ہونے کے سوا اور کچھ نہیں کرتے۔ طبری نے اس واقعہ کی سلسلے کی سب سے پہلی روایت یہ دی ہے کہ حضرت حسینؑ نے عمر بن سعدؓ سے ملاقات کی اور کہا کہ دونوں لشکروں کو یہیں کربلا کے میدان میں چھوڑ کر ہم تم دونوں یزید کے پاس چلیں۔ مگر عمر بن سعد نے اس کو قبول کرنے سے عذر کیا، اس کے بعد طبری میں دوسری روایت ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے۔

قال إومخنف وإماما حدثنا به	ابو مخنف نے کہا۔ لیکن مجالد بن ساعد
المجالد بن ساعد والمقعب بن	اور مقعب بن زہیر وغیرہ محدثین کا قول
زہیر الازدی وغیرہما من المحدثین	وہ ہے جو محدثین کی جماعت کا قول ہے
فهو ما عليه جماعة المحدثین	وہ کہتے ہیں کہ حضرت حسینؑ نے کہا تھا
قالوا انہ قال اختاروا صتی خصماً	کہ میری تین باتیں قبول کرو، یا میں
ثلاثاً إمامان ارجح الی المکان الذی	اس جگہ کو لوٹ جاؤں جہاں سے آیا
أقبلت منه وإمامان اضع یدی فی	ہوں، یا یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے
ید یزید بن معاویہ فیری فیما بینی	دوں پھر وہ میرے اور اپنے بارے میں
وبینہما رأیة وإمامان تسیرونی	جو سبھی فیصلہ کرے اور یا تم مجھے مسلمانوں
الی تغربن تغور المسلمین بشئتم	کے کسی سرحدی مقام پر جہاں بھی تم
فانکون رجلاً من اہلہ لی	چاہو، پہنچا دو، وہاں میں وہیں کا ایک

مالہم ودعائی ما علیہم ولہ
آدمی ہو کر رہوں گا جیسے وہ سب ایسا

میں۔

سب سے پہلی روایت بھی طبری نے ابو مخنف ہی سے لی تھی۔ اور وہ ابو مخنف نے ایک فرد واحد ہانی بن ثبیت کے بیان کے طور پر دی تھی، بعد ازاں یہ دوسری روایت دی جس پر وہ محدثین کا اتفاق بتاتا ہے۔ اس کے بعد اسی ابو مخنف کی ایک تیسری روایت طبری میں آتی ہے جو حضرت حسینؑ کے قافلے کے ایک باقی ماندہ فرد اور خاندانی غلام عقبہ بن سمان کا بیان ہے کہ میں اول سے آخر تک آپ کے ساتھ تھا۔ آپ نے کہیں کوئی اُس طرح کی بات نہیں فرمائی جو لوگ بیان کرتے ہیں۔ آپ نے تو صرف یہ فرمایا تھا کہ :-

دعوتی فلا ذہب فی ہذا الارض
العریضۃ حتی ننظر ما یصیر
امر الناس
مجھے چھوڑ دو کہ کہیں بھی اس لمبی چوڑی
زمین میں نکل جاؤں حتیٰ کہ یہ بات ہوا
ہو کر سامنے آجائے کہ لوگ کیا فیصلہ کرتے ہیں

اور پھر چوتھی روایت اسی ابو مخنف سے (دوسری روایت کی تکمیل کے طور پر) ہے کہ عمر بن سعد سے آپ کی ملاقات (جو معاملے کے سلجھاؤ کے لیے آپ نے شروع کی تھی) تین یا چار بار ہوئی، اور اس کے نتیجے میں عمر نے ابن زیاد کو خط لکھا کہ اللہ کا شکر ہے معاملات سدھرنے کی صورت نکل آئی ہے اور حسینؑ نے پیش کش کی ہے کہ

ان یرجع الی المکان الذی ہنہ
اتی اذان نسیرۃ الی ثغر من
ثغور المسلمین شئنا فیکون حجلاً
من المسلمین لہ ما لہم ودعلیہ
ما علیہم اوان یأتی ینزید
یا تو وہ اسی جگہ کو لوٹ جائیں جہاں سے
آئے تھے یا ہم ان کو مسلمانوں کے جس
کسی سردی مقام پر چاہیں بھیجیں اور
وہاں وہ ایک عام مسلمان کی طرح ہیں
گے اور یا پھر وہ امیر المؤمنین زید کے
پاس چلے جائیں اور اپنا ہاتھ الٹ کے

لہ جزو ۶ ۲۳۵ . لہ ایضاً

امیر المؤمنین فیض یداعی ہاتھ میں دے دیں پھر وہ ان
 یداعی فیرونی نیما بیتہ دینتہ کے اور اپنے معاملے میں جو مناسب
 رأیہ لے سبھی کریں۔

عقبہ بن سمان کا بیان اگر اس معاملے میں مان لیا جاتا تو اس سے قضیے کی ایک بڑی
 گتھی حل ہو سکتی تھی۔ جو عقبہ کے بیان کے برخلاف یہ دوسرا بیان ماننے سے پیدا ہوتی ہے
 کہ حضرت حسینؑ نے تین باتوں کی پیش کش کی تھی، جن میں سے ایک یہ تھی کہ وہ زید کے ہاتھ
 میں اپنا ہاتھ دینے کو تیار ہیں۔ اس بیان کو ماننے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ابن
 زیاد کو کیا مصیبت آئی تھی کہ خود اپنے ہاتھ میں ہاتھ دینے کا مطالبہ کر کے بے ضرورت قتال کی
 صورت پیدا کی؟ تاریخ کی روایات میں اس کا صرف ایک جواب ملتا ہے کہ شمر بن ذی الجوشن
 نے چڑھا دیا (طبری ص ۲۳۶) مگر یہ کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ہے۔ ابن زیاد کوئی ایسا ہلکا
 اور سطحی آدمی تو نظر نہیں آتا جو ایسی حماقت کسی کے چڑھانے سے کر لے خاص طور سے جبکہ
 اسی روایت کا یہ بیان بھی سامنے رکھا جائے کہ عمر بن سعد کے اس خط پر ابن زیاد کا اپنا
 رد عمل نہایت مسرت اور قبولیت کا تھا۔ بہر حال راقم سطور کی نظر میں اس گتھی کا کوئی معقول
 اور تشفی بخش حل نہیں ہے۔ البتہ عقبہ بن سمان کا بیان مان لیا جائے تو پھر سرے سے
 کوئی اشکال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ قتال کی بات بالکل سمجھ میں آتی ہے۔ اور ابن زیاد کیلئے
 یہ کہنے کا موقع ہوتا ہے کہ اچھا اب وہ ہمارے ہاتھ میں آکر ہاتھ سے نکل جانا چاہتے ہیں؟
 لیکن اس سہ گانہ پیش کش والی روایت کا پلڑا اتنا بھاری ہے اور اتنے شواہد اس کے حق
 میں پائے جاتے ہیں کہ چاروں ناچار اسی کو ماننا پڑتا ہے اور عقبہ بن سمان کی شہادت کے
 بارے میں وہ کہنا پڑتا ہے جو جسٹس امیر علی نے رسیعیت کے باوجود اپنی معقول پسندی
 کی بنا پر کہا ہے کہ عقبہ کا یہ انکار شاید اس بنا پر تھا کہ سہ گانہ پیش کش والی روایت میں انکو
 لے طبری جزو ۶ ص ۳۵-۳۸ ۲ جیسا کہ اپنے موقع پر آئے گا۔

حضرت حسینؑ کی توہین نظر آتی تھی۔

اس روایت کے ذرن کی سب سے پہلی وجہ تو ابو مخنف کا یہ بیان ہی ہے کہ "جماعتِ محدثین کا اس پر اتفاق ہے۔" دوسرے یہ کہ ابو مخنف اور طبری دونوں عقبہ بن سمان کی بات نقل کرنے کے بعد آگے چوتھی روایت پانچویں روایت اور چھٹی روایت میں مسلسل وہ باتیں بیان کر کے جو سرگاندہ میں کش کے نتیجے میں پیش آتی چلی گئیں۔ گویا ابن سمان کی بات کو ناقابلِ اعتنا قرار دے دیتے ہیں۔ اور میری بات یہ ہے کہ۔ اتر تاریخ کے واقعات میں حضرت حسینؑ کے ساتھیوں کی زبان پر ابن سعد اور اس کے ساتھیوں کو خطاب کرتے ہوئے بار بار یہ بات ملتی ہے کہ:-

أَفَمَا لَكُمْ فِي أَحَدَةٍ مِنَ الْخِصَالِ کیا حضرت کی پیش کی ہوئی باتوں میں سے

الَّتِي عَرَضَ عَلَيْكُمْ رَضِيٌّ؟ کوئی ایک بھی تم کو مقبول نہیں؟

طبری جزو ۶ کے صفحہ دو صفحوں (ص ۲۴۲ اور ۲۴۵) میں تین جگہ یہ بات آتی ہے اور اس کے بعد بھی آتی چلی جاتی ہے۔ اس لیے کوئی گنجائش ہی نہیں کہ اس روایت کو نہ مانا جائے۔

اصل بات جو کہنا تھی

یہ ضمنی بات ناگزیر سمجھ کر عرض کی گئی، ورنہ اصل بات یہ کبھی جارہی تھی کہ اس قصے میں اصل حقیقت اور صحیح واقعات کی یافت بھی مشکل اور اس سے زیادہ اس کا اظہار مشکل۔ اس لیے کہ اس میں لوگوں کو یا حضرت حسینؑ کی (معاذ اللہ) توہین نظر آتی ہے، اور یا بزرگ و ابن زیاد کی طرفداری۔ لیکن ہے یہ ایک ضروری کام۔ اس لیے کہ یہ "توہین" نظر آنا اور "طرفداری" نظر آنا، یہ دونوں باتیں ہم سب کی نظروں میں (الآ ماشاء اللہ) شیعیت کا رنگ آجملے کا نتیجہ ہیں۔ اور یہ رنگ کوئی اچھا رنگ نہیں ہے۔ واقعہ کربلا سے اور جو کچھ ہوا ہو یا

نہ ہوا ہوشیاریت کو اپنی دوکان چمکانے اور اپنے اثرات پھیلانے کا وہ بے پناہ موقع ملا ہے کہ کچھ کہا نہیں جاتا۔ اور اسی لیے ضرورت ہے کہ نہایت ٹھنڈے دل سے پورے معاملے کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

سنی معاشرے پر شیعیت کے اثرات

میں اور کسی کا کیا کہوں! اپنے والد ماجد کا ایک اعتراف اور ایک بیان نقل کرتا ہوں۔ ذی الحجہ ۱۳۷۳ھ کے الفرقان میں میرا مضمون ”واقعہ کربلا“ شائع ہوا تو والد ماجد کھنڈے سے باہر کہیں سفر میں تھے۔ میری عادت یہ رہی تھی کہ جو کچھ بھی لکھتا یا لکھتا ہوں ان کو دکھا کر ہی الفرقان میں دیتا تھا۔ مگر یہ مضمون ان کی حالت سفر کی وجہ سے نہیں دکھایا جاسکا تھا۔ واپس آ کر پڑھا تو میرے یہاں تشریف لائے۔ بقول خود بہت غصے میں گھر سے نکلے تھے۔ اولاً تو اس بات پر کہ حضرت حسینؑ کے اقدام کو ”بغاوت“ سے تعبیر کر دیا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ”یزید کے ہاتھ ہاتھ دینے“ یعنی بیعت یا سپردگی منظور کر لینے کی لغوبات ”بجائے کہاں سے لکھی! لفظ ”بغاوت“ کی خلش کے بارے میں تو خود ہی فرمایا کہ وہ آتے آتے راستے ہی میں دور ہو گئی کہ یہ لفظ ہمارے فقہاء کے یہاں بے شک برا لفظ ہے لیکن آج کل کا ہندوستانی تو اس لفظ کو اپنے یہاں کے آج کے استعمال کے مطابق بولے گا اور آج کے استعمال میں، خصوصاً تحریک آزادی ہند کے پس منظر میں، تو لفظ ایک پسندیدہ اور فخر سے بولا جائے والا لفظ ہے نہ کہ کوئی مکروہ و مذموم لفظ، لیکن دوسری خلش باقی رہی اور وہ اس وقت دور ہوئی، جب پانچ چھ کتابوں کے حوالے میں نے پیش کئے جو ایک دوسرا دماغی مضمون لکھنے کے لیے جمع کیے گئے تھے۔

یہ بات تو آج سے ۳۷ برس پہلے ہوئی۔ زیر نظر کتاب کا جب وہ باب تیار ہوا اور والد ماجد نے سنا جو حضرت میسرہ بن شعبہ اور زبیر کی ولی عہدی کے متعلق ہے، تو بیان فرمایا کہ ہمارے بچپن میں عشرہ محرم میں ہمارے گھر مجلس ہوتی تھی، ہمارے بڑے بھائی صاحب تالیخ ابن جلدون

(مترجم) سے حضرت حسینؑ کی شہادت کا بیان سنا تے تھے، جس میں حضرت مغیرہؓ کا ذکر بھی آتا تھا، تو بعض بڑے بوڑھوں کا ان کے متعلق یہ کہنا یاد ہے کہ "ہاں شیرے کی بوند تو مغیرہ ہی نے لگائی تھی" یعنی فساد کا بیج تو انہوں نے ہی لویا تھا۔ ایک صحابی اور وہ بھی صاحبِ فضائل و مناقب صحابی کے متعلق کس بے تکلفی سے کتنی بڑی بات کہدی جاتی تھی! — اور یہ ہمارے وطن سنہل کے پرانے بڑے بوڑھوں ہی میں نہیں کہدی جاتی تھی، جن کے پاس کوئی خاص علم نہ تھا اور جن کے زمانے تک اس موضوع پر کوئی بڑا اصلاحی کام ہندوستان میں نہ ہوا تھا بلکہ ہمارے زمانے کے ایسے اہل علم تک جن کے متعلق اس طرح کے کسی تبصرے کا خیال بھی ان کے علمی اور تنقیدی مذاق کی بنا پر نہیں کیا جانا چاہیے تھا۔ ان کے قلم سے ہم بعینہ ہی "شیعیت" چسکتی ہوئی دیکھتے ہیں۔ یزید کی ولی عہدی کے قضیے میں اس فضول سی روایت پر اعتماد کرتے ہوئے جو کہتی ہے کہ حضرت مغیرہ نے اپنی گورزی بچانے کے لیے یزید کی ولی عہدی کا خواب حضرت معاویہؓ کو دکھایا جو ان کے لیے اتنا خوش کن تھا کہ حضرت مغیرہ سے لی جانے والی گورزی بحال کر دی۔ کس طنز پر انداز میں لکھا ہے کہ:-

"یزید کی ولی عہدی کے لیے ابتدائی تجویز کسی صحیح جذبے سے نہیں ہوئی تھی، بلکہ ایک بزرگ نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے دوسرے بزرگ کے ذاتی مفاد سے اپیل کر کے اس تجویز کو جنم دیا۔"

حضورؐ کی قرابت کا احترام یا عصمت کا عقیدہ؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت بے شک قابلِ صلہ لحاظ اور واجب الاحترام شئی ہے۔ وہ آدمی بد نصیب ہے جو آپؐ کی قرابتوں کا لحاظ اور احترام نہ کر سکے۔ لیکن لحاظ و احترام الگ چیز ہے اور معصومین محض کا درجہ کسی کو دینا الگ چیز ہے۔ شیعیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

لے زیر نظر کتاب میں ایک پورا باب اس روایت پر آیا جو ملے گا۔ ۱۹۴۳ء خلافت و طوگت — از سید ابوالاکیلی مسعودی ص ۱۵

کے ساتھ حضرت فاطمہ، حضرت علی اور حضرات حسن و حسین (رضی اللہ عنہم) اور اپنے دیگر اہل کو بھی عصمت کے درجے پر فائز کرتی ہے۔ نتیجے میں ان محترم حضرات سے کسی خطا اور بھول چوک کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ جبکہ ان سے اختلاف کی صورت میں اختلاف کرنے والا لازماً مامی خطا کار و گنہگار قرار پائے گا۔

ہم اہل سنت بطور عقیدہ یہ بات نہیں مانتے مگر بہت تھوڑے لوگوں کو چھوڑ کر ہمارا عمل اسی ذہنی رویے کی شہادت دیتا ہے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے زمانے سے حضرت عثمان غنیؓ کے زمانے تک کے معاملات میں بعض دوسری اعتقادی قسم کی رکاوٹیں ہیں اس رویے کے اظہار کی اجازت نہیں دیتیں۔ لیکن اس دور کے ختم ہوتے ہی جو نیا دور شروع ہوتا ہے تو ہمارے اس رویے کے اظہار کا دور بھی شروع ہو جاتا ہے۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے اختلاف کی کہانی میں ہم ذرا بھی انصاف پسندی کا مظاہرہ نہیں کرتے، انصاف کے بجائے حضرت معاویہؓ کو بس کچھ رعایت مشکل دیتے ہیں۔ اگر ہم سچ انصاف پر آمادہ ہو سکتے تو اس قضیے کی صورت ہماری نظروں میں آج بہت کچھ مختلف ہوتی، ہم اپنے اس رویے کو کتاب و سنت پر مبنی کچھ اعتقادات سے مربوط کرتے ہیں۔ مگر واقعے میں اس کا ربط ان شیعہ اثرات سے زیادہ ہے جن سے اہل سنت کا کوئی طبقہ بھی مشکل بچ سکا ہے۔

بے انصافی کی ایک مثال

بے انصافی کی صورت ایک مثال لیجئے۔ اس لیے کہ یہاں اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں نکل سکتی۔ کہ جن تاریخی کتابوں سے ہم حضرت معاویہؓ کی طرف سے حضرت علیؓ پر ”سب و شتم“ کی روایتیں پاتے ہیں انھیں کتابوں کی شہادت یہ بھی ہے کہ:-

”وكان علي اذا صلى العداة اور واقعہ حکیم کے بعد، علیؓ جب فجر کی یقینت یقول: اللهم العن نماز پڑھتے تو قنوت پڑھتے اور کہتے

معاویۃ و عمرًا و ابنا الاعور و وجیبًا	کہ اے اللہ لعنت کر معاویہ پر، عرو بن ابی
و عبد الرحمن بن خالد و الضحّا	پر، ابوالاعور پر، حبیب (بن سلمہ) پر،
بن قیس و الولید فبلغ ذالک	عبد الرحمن بن خالد بن ولید، پر، صخاک بن
معاویۃ فکان اذا قنت لعن	قیس پر اور ولید پر۔ پس یہ بات جب معاویہ
علیًا و ابن عباس و الحسن	کو معلوم ہوئی تو وہ بھی جب قنوت کرتے تو
و الحسین و الاشتر۔	علی ابن عباس، حسن حسین اور اشتر پر لعنت کرتے

لیکن اس صاف و صریح بیان کے باوجود ہمیں صرف اتنا یاد ہے کہ معاویہؓ اور ان کے ساتھی حضرت علیؓ پر سب و شتم کرتے تھے۔ یہ نتیجہ حضرت علیؓ کے اس احترام کا نہیں ہے جو آرزوئے کتاب و سنت ہم پر واجب ہے کیونکہ کتاب و سنت بے انصافی نہیں سکتی بلکہ اس احترام کا نتیجہ ہے جو شیعیت والے عقیدہ معصومیت سے لازم آتا ہے، اہل سنت کے اصل مذہب کا تقاضہ تو یہ تھا کہ اگر یہ روایت حضرت علیؓ کے حق میں قابل یقین یا قابل بیان نہیں تھی تو ایسا ہی حضرت معاویہؓ کے حق میں سمجھا جاتا کہ وہ بھی صحابی ہیں۔

تاہم حضرت علیؓ کے مقابلے میں جیسے کچھ بھی تھے حضرت معاویہؓ بہر حال ایک صحابی تھے۔ اس لیے ہم اپنے علم کلام کے ماتحت مجبور ہوتے ہیں کہ ان کے ساتھ کچھ رعایت برتیں۔ لیکن جب ان کے بیٹے یزید کا دور آتا ہے تو اس کے اور حضرت حسین ابن علیؓ کے معاملے میں ہم میں اور شیعوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ اس لیے کہ یزید کو ایسا کوئی تحفظ حاصل نہیں تھا جیسا کہ اس کے والد حضرت معاویہؓ کو حاصل تھا۔ شیعوں نے "مثلاً" کہا کہ وہ فاسق و فاجر تھا اور کسی طرح اس لائق نہ تھا کہ تحت خلافت پر اس کو جگہ ملتی۔ تو چونکہ یہ بات حضرت حسینؓ کی حمایت میں کہی

۱۷ بری ج ۶ ص ۲۷۱ اور یہاں یہ نوٹ کر لیجئے کہ طبری کی روایت میں جیسا کہ نقل کیا گیا دونوں جگہ "لعنت" کا لفظ ہے۔ اسی کو ابن اثیر نے اپنی کتاب میں دوسری جگہ یعنی حضرت معاویہؓ کے ساتھ "سب" کے لفظ سے بدل دیا ہے جس کا ترجمہ ہم سب و شتم کرتے ہیں۔

گئی تھی اس لیے بالکل باسانی ہم نے بھی یہی کہنا شروع کر دیا۔ پھر بعض کو خیال آیا کہ اس سے تو حضرت معاویہؓ پر بڑا الزام آتا ہے۔ تب یوں کر دیا گیا کہ حضرت معاویہؓ کی زندگی میں تو وہ ایسا نہیں تھا لیکن بعد میں ہوا۔ حدیث ہے کہ ابن خلدون جیسا آدمی جس نے یزید کی دلی عہدی کی زبردست وکالت اپنے مقدمہ تاریخ میں کی ہے، وہ بھی ذرا سا اگے چل کر جب یزید اور حضرت حسینؓ کے قیضے پر آتا ہے تو ٹھیک یہی بات کہنی شروع کر دیتا ہے یعنی یہ کہ وہ فاجر و فاسق ہو گیا تھا۔ کب ہو گیا تھا؟ اور کب اس بات کا پتہ چلا؟ تاریخ تو کوئی سی بھی اٹھا کر دیکھ لیجئے، ہر جگہ ایک ہی بیان ہے کہ جیسے ہی مدینے کے گورنر نے حضرت حسینؓ کو یہ اطلاع دی کہ حضرت معاویہؓ انتقال فرما گئے اور ان کے دلی عہد یزید بن معاویہؓ آپ سے بیعت چاہتے ہیں، ویسے ہی حضرت حسینؓ نے مدینہ چھوڑ دینے کا ارادہ فرمایا اور آنے والی رات میں مع تمام خاندان کے مکے کی راہ لی۔ اس کے بعد جب اس کی اطلاع شیمان علیؓ کو پہنچی تو وہ بھی اپنے شاہراہی جلسے کے عازم مکہ ہوئے اور صرف سواہینے کی مدت میں یہ جگہ آ گیا کہ عراق میں حالات کی جانچ پڑتال اور ضروری پیشگی تیاریوں کے لیے مسلم بن عقیل کو فونے کو روانہ کر دیئے گئے۔ تو کیا یہ سمجھا جائے کہ یزید نے تختِ خلافت بعد میں ہنسٹالا والد کے انتقال کی خبر پاتے ہی فسق و فجور کا وہ عالم برپا کیا کہ حضرت معاویہؓ کے انتقال کی خبر سے پہلے یزید کے فسق و فجور کی خبریں پھیل گئیں؟ حالانکہ سچائی یہ ہے کہ اس بات کے لیے سواہینہ بالکل ناکافی تھا، کم از کم ایک سال تو گزرتا۔ "بیچاری مے" کی طرح فسق و فجور مفت میں بدنام ہوا ہے۔

لکیر کی فقیری یا طلب علم و تحقیق؟

اب ایک طریقہ تو یہ ہے کہ جب ابن خلدون جیسے آدمی نے بھی یہی لکھ دیا تو پھر شہوت ہو یا نہ ہو، سمجھ میں آئے نہ آئے، زمانے کی کیا گنجائش ہے؟ یہ وہ طریقہ اور وہ طرز فکر ہے
 لے کتاب میں اس مسئلے پر قدرے تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

جس نے سچی بات یہ ہے کہ ہمارا خانہ خراب کیا ہے اور علم کے نام سے علمی جمود ہمارا شعار بن گیا ہے۔ اگلوں کی توقیر و تعظیم کے نام پر طلب علم و تحقیق کی راہ بند کرنے والا یہ طرز فکر اگر ہمارے یہاں عام نہ ہوا ہوتا تو ہمارا عالم آج کے عالم سے بہت مختلف ہوتا۔ منجملہ اس کے یہ جو شیعیت ہمارے یہاں اُس وقت گھس آئی تھی جب اس نے ایک باقاعدہ متوازی مذہب کی شکل اختیار نہیں کی تھی، یہ بعد کے دور میں قطعی طور سے نکالی جاسکتی تھی اور نکال دی جاتی اگر طالب علمانہ کی جگہ یہ مقصوداً ذہنیت ہم پر حاوی نہ ہو چکی ہوتی کہ جو اوپر والوں نے جس معاملہ میں کہدیا اور لکھ دیا وہ حرتِ آخر اور ترقی کی بیکر ہے اور اس لیکر کی نقیری ہم کو کرنا ہی ہے ع
 برے سجادہ رنگیں کن گرت پیرنگاں گوید

اللہ ہی جانے کہاں سے یہ طرز فکر اس دینکے اسلام میں آیا جس کا خمیر ہی ذاتی غور و فکر کی دعوت سے اٹھایا گیا تھا اور آباء و اجداد اور رہبان و اجار (مشائخ) کی اندھی تقلید کو ضلال و خسران بتایا گیا تھا؟ کھلی ہوئی بات ہے اور ہم سبھی جانتے دانتے ہیں کہ کوئی آدمی عالم کل نہیں ہوتا، پھر ہر ایک کا کچھ خاص زاویہ نظر ہوتا ہے، ہر ایک اپنے زمانے اپنے ماحول اور ماحول پر غالب چیزوں سے متاثر ضرور ہوتا ہے۔ اس لیے کوئی کتنا بھی بڑا عالم اور محقق ہو کہیں نہ کہیں ٹھوکھو ضرور کھائے گا، کسی نہ کسی لاعلمی یا غلط فہمی کا شکار ضرور ہوگا (الا ماشاء اللہ) اس لیے اگر اس کے احترام کے ساتھ ساتھ علم کے حق کا احترام بھی منظور ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی باتوں کو تقلیداً لینے کے بجائے تحقیقاً لینے میں کوئی حرج سمجھا جائے اور حُنَّ مَاصِفًا دَدَّغَ مَا كَدَّر (جو ٹھیک ہے وہ لے لو جس میں گڑ بڑ ہے وہ چھوڑ دو) کے دانشمندانہ مقولے پر عمل نہ کیا جائے۔ کسی بڑے آدمی کے حوالے ہی کی ضرورت اگر اس کھلی ہوئی بات کو بھی قبول کرنے میں ہو تو حضرت امام مالکؒ کے بارے میں نقل ہوا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:-

كل يوخذ منه ويرد عليه سوائے اس نبوی ذاتِ گرامی کے ہر ایک کا

الإصاحب لهذا القدر۔ قول بطرح قابل قبول ہو سکتا، قابل رد بھی ہو سکتا،

ہر انسان کی اس محدودیت اور انفعالییت کے علاوہ ایک دوسری کھلی ہوئی بات یہ ہے کہ کسی گزشتہ زمانے کو ہم اخلاق و کردار اور عادات و اطوار کے لحاظ سے اس کے بعد والے زمانوں کے مقابلے میں خواہ کیسا ہی بہتر سمجھیں مگر وسائل کے معاملے میں ہر بعد والا زمانہ پہلے زمانوں کو پیچھے چھوڑتا آ رہا ہے۔ وسائلِ علم کا بھی یہی حال ہے کہ وہ برابر ترقی پذیر ہیں۔ کتنے ہی علوم جو اگلی صدیوں میں یا تو مدون نہ تھے اور مدون ہو گئے تھے تو ان کے مجموعے آسانی سے دستیاب نہ تھے؛ جبکہ زمانے کی ترقیوں نے ان کو اب نہایت منقح شکلوں میں ہر کہہ و سہ کی دسترس میں کر دیا ہے، پھر علمی تحقیقات کو آسان بنانے کا فن الگ نئے نئے طریقے اور وسیلے ایجاد کر کے اپنے کرشمے دکھا رہا ہے۔ نتیجے میں نئی علمی تحقیقات کا بھی ایک سلسلہ قائم ہو چکا ہے۔ ایسے حال میں ہمارا علم جوں کا توں اور جوہود مطلق کا نمونہ بنا رہے۔ جس معاملے میں جو بیان اگلے لوگ دے گئے تھے اور جو رائے ظاہر کر گئے تھے اسے نئے اور بہتر وسائل کی روشنی میں پرکھ کر دیکھنے اور پھر رد کر دینے یا قبول کیے رہنے کا اپنا فیصلہ کرنے کی جرأت کے بجائے ہم جوں کے توں اسی رائے پر قائم رہنے میں اور ہر نئی آواز اور نئی رائے سے لڑ جانے میں اپنی سعادت سمجھیں۔ یہ بے شک حزن نیت کے ساتھ (اُخروی سعادت ضرور ہو سکتی ہے مگر دنیوی سعادت کی قیمت پر ہوگی۔ اور ہو رہی ہے۔ جبکہ ہمارا دین بیک وقت دونوں سعادتوں کا کفیل ہے اور دونوں کی بیک وقت طلب ہی وہ ہمیں سکھاتا ہے۔

دوسرا طریقہ جو ابن خلدون جیسے اہل علم کا اصلاً طریقہ ہے، یہ ہے کہ ہمیں اگر حضرت حسینؑ کی زندگی میں یزید کے فسق و فجور کی کوئی معتبر شہادت نہیں

لے بلا تکلف اعتراف ہے کہ جو چیز آج قطعاً ناقلاً قابل فہم معلوم ہو رہی ہے۔ بہت کچھ ناقداہ ذہن رکھنے کے باوجود ایک زمانے میں ایک حد تک وہ اپنا حال بھی رہی ہے۔ اب افسوس ہوتا ہے کہ کاش عمر کا وہ قیمتی حصہ اس کم فہمی کی نذر نہ ہوتا۔ لہٰذا الفاظ کو یاد رکھیے کیونکہ گفتگو حضرت حسینؑ کی زندگی کے دور تک کی ہی ہے۔

ملتی تو پھر ساری دیند کہے، بشمول ابن خلدون کہے، تب بھی اس قول اور بیان کو بس اس پر
محمول کرنا چاہیے کہ بعض تائیں اپنی شہرت کی بنا پر اس درجہ یقینی اور قطعی بن جاتی ہیں اور
ایک زمانے تک بنی رہتی ہیں کہ ان کی واقعیت میں کسی شک اور ان کے بارے میں کسی
تحقیق کی ضرورت کا سوال ہی ذہن میں نہیں آتا۔ اور یہی چیز اس معاملے میں پیش آئی ہے۔
حضرت حسینؑ جیسی شخصیت کا زید کے آدمیوں کے ہاتھوں قتل اور پھر شیعہ پروپیگنڈہ مشینری
(جس نے پروپیگنڈہ کے زور پر حضرت عثمانؓ جیسے عظیم المرتبت صحابی کو ایک کافر و مزد باور کر دیا
تھا) ان دو چیزوں کی طاقت مل کر زید کے بارے میں کیا کچھ نہیں باور کرا سکتی تھی؟ اس شہرت
کا پردہ جب تک چاک نہ ہوا تھا اور پروپیگنڈے کا سحر ٹوٹا نہ تھا تب تک جس طرح بات چلتی
رہی چلتی رہی۔ مگر کیا وجہ ہے کہ ہمیشہ یوں ہی چلتی رہے اور حقیقت کھل جانے پر بھی اسکے
ساتھ حقیقت پسندانہ معاملہ نہ کیا جائے؟

مومن کا میعار اور اس کی ذمہ داری

زید سے ہماری کوئی رشتہ داری نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو پہلے حضرت حسینؑ سے ہے حضرت
معاویہؓ سے ہماری کوئی رشتہ داری نہیں، اور اگر ہے تو پہلے حضرت علیؑ سے ہے۔ مگر حضور اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم جن کی ذات اقدس کی طرف یہ تمام رشتہ داریاں لوٹتی ہیں ان کی ہمارا ک تعلیم
نے ہمارا رشتہ سب سے پہلے حق اور صداقت کے ساتھ قائم کر دیا ہے باقی تمام رشتہ داریوں کا درجہ

سہ صرف ایک شہادت ہمارے علم کی حد تک یہ ملتی ہے کہ حضرت معاویہؓ نے زید کی ولی عہدی کے معاملے میں اپنے
حاکم بصرہ زیاد سے مشورہ مانگا تو اس نے زید کے شوق شکار اور کچھ آزاد روی و سہل انگاری کا اندازہ کر کے
یہ مشورہ دیا کہ یہ کام کچھ مؤخر کر دینا مناسب ہوگا اور ساتھ ہی زید سے کہلوا یا کہ وہ اپنے حالات کی اصلاح کرے
چنانچہ اسی روایت کے مطابق اس نے اپنی بہت کچھ اصلاح کر لی (طبری ج ۶ ص ۱۰۱) یعنی جو کچھ تھا
وہ حضرت معاویہؓ کی زندگی میں تھا اور اسی زمانے میں ختم ہو گیا۔

اس کے بعد رکھا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ
إِيمَانًا وَالْوَضْعُوهَ كَمَا هُوَ
بِالنِّسْبِ شَهَدَاءَ لِلَّهِ وَرُؤُوسَ لِي
أَفْسِكُمْ وَأُولَ الَّذِينَ وَالِدِينَ
وَالْأَقْرَبِينَ لَهُ
اے ایمان والو مضبوط کھڑے ہو انصاف کے
ساتھ گواہ بن کر اللہ کے۔ اگرچہ گواہی تمہارا
اپنے خلاف ہو یا تمہارے والدین اور نزدیکوں
کے خلاف ہو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ
بِاللَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ
شُرَكَاءُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا إِنْ عَدِلْتُمْ
هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۗ

اے ایمان والو کھڑے ہو مضبوط الشریعہ کے
انصاف کے گواہ بن کر۔ اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں
بے انصافی پر آمادہ نہ کرے۔ انصاف ہی
کر دو کہ یہ قرین تقویٰ ہے۔

اسلام کی اس واضح اور صریح تعلیم کو دھیان میں رکھتے ہوئے ہمیں تو اس کی کوئی گنجائش نظر نہیں
آتی کہ یزید کے لیے اور حضرت حسین کے لیے ہمارے پاس الگ الگ ترازو اور الگ الگ باٹ
ہوں بلکہ:

العين تند مع والقلب يحزن
ولا نقول إلا ما يرضى به ربنا ۗ

آنکھوں میں نم ہے اور دل میں غم گزبان
سے سب ہی کہیں گے جو ہمارے رب کو پسند ہے۔

حضرت حسین اور یزید کے تھینے کا مطالعہ اگر اللہ ورسول کی ان تعلیمات کی روشنی میں ہی
اسپرٹ سے کیا جائے جس اسپرٹ سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ایک یہودی ملزم کے ساتھ باری
کی سطح پر اپنے قاضی کی عدالت میں حاضری قبول فرمائی۔ جس اسپرٹ کے ساتھ قاضی نے
حضرت علیؑ کے خلاف فیصلہ دیا (اور صوت اسٹیکٹیکل بنیاد پر دیا کہ گواہی معتبر شرائط پر پوری
نہیں اترتی) اور جس اسپرٹ کے ساتھ حضرت علیؑ نے یہ فیصلہ بلا تامل قبول فرمایا۔ انصاف

لہ القرآن۔ سورة النساء، آیت ۱۳۵۔ لہ القرآن سورة المائدة (۵)، آیت ۵۔
لہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس موقع کا ارشاد ہے جب صاحبزادہ ابراہیم علیہ السلام آپ کے ہاتھوں میں جان
جان آفریں کے سپرد کر رہے تھے اور آپ پر عم کا عالم طاری تھا۔

کی اس اسپرٹ کے ساتھ ہم اگر معاملے کو جانچنے کی کوشش کریں تو اس قضیے میں اب تک جو تصور چلا آ رہا ہے اس کے باقی رہنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ اور اگر واقعی ایک ایماندار اور غیر جانبدار نہ مطالعہ اس تصور اور تاثر کو باقی رکھنے کی اجازت نہیں دیتا جو اس معاملے میں اب تک عام طور سے رہا ہے تو پھر یقیناً یہ ایک ایماندارانہ فریضہ ہے کہ اس مطالعے کو سامنے لایا جائے اور ان تمام حلقوں تک اسے پہنچانے کی امکان بھر سہمی کی جائے جو اب تک کے تصور کو ایک ایمانی سادت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس طرح حقائق کے ساتھ بے انصافی جیسی غلط چیز ایمان کا تقاضہ بن جاتی ہے۔

اس کام کی ضرورت

راقم کو پورا احساس بلکہ تجربہ ہے جس کا اوپر اظہار ہو چکا ہے کہ ایسے معاملات میں جن کا تعلق نازک قسم کے جذبات سے جڑ گیا ہو ایک صدیوں اور نسلوں سے جھے ہوئے تاثر اور تصور کو چھیننا ایک پُرخطر کام ہے۔ مزید یہ اس لیے بھی ایک دشوار کام ہے کہ خود اپنے جذبات کی دنیا بھی اس ایمانداری کے ہاتھوں جگہ جگہ آزمائش میں پڑتی ہے۔ اس لیے کہ اب تک کا عمومی تصور کچھ ہم سہمی کوورٹے میں ملا ہے۔ مگر یہ معاملہ جیسا کہ اوپر بھی گزر چکا ہے ان معاملات میں سے ہے جنہوں نے ہمارے دینی زاویہ نظر کو مجموعی طور سے بہت متاثر کیا ہے، یہ ان معاملات میں سے ہے جن معاملات نے ہمارے اندر ایمانداری اور غیر جانبداری کے شعور کو مدغم کیا ہے، جن معاملات نے انصاف پسندی کی بے لاگ اسلامی روح کو بے جان کر دیا ہے اور حقیقت مبنی اور حقیقت پسندی جو اسلام کی سب سے بڑی دین تھی اُس سے اُمت کو بحیثیت مجموعی محروم کیا ہے، اُمت کا ہر طبقہ (خاص طور سے ہر دینی حلقہ) جو آج اپنے آپ کو معیار حق بنائے ہوئے ہے، اور اس طرح حق سب سے زیادہ شائبہ اور متنازعہ چیز بن گئی ہے، یہ ایسے ہی معاملات کا رفتہ رفتہ اثر ہے جن میں انصاف اور حقیقت پسندی جیسے اولین اسلامی اور انسانی تقاضوں

کو دوسرے تیسرے اور چوتھے درجے کے تقاضوں سے مخلوب ہو کر قربان کر دیا جاتا رہا۔ ہمارے اندر نئے نئے حلقوں کی پیدائش پرانے حلقوں کے باہمی بُعد میں اضافہ اور ان میں ہر ایک کے اندر انتشار اور ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے نئی باہمی تقسیمیں؛ یہ سب عذاب اسی انصاف پسندی، حقیقت پسندی اور حقیقت بینی کے نقد ان کا ہے، اس عذاب سے اُترتے نکلنے کی کوئی صورت اس کے بغیر نہیں ہے کہ جہاں جہاں سے اس فساد کی ابتدا ہوتی نظر آتی ہے وہاں وہاں سے اصلاح کے کام کی ہمت کی جائے۔

پیش نظر کتاب اصلاً تو والد ماجدؒ کے ایما کی تعمیل ہے، مگر جس خاص شکل میں اور جس انداز پر تیار ہوئی ہے وہ میرے اپنی مذکورہ بالا احساسات کا نتیجہ ہے، برسہا برس سے بڑی شدت کے ساتھ احساس ہے کہ ہمارے یہاں حقیقت پسندی اور انصاف پسندی جس پر تمام دینی اور دنیوی سعادتوں کا مدار ہے ایک عقدا صفت شئی ہو گئی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سعادت بھی ہمارے یہاں عقدا ہو گئی ہے عاقبت کی خبر تو خدا جانے۔ ہم پر وہاں کا حال وہیں جا کے کھلے گا۔ دنیا کی ہر سعادت سے بحیثیت قوم و ملت، محرومی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ جو قوم بھی حقیقت بینی اور حقیقت پسندی کا دروازہ اپنے اوپر بند کرے گی اور مزعومات کو عقدا بنا لے گی وہ لازماً پسماندگی اور محرومی ہی کو اپنا مقدر بنا لے گی۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ اپنا یہ حال بدلے اور یہ کتاب اس تبدیلیٰ حال میں مددگار ہو۔ والخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوة والسلام علی سیدنا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔

کچھ حوالوں کے سلسلے میں

کتاب کی تصوید کا بیشتر کام فروری ۱۹۰۹ء سے جولائی ۱۹۰۹ء تک ہندوستان کے قیام میں ہوا، مگر اس کی شروعات لندن ہی میں ہو چکی تھی، لندن میں البدایہ والنہایہ اور تاریخ ابن اثیر کے جوائڈیشن سامنے رہے تھے اور جن سے لیے ہوئے کچھ ٹوٹس وغیرہ بھی ساتھ تھے ہندوستان

میں کام کرتے وقت یہ ایڈیشن دستیاب نہ ہو سکے، اس کی بنا پر ایک ہی کتاب کے دو ایڈیشنوں کے حوالے کتاب میں آگئے ہیں، کوشش کی گئی ہے کہ حوالے میں ایڈیشن کا امتیاز ہو جائے مگر امکان ہے کہ کہیں کچھ التباس ہو گیا ہو۔ اگر کوئی صاحب ان دونوں کتابوں کا کوئی حوالہ ملا میں اور اس میں کوئی دقت پیش آئے تو سمجھ لیا جائے کہ صفحہ کا نمبر دوسرے ایڈیشن ہے۔ ان کتابوں میں واقعات کا سنہ وار ذکر ہے اس لیے سنہ کے حساب سے ہر واقعہ باسانی ہر ایڈیشن میں پایا جا سکتا ہے۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب سے اگر کوئی خیر انجام پائے تو اسے قبول فرمائے اور قلم نے کہیں لغزش کی ہو تو اس کے اثرات سے ناظرین کو بچائے اور مجھے اس پر تشبیہ ہونے کی سبیل پیدا فرمائے۔

تشکر و امتنان

کتاب کی تیاری کے سلسلے میں جن اصحاب کی مدد کا میں ممنون ہوں ان میں سرفہرست نام جناب مولانا سید محمد مرتضیٰ صاحب ناظم کتب خانہ دارالعلوم مدوۃ العلماء کا ہے جن کی عنایت و کرم فرمائی سے ضرورت کی ہر وہ کتاب جو کتب خانہ میں تھی بروقت اور بہ آسانی دستیاب ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس مہربانی کا بہترین اجر میری طرف سے دے۔ افسوس کہ وہ اس تیسرے ایڈیشن کے وقت ہماری دنیا میں نہیں ہیں۔ مدوۃ العلماء کے اساتذہ میں اپنے محبت قدیم مولانا برہان الدین صاحب شنبھلی اور ایک نئے محبت مولانا عتیق احمد صاحب بستوی کو بھی میں نے کئی دفعہ بعض چیزوں کی تلاش کے لیے تکلیف دی جسے ان حضرات کے علمی ذوق و نظر نے آسان کر دیا۔ ہر وقت کے اور حسب ضرورت مددگاروں میں میرے عزیز برادر خورد میاں خلیل الرحمن سجاد نعمانی رہے۔ اللہ ان کو سلامت بعافیت رکھے۔ کتابت کی تصحیح وغیرہ کی ذمہ داری

جبکہ اس کام کو مکمل کیے بغیر لندن چلا آیا تھا، انھیں کے اوپر رہی۔ اور اس کے بعد کتاب کی طباعت اور اشاعت کے اہتمام کے لیے ان سے بڑے بھائی میاں محمد حسان نعمانی دعاؤں کے مستحق ہیں۔

آخر میں اللہ سے دعا ہے کہ اس کتاب سے اگر کوئی خیر انجام پائے تو اسے قبول فرمائے اور قلم نے کہیں لٹریچر کی ہو تو اس کے اثرات سے ناظرین کو بچائے اور مجھے اُس پر متنبہ ہونے کی سبیل پیدا فرمائے۔

عینیق الرحمن سنہلی

لندن ۳ اگست ۱۹۷۹ء

باب اول

شہادت عثمانؓ - خانہ جنگی - صلح حسنؓ

شہادت عثمانؓ اور خانہ جنگی

حضرت عثمانؓ کی شہادت (۳۵ھ) کے وقت سے مسلمانوں میں باہم تلوار چلنے کا جو دروازہ کھلا تو پھر اس پر حرام ہو گیا کہ بند ہو، اور یہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:-
 اذا وضع السيف في امتي میری امت میں جب ایک دفعہ
 لم يرفع عنها الى يوم القيامة آپس میں تلوار کھینچ جائے گی تو پھر
 وہ قیامت تک رکھی نہ جائے گی۔

یہی بات حضرت عبداللہ بن سلامؓ (صحابی) نے اُن کو نبیوں، بصریوں اور مصریوں سے فرمائی تھی جو حضرت عثمانؓ کے درپے قتل تھے۔ مؤرخ ابن اثیر نے ان کے الفاظ نقل کئے ہیں۔

يا قوم لا تسلوا سيف الله فيكم اے لوگو! اللہ کی تلوار کو آپس میں مت
 فوالله ان سلتتموه لا تغمدوا کھینچو، خدا کی قسم اگر تم نے اسے بے نیام
 ويلكم! ان سلتا نكسر اليوم يقوم کر دیا تو پھر یہ واپس نیام میں جانیوالی

۱۔ مشکوٰۃ - کتاب الفتن - فصل ثانی - بحوالہ ابوداؤد، ترمذی۔ ۲۔ انہی لوگوں کے ہاتھوں حضرت عثمانؓ کی شہادت ہوئی۔ یہ کون لوگ تھے؟ اس کی کچھ تفصیل انشاء اللہ باب دوم میں آئے گی۔

بالدرة، فان قتلتموه لا يقوم
 الآ بالسيف۔ لہ
 نہیں ہے۔ دیکھو، سمجھو، آج تک تمہاری
 حکومت فقط دُرسے سے چلتی رہی ہے
 اگر تم نے ان عثمان کو قتل کر دیا تو پھر
 یہ تلوار ہی سے چلے گی۔

اور خود حضرت عثمانؓ نے ان لوگوں سے اس بات کو یوں کہا تھا:۔
 " اگر تم نے مجھے قتل کر دیا تو پھر آئندہ کبھی باہم محبت سے نہ رہ سکو گے،
 ایک ساتھ نماز نہ پڑھ پاؤ گے اور ایک جان ہو کے دشمن سے نہ لڑ سکو گے۔"

جنگِ حمل اور صفین

یہ تلوار آپس میں چلی اور ایسی چلی کہ الامان اخیفظ! شہادتِ عثمانؓ پر ایک سان بھٹکل
 گزرا کہ مسلمانوں نے آپس میں دو جنگیں، جنگِ حمل اور جنگِ صفین کے نام سے لڑیں اور اپنے
 ہزاروں بہترین افراد ان باہمی جنگوں کی نذر کر دیئے۔ دونوں جنگوں کے مقتولین کی تعداد
 تراسی ہزار تک بتائی گئی ہے اور جنگِ حمل کی تیڑہ ہزار تک۔

جنگِ حمل جمادی الاخریٰ ۳۶ھ میں ہوئی۔ اس میں ایک طرف حضرت علیؓ تھے۔
 دوسری طرف ام المومنین حضرت عائشہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت طلحہؓ۔ اس کو جنگِ حمل اس اونٹ
 کی وجہ سے کہا گیا ہے جس پر حضرت عائشہؓ سوار تھیں اور اس جنگ کا فیصلہ اس اونٹ کے
 کھڑے رہنے یا گر جانے پر ٹھہر گیا تھا۔ (عربی میں اونٹ کو حمل کہا جاتا ہے) حضرت علیؓ کے
 فوج کے دباؤ سے حضرت عائشہؓ کے حمایتی اگر تیسچھ ہتتے تھے تو اس اونٹ کے پاس جا کر
 بہ حال رک جاتے تھے اور اس کی حفاظت میں پروانہ دار جانیں دیتے۔ سینکڑوں آدمی بتنا

لہ اکامل فی التاریخ از ابن اثیر ج ۳ ص ۸۹۔ دار الفکر۔ بیروت۔

لہ تاریخ الامم والملوک (تاریخ طبری) از ابن جریر طبری ج ۳ جزو ۵ ص ۱۱۸۔ دار القلم۔ بیروت۔

گئے ہیں جو اس اونٹ کے ارد گرد شہید ہوئے۔

اس جنگ کا مختصر قصہ یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت موسم حج (ذی الحجہ) میں ہوئی جبکہ اہل مدینہ کی بھاری تعداد حج کے لیے گئی ہوئی تھی۔ منجملہ ان کے حضرت عائشہؓ اور بعض دیگر اہمات المؤمنین تھیں۔ یہ واپس ہو رہی تھیں کہ مدینے سے بہت سے لوگ مکتہ پہنچے جن سے حضرت عثمانؓ کے قتل کر دیئے جانے کی خبر ملی۔ حضرت عائشہؓ نے اپنا ارادہ بدل دیا اور مکتے ہی میں ٹھہر کر قاتلوں کے خلاف کاروائی کی منصوبہ بندی کا فیصلہ کیا۔ اس دوران میں حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ بھی مدینے سے پہنچ گئے۔ جو یہ خبر لائے تھے کہ مدینہ بالکل اُنہی اوباشوں کے قبضے میں ہے جن کے ہاتھوں خلیفہ سوم قتل ہوئے۔ ہم بھی جان بچا کر بھاگے ہیں۔ علیؓ کو انہی لوگوں نے خلافت قبول کرنے پر مجبور کیا ان اوباشوں کے خلاف کاروائی کے سلسلے میں آخری فیصلہ یہ ہوا کہ براہ راست مدینہ نہ جایا جائے بلکہ بصرے اور کوفے کا رخ کیا جائے جہاں سے ان اوباشوں کی ٹولیاں نکل کر مدینہ پہنچی ہیں۔ ان دونوں مقامات کو قابو میں کر کے (جہاں طلحہؓ اور زبیرؓ کے ماننے والے بھی بکثرت ہیں) ان اوباشوں کے خلاف کاروائی آسان ہوگی۔ اس منصوبے کے ساتھ وہ تمام لوگ جو حضرت عثمانؓ کے حامی یا کم از کم قاتلوں کے مدینے پر قبضے سے ناخوش ہونے کی بنا پر مکے پہنچ گئے تھے، ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کی قیادت میں بصرے کے لیے روانہ ہو گئے۔

حضرت علیؓ اگرچہ خود دیکھ رہے تھے کہ ان کے ارد گرد بھاری تعداد میں قاتلان عثمانؓ ہیں مگر آپ کی حکمت عملی یہ تھی کہ اس وقت ان کی حمایت کو قبول کیا جائے کیونکہ ان کو اس وقت چھیڑنا نقصان دہ ہوگا۔ بلکہ حضرت معاویہؓ (حاکم شام) جن کو آپ برطرف کرنا چاہتے ہیں ان کے خلاف کاروائی میں تو یہی لوگ سب سے زیادہ کارآمد بھی ہو سکتے تھے۔ اس بنا پر آپ پہلی ترجیح کے طور پر حضرت معاویہ کے خلاف کاروائی کی تیاری کر رہے تھے کہ مکے سے حضرت عائشہؓ اور زبیرؓ کی قیادت میں یہ بصرے کے لیے ایک لشکر کی روانگی کی خبر ملی۔

حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کی وجہ سے بظاہر یقینی ہے کہ اس نہم کو حضرت علیؓ نے نہ صرف قاتلانِ عثمانؓ کے بلکہ خود اپنے خلاف بھی جانا ہوگا۔ کیونکہ حضرت علیؓ کی بیعت کے سلسلے میں ان حضرات کے درمیان بدگمانی کے اسباب پیدا ہو گئے تھے۔ بہر حال حضرت علیؓ نے فوری طور پر مدینے سے کوچ کر کے ان لوگوں کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ مگر وقت گزر چکا تھا۔ اس لیے بصرے کی ہم بلار کاوٹ بھرے پہنچ گئی۔ حضرت علیؓ بھی اپنی فوج کے ساتھ وہاں پہنچے اور پھر طرین میں مذاکرات شروع ہوئے۔ جس کے نتیجے میں اس شرط پر صلح کی صورت بن گئی کہ حضرت علیؓ اپنے آپ کو قاتلانِ عثمانؓ سے آزاد اور بے تعلق کر لیں۔ ان لوگوں نے اس صلح کی سن گن پالی۔ جس میں ان کی قطعی موت تھی۔ چنانچہ ان لوگوں نے مشاورت کر کے فوری فیصلہ یہ کیا کہ حضرت عائشہؓ کے لشکر پر شب خون مار کر کے جنگ کی آگ بھڑکا دیجائے اور اس میں یہ لوگ کامیاب ہو گئے۔ پھر جو جنگ پھڑی تو اس وقت رکی جب حضرت علیؓ نے اس جنگ کے جلدی رکنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہ دیکھی کہ اونٹ کو نشانہ بنایا جائے اور وہ بیٹھنے پر مجبور ہو جائے۔ چنانچہ یہ ہوا اور یہیں پر جنگ ختم ہو گئی۔ یعنی یہ بس ایک روزہ جنگ تھی۔ حضرت عائشہؓ بالکل سلامت رہیں اور پوری طرح باعزت سلوک کے ساتھ مکے کو روانہ کر دی گئیں۔ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ نے البتہ شہادت پائی۔ اور سب بڑا نقصان یہ ہوا کہ قاتلانِ عثمانؓ کے گروہ سے حضرت علیؓ کی آزادی اور بے تعلقی اب مشکل تر ہو گئی۔ اور اس کے نتیجے میں حضرت معاویہؓ کے ساتھ بھی کسی مصالحت کا امکان گویا بالکل ختم ہو گیا۔ کیونکہ اس میں ان قاتلوں کی موت یقینی تھی۔ وہ حضرت معاویہؓ کو اور حضرت معاویہؓ کو انہیں بردا کر سکتے تھے۔

جنگِ جمل کے بعد حضرت علیؓ نے کوفہ کو اپنا دارِ اختلافہ قرار دے لیا اور یہاں سے پھر حضرت معاویہؓ کے ساتھ نامہ و پیام شروع کیا کہ وہ بیعت کریں اور اپنی معذرتی قبول کر لیں۔ ان کی شرط تھی کہ قاتلانِ عثمانؓ سے قصاص لیا جائے۔ جو ظاہر ہے کہ کم از کم فوراً تو ناممکن بات تھی۔ چنانچہ جنگ کی ٹھن گئی اور شام و عراق کے درمیان صفین کے مقام پر ۳۶ ہجری

میں طرفین کا آمناسا منا ہوا اور تقریباً دو ماہ یہ جنگ چلی جس کا خاتمہ اس وقت ہوا جب حضرت معاویہ کے لشکر سے نیزوں پر قرآن اٹھائے گئے کہ قتل و قتال کی حد ہو گئی، اسے بند کرو اور قرآن کو حکم بنا لو۔ اسی کو واقعہ تحکیم کہا جاتا ہے۔ مقتولین کی تعداد تترہزار تک بتائی گئی ہے۔

حضرت علیؑ کی شہادت

حضرت علیؑ نے حکیم کی پیش کش پر جنگ اپنی مرضی کے خلاف بعض اہم ساتھیوں کے دباؤ پر بند کی تھی۔ ورنہ آپ اس پیش کش کو ایک جنگی چال سمجھتے تھے اور واقعی اس کو قبول کرنے سے آپ کے مجاذکوناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ منجملہ اس کے یہ تھا کہ آپ کی فوج کا ایک حلقہ اسی تحکیم کی بنا پر آپ سے ایسا برگشتہ ہوا کہ کافر ہی قرار دے دیا۔ اور آپ سے برسر جنگ ہو گیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو تاریخ اسلام میں خارجی اور خوارج کہلائے۔ انہی میں کے ایک نے رمضان ۴۰ھ میں آپ کو شہید کر دیا۔

حضرت حسنؑ کی خلافت

آپ کی شہادت کے بعد ساتھیوں نے آپ کے بڑے صاحبزادے حضرت حسنؑ کو جانشین بنایا۔ حضرت حسنؑ نے باہمی خون خرابے کا ماحول ختم کرنے کے لیے حضرت معاویہؓ کے حق میں دست برداری کا فیصلہ کیا۔ یہ ۴۱ھ کی بات ہے جب کہ آپ کی خلافت کو چھ مہینے ہوئے تھے۔ حضرت معاویہؓ نے اس کے لیے آپ کے منہ مانگے شرائط منظور کیے اور زیج الاول ۴۱ھ میں یہ مصالحت دست برداری پائی تکمیل کو پہنچ گئی اس طرح یہ پانچ سال کا فترتہ مٹ کر اسلامی وحدت پھر سے بحال ہوئی۔ چنانچہ اس سال کو مسلمانوں

سالہ اولیہ لوگ ان میں سے تھے جنہوں نے حضرت علیؑ کو مجبور کیا کہ تحکیم کو قبول کر لیں مگر بعد میں جب حکیم کی علیؑ ہوتی رہی کہ وہ آدمی حکم بنائے جائیں تو یہ احمق بگڑ گئے کہ آدمی کو حکم بنا کر قرآن کے خلاف ہے۔

نے عام الجماعت، اجتماعیت واپس آنے کا سال قرار دیا۔

عالی مقام بیٹا

حضرت حسنؓ کے بارے میں ایک ارشاد نبویؐ صحیح بخاری میں روایت ہوا ہے کہ آپؐ نے حضرت حسنؓ کی طرف اشارہ کر کے (جبکہ وہ بچے ہی تھے) فرمایا کہ

ان ابني هذا سيد ولعل الله

میرا یہ بیٹا سید (عالی مقام) ہے

ان يصلح به بين فئتين عظيمتين

امید ہے کہ اللہ اس کے ذریعہ مسلمانوں

من المسلمين ۱۰

کے دوڑے گروہوں میں صلح کرائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد صحابہ کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے جنگ جمل اور جنگ صفین (جو حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مسلمانوں نے آپس میں لڑیں) سے اپنے آپ کو علیؓ رہ رکھا مثلاً حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت اسامہ بن زیدؓ، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ یہ اور ان کے ساتھ بہت سے حضرات اس اختلاف اور خانہ جنگی کو وہ فتنہ سمجھتے تھے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو ڈرایا تھا۔ طبری نے جلیل القدر تابعی امام شعبیؒ (م ۱۰۴ھ) سے روایت کی ہے کہ:-

بالله الذي لا اله الا هو امنه

قسم خدا کے وحدہ لا شریک کی اس واقعہ

في تلك الفتنة الاستتار بين

میں بدری صحابہ (جن کا درجہ سب سے اعلیٰ مانا

مالهم سابع اوسبعة مالهم ثامن ۱۱

جاتا ہے) میں سچے کے سوا کوئی ساتواں

یا ساس کے سوا کوئی آٹھواں تھا جو شریک ہوا ہو۔

۱۰ مشکوٰۃ (بحوالہ بخاری) باب مناقب اہل بیت ۱۰ طبری جزو ۵ ص ۱۶۵ روایت میں چھ اور سات کا جو شک ہے اس کی وجہ طبری کی اگلی روایت کے مطابق حضرت ابو الوثب انصاری کے بارے میں امام شعبی کا شک ہے کہ وہ شریک تھے یا نہیں اور تاریخی تحقیق یہ بتاتی ہے کہ شریک نہیں تھے۔

حضرت حسن کی عمر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں اگرچہ اتنی نہ تھی کہ وہ فتنہ کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے ارشادات اور زہدیت سے واقف ہو سکتے جیسے ارشادات حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور دوسرے مقابلتا بزرگ صحابہؓ کو اس موقع پر یاد آ رہے تھے۔ اور اس لیے وہ اپنے والد ماجد کے ساتھ جنگ جمل اور جنگ صفین دونوں میں اگرچہ شریک ہوئے۔ مگر ان کی طبیعت جس سانچے میں ڈھلی تھی اس کے زیر اثر ان کی ابتدائی کوشش یہی رہی تھی کہ ان کے والد ماجد حضرت علیؓ سے گریز فرمائیں۔ طبری اور ابن اثیر دونوں میں ہے کہ حضرت معاویہؓ کی طرف سے جب یہ جواب آگیا کہ وہ قصاص عثمانؓ کا مطالبہ پورا ہونے سے پہلے حضرت علیؓ کی خلافت تسلیم کرنے والے نہیں ہیں اور حضرت علیؓ اس وقت تک مدینے ہی میں تھے تو اہل مدینہ کو فکر ہوئی کہ پتہ چلے کہ اب علیؓ کا ارادہ کیا ہے؟ وہ معاویہؓ کے خلاف لشکر کشی کریں گے اور اس طرح اہل قبلہ کے خلاف تلوار اٹھائیں گے یا اس سے رک جائیں گے۔ اور تحسب خاص کر اس لیے ہوا تھا کہ انہیں پتہ چلا تھا کہ حسنؓ اپنے والد کو یہ رائے دے رہے ہیں کہ وہ کوئی اقدام

لے مثلاً حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے لوگوں کو یاد دلایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ غزیرہ ایک فتنہ آرزوئی اور غیر واضح معاملہ رہتا ہوگا جس میں بیٹھے رہنے والا کھڑے رہنے والے سے بہتر ہوگا اور کھڑا ہونے والا چلنے والے سے اور چلنے والا (یعنی پیدل چلنے والا) سواری پر چلنے والے سے (ابن اثیر ج ۳ ص ۱۱) اسی فتنہ کا حوالہ ان تمام لوگوں کی گفتگوؤں میں ملتا ہے جنہوں نے حضرت علیؓ کی خلافت قبول کی مگر جنگ میں ان کا ساتھ قبول نہیں کیا۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ تو خود کسی سے کم تر بزرگ صحابی نہ تھے، انہیں کیوں فتنے کی حد نہیں یاد آ رہی تھیں؟ اس سلسلے میں کوئی قطعی بات تو نہیں کہی جاسکتی لیکن بظاہر آپ خلافت کی بیعت لے لینے کی وجہ سے نظم و ضبط کو اہم تر ذمہ داری سمجھ رہے تھے اور یہ کہ فتنہ فرو ہونے کی یہی صورت ہے۔

واللہ اعلم۔
 ۱۰ اہل قبلہ کے خلاف تلوار اٹھانے کے الفاظ طبری اور ابن اثیر کی روایت ہی کے ہیں۔ "دایۃ فی قتال اهل القبلة، أيجراً عليه، أم ينكل عنه؟" طبری ج ۵ ص ۱۶۵۔

نہ کریں۔ روایت میں ہے:

وقد بلغهم ان الحسن بن علي
دعاء الى القعود وترك
التاس به
اور انہیں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ حسن بن علی
اپنے والد کو یاد دلائے رہے ہیں کہ آپ کوئی اقدام
نہ کریں اور لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑیں

ابن کثیر نے اس موقع پر حضرت حسنؓ کے الفاظ بھی نقل کیے ہیں کہ ان الفاظ میں آپ
نے اپنے والد ماجد کو کسی اقدام کے خلاف رائے دی۔

يا ابا عبد الله هذا فان نية سفك
دماء المسلمين ودفع
الاختلاف بينهم - ۱۰۴
ابا جان! یہ نہ کیجئے، یہ ارادہ ترک کر دیجئے،
کیونکہ اس میں مسلمانوں کی خونریزی
اور باہم اختلاف انگریزی ہے۔ ۱۰۵

ابن اثیر ہی میں ایک دوسری جگہ آتا ہے (اور طبری اور البدایہ والنہایہ میں بھی ہے) کہ
اہل شام پر (یعنی حضرت معاویہؓ کے خلاف) فوج کشی کی تیاری ہو رہی تھی کہ پتہ چلا کہ
سے حضرت عائشہؓ کی سرکردگی اور حضرت زبیرؓ و طلحہؓ کی رہنمائی میں ایک فوج حضرت علیؓ کے
ساتھیوں کی طرف سے (جن میں قاتلان عثمانؓ اور ان کے ہمنوا شامل تھے) بے اطمینانی کے
ماخت بصرہ کی طرف روانہ ہو گئی ہے تاکہ ان کے خلاف کاروائی کر کے حضرت علیؓ کو ان
کے جنگل سے نکالاجائے تو حضرت علیؓ نے بجائے تنہا جانے کے یکایک مدینے سے نکل کر
ان لوگوں کو راستے میں روکنے کا فیصلہ کیا۔ روایت سے ایسا لگتا ہے کہ حضرت حسنؓ ساتھ
نہیں تھے لیکن بعد میں پہنچ کر رزہ کے مقام پر ملے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ان کے
روکنے سے حضرت علیؓ کے نہیں تو وہ خود ان کے ساتھ روانہ نہیں ہوئے مگر پھر کچھ خیال

۱۰۴ ابن اثیر ج ۳ ص ۱۰۴
۱۰۵ البدایہ والنہایہ ج ۷ ص ۲۵ مطبوعۃ الاممی۔ ریاض
۱۰۶ کیونکہ ابن اثیر کی اصل طبری ہی کی روایتیں ہیں اور اسی طرح البدایہ والنہایہ کی بھی اصل وہی ہے۔
۱۰۷ مدینے سے مکہ کے راستے میں تین میل پر ایک مقام ہے۔

آیا تو بیچھے سے چل کر زندہ پہنچے اور وہی گفتگو پھر کی جس کا اشارہ اوپر کی روایت میں ملتا ہے۔

دأتا کا ابنہ الحسن فی الطریق
فقال لہ لقد امرتک نعصیتنی فقتل
عدا بمضیعة لا ناصر لک
فقال لہ علی... وما الذی
امرنی نعصیتک قال امرتک
یوم اُحیط بعثمان ان تخرج
عن المدینة فیقتل ولست
بهاثراً امرتک یوم قتل ان لا
تبايع حتی تأتیک وفود العرب
ربیعة اهل کل مصر فانهم لن
یقطعوا امراً دونک فابیت علی
وامرتک حین خرجت هذه
المرأة وهذان الرجلان ان
تجلس فی بینک حتی یصلحوا
فان کان الفساد کان علی ید
غیرک نعصیتنی فی ذالک
کله۔ لہ

آپ کے عیہ حسن راتے میں آپ کے پاس آئے
اور کہا کہ میں نے کچھ آپ سے کہا تھا جو آپ نے
ہنیں مانا نتیجہ یہ ہو گا کہ کل کو آپ بے یار
و مددگار ملے جائیں گے حضرت علی
نے کہا کہ تم نے مجھ سے کیا کہا تھا جو میں نے
ہنیں مانا؟ کہا کہ جس دن عثمانؓ تمھورے
گئے میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ میرے
باہر چلے جائیں گے آپ کی موجودگی میں کچھ نہ
ہو، پھر جب عثمانؓ قتل کر دیئے گئے تو میں نے
آپ سے کہا کہ آپ بیعت مت لیجئے حتیٰ کہ
تمام عرب سے وفود آپ کے پاس آویں اور شہر
کے لوگوں کی بیعت آجائے۔ اس لیے کہ
یہ لوگ آپ کے سوا کسی کو منتخب کر ہی نہیں
سکتے، آپ نے یہ بات بھی نہیں مانی اور پھر
جب عائشہؓ اور زبیرؓ طلحہؓ بنکے تو میں نے کہا کہ آپ
گھر بیٹھی حتیٰ کہ یہ مادہ مصالحت ہو جائے
اگر فساد ہوتا ہے تو وہ آپ کے نہیں دوسرے
کے ہاتھ سے ہو گا آپ نے یہ کوئی بھی بات نہیں مانی۔

حضرت علیؓ کی رائے میں صحابہؓ نے حسنؓ کا مشورہ صحیح نہ تھا اس لیے انھوں نے جس بنا

کو صحیح سمجھا اس پر عمل فرمایا اور پھر باہمی جنگ اور خونریزی کا ایک طویل سلسلہ چلا جس میں حضرت حسنؑ بھی والد ماجد کے دوش بدوش شامل رہے مگر جب ۴۰ھ میں ایک خارجی کے ہاتھ سے حضرت علیؑ کی شہادت کا سانحہ پیش آیا اور آپ کی جانشینی کا بار حضرت حسنؑ کے کاندھوں پر رکھ لیا تو اس وقت حقیقت بالکل آئینہ ہو چکی تھی کہ اس اختلاف سے مسلمانوں کا بے پناہ نقصان ہو گیا تھا اور اب بھلائی اسی میں تھی کہ یہ باب بند کر دیا جائے۔ حضرت علیؑ کے حامیوں میں انتشار حکم عدولی اور شکست خوردگی کا مسلسل تجربہ بھی سامنے تھا، اس لیے گروہی نقطہ نظر سے بھی بہتری باعتر مصالحت ہی میں تھی چنانچہ حضرت حسنؑ کے حصہ میں یہ سعادت آئی کہ ان کی پیش قدمی کی بدولت مسلمانوں کا پانچ سالہ تفرقہ مٹے اور وہ پھر سے ایک جماعت بن جائیں، اور اس طرح وہ شینگونی بھی پوری ہوئی جو بخاری کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے لیے فرمائی تھی کہ "میرا یہ بیٹا بڑا عالی مقام ہوگا اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کا تفرقہ مٹے گا۔"

امن و کھیتی کے بیس سال

حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؑ کے اختلافات کی بدولت حضرت معاویہؓ کے بارے میں کسی کی کچھ بھی رائے ہو مگر ایک بات سے انکار کسی انصاف پسند کے لیے ممکن نہیں ہے کہ ان کے اندر عرب سرداری کی اعلیٰ ترین خصوصیات تھیں۔ ایک طرف وہ اپنے زمانے کی عرب دنیا کے پانچ دور اندیشوں اور دیدہ وروں (دوہات عرب) میں سے ایک مانے جاتے تھے، اور انھوں نے ثابت کر دیا کہ ان پانچ میں وہ سب سے بڑھ کر تھے۔ دوسری طرف سخاوت اور حلم کے بادشاہ داد و دہش میں ہاتھ نہیں رکھتا تھا اور بربداری کی انتہا نہیں تھی۔ چنانچہ حضرت معاویہؓ کی ان صفات نے

۱۔ باقی چار کے نام ہیں: حضرت عمر بن العاص، مغیرہ بن شعبہ، قیس بن سعد اور عبد اللہ بن ابی بکر۔ ان میں سے حضرت معاویہؓ کے ساتھ تھے ۲۔ غیر جانبدار اور ۳۔ وہ ۴۔ حضرت علیؑ کے ساتھ ۵۔ طبری ج ۳ ج ۶ ص ۹۳۔

تفرقہ کی جلیجوں کو پاٹنے اور اُس زمانے کی تلخ یادوں کو بھلانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ان کا بیس سالہ دور حکومت ۱۴۴ھ تا ۱۶۰ھ ہوا۔ العموم امن و عافیت اور مسلمانوں کی یکجہتی کے ساتھ گزرا اور مسلمان آپس کی جنگ سے چھٹی پا کر ان محاذوں کی طرف واپس چلے گئے جہاں وہ دشمنانِ اسلام کے خلاف مصروفِ جنگ ہوتے اور نئی فتوحات حاصل کرتے تھے۔ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں آپ کے حالاتِ زندگی پرتزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:-

”خلافتِ عمری اور خلافتِ عثمانی میں معاویہؓ کے ہاتھوں شامی محاذ پر جہاد اور فتوحات کا جو شاندار سلسلہ چلتا رہا تھا وہ اُس وقت بالکل رک گیا جب ان کے اور علیؓ کے درمیان معرکوں کا دور چلا۔ ان دنوں میں نہ ان کے ہاتھ پر کوئی نئی فتح ہوئی نہ ان کے ہاتھ پر.... حتیٰ کہ حسنؓ کے ساتھ صلح ہوئی اور معاویہؓ کی خلافت پر جیسا کہ گزر چکا ہے ۱۴۴ھ میں، پوری اسلامی دنیا نے اتفاق کر لیا۔ اُس وقت سے لے کر اپنے سن وفات (۱۶۰ھ) تک وہ بے فعل و غش حکمراں رہے۔ اس شان کے ساتھ کہ دشمن کی سرزمین پر جہاد ہو رہا ہے، حق کا پرچم بلند ہے، چاروں طرف سے مالِ غنیمت آ رہا ہے اور مسلمان ان کے ساتھ آرام، انصاف اور عفو و درگزر کی نصیحت میں رہ رہے ہیں“

حضرت معاویہؓ اور حضرت حسنؓ

شیعہ علماء و مصنفین پر افسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے حضرت علیؓ کے نام پر معاویہؓ و دشمنی میں حضرت معاویہؓ کی مسلمہ صفاتِ حلم، سخاوت و سماعت اور ان پر مبنی تاریخی حقائق کو بھی جھٹلانے کی مقدور بھرپور کوشش کی ہے۔ یہاں تک کہہ دیا کہ انہوں نے تو وہ وعدے بھی پورے نہیں کیے جو حضرت حسنؓ کے ساتھ شرائطِ صلح کے طور پر طے ہوئے تھے۔ حالانکہ ان کا معاملہ حضرت

حسن ہی نہیں حضرت حسینؑ کے ساتھ بھی اس حد تک حسن سلوک اور رواداری کا تھا کہ اعلیٰ درجے کے حکم مدبر اور کریم النفسی کے بغیر اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ مثال کے لئے خود اپنی حضرات کی کتابوں میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ ایک مرتبہ مین سے دمشق کو ایک سرکاری قافلہ بہت ساقیتی سامان مثلاً مینی چادریں، عنبر اور دیگر خوشبوئیاں لے کر حسب معمول مدینے سے گزر رہا تھا۔ حضرت حسینؑ نے روک کر اس کا تمام مال اتروالیا اور حضرت معاویہؓ کو یہ خط لکھ کر بھیج دیا کہ ”ایسا ایسا قافلہ جو دمشق میں تمہارے خزانے بھرنے اور تمہارے باپ کی اولاد کا سامان عیش بننے کے لیے جارہا تھا میں نے اسے روک کر اس کا مال لے لیا ہے کیونکہ مجھے ضرورت تھی“۔ ہم یقین نہیں کر سکتے کہ حضرت حسینؑ نے ایسی نامناسب زبان اپنے خط میں استعمال فرمائی ہوگی، گمان غالب ہے کہ خط کو یہ زبان ان حضرات کی عطا کر رہے جو اس بات کے روادار نہیں کہ حضرت حسینؑ کو حضرت معاویہؓ کے ساتھ اس سے بہتر زبان میں مخاطب ہوتا ہوا دیکھیں۔ بہر حال ان حضرات کی روایت کے مطابق یہ خط حضرت حسینؑ نے حضرت معاویہؓ کو لکھا۔ اب دیکھیے کہ اس کا کیا اور کس انداز کا جواب حضرت معاویہؓ نے اپنی حضرات کی روایت کے مطابق دیا۔

”اللہ کے بندے معاویہ کی طرف سے حسین بن علی کے نام۔ تمہارا خط ملا جس میں تم نے لکھا ہے کہ میں سے آتا ہوا قافلہ روک کر اس کا سامان تم نے لے لیا ہے۔ لیکن تمہیں یہ چاہیے نہیں تھا جبکہ وہ میرے نام سے آ رہا تھا۔ کیونکہ یہ حق صاحبِ جلال

لہ جیات الامام حسین بن علیؑ۔ از باقر شریف القرظی۔ مطبوعہ مؤسسۃ الوفاء بیروت ج ۲ ص ۲۳۷۔ نیز منقول حمین از عبد الزاق الموسوی المرقم، مطبوعہ دارالکتب اسلامی بیروت حاشیہ ص ۱۶۳ بحوالہ شرح نہج البلاغہ لابن حدید ج ۴ ص ۳۲۷ طبع اول۔ احنیٹا خط کے عربی الفاظ کو بھی یہاں پڑھ لیجئے۔
من الحین بن علی الی معاویۃ بن ابی سفیان اما بعد ! فان عیڑ امرت بتامن الیمن تحمل مالا دخللا وغنبرا وطیبا الیک، لتودعها خزائن دمشق وتعلل بها بعد النہل بنی ابیک وانی احتجت الیہا فاخذتھا“ والسلام۔

ادالی اکا ہے کہ مال اس کے ہاتھ میں آوے پھر وہی اسکو تقسیم کرے، اللہ جانتا ہے کہ
اگر تم اسکو میرے پاس آنے دیتے تو میں اس میں سے تمہارا حصہ دینے میں کوئی کمی نہ
کرتا، لیکن بھتیجے! بات یہ ہے کہ تمہارے دماغ میں ذرا تیزی ہے، کاش کہ یہ بس جیرے
ہی زمانے تک رہے کیونکہ میں تمہاری قدر و قیمت جانتا ہوں اور ایسی باتوں سے
درگزر کر لیتا ہوں، ڈر لگتا ہے کہ (بعد میں) تمہارا واسطہ کسی ایسے سے نہ پڑ جائے
جو تمہیں کوئی چھوٹ دینے کو تیار نہ ہو، لے

اس چھوٹی سی خط و کتابت سے کیا کیا بات ثابت ہوتی ہے، اس وقت اس سب کے
احاطہ کا موقع نہیں صرف اتنی بات یہاں کہنا مقصود ہے کہ حضرت معاویہؓ کا یہ جواب دیکھ کر
کسی ادنیٰ انصاف پسند کے لیے شبہ کی بھی گنجائش نہیں رہتی کہ وہ حضرات حسنین کے ساتھ پاس
لحاظ اور کریم انفسی کے سوا کوئی دوسرا معاملہ کرتے ہوں گے، چہ جائیکہ وہ وعدے بھی پورے
نہ کریں جس پر حضرت حسنؓ نے خلافت کی جنگ سے دستبرداری دی تھی لے

یہ دعوے (یا یہ کہیے کہ حضرت معاویہؓ پر بد عہدی کا الزام) یوں تو شیعہ حضرات کے یہاں
عام ہے، لیکن بہت تعجب اس وقت ہوا جب اس مضمون کی تیاری کے سلسلے میں لکھنؤ کے

لے حوالہ سابق۔ لے حضرت حسینؓ اور حضرت معاویہؓ کی یہ خط و کتابت اور جس واقعہ کے سلسلے میں یہ خط و کتابت
ہوئی وہ واقعہ، یہ سب کچھ شیعہ تہذیب کے حوالے سے درج کیا گیا ہے اور خاص طور سے اس لیے درج کیا گیا ہے کہ انہی لوگوں
کے بیان سے انکا یہ الزام غلط ثابت ہو جائے کہ حضرت معاویہؓ کا حضرت حسنؓ کے ساتھ معاملہ اچھا نہیں تھا اسکے
سوا اس واقعہ اور خط و کتابت کو یہاں درج کرنے کا کوئی دوسرا مقصد کوئی مقول آدی نہیں سمجھ سکتا مگر کتاب
کا پہلا ایڈیشن (اردو) شائع ہوا تو کچھ لوگ جن کو کتاب کا ٹھیکہ روایتی انداز سے ہٹا ہوا ہونا ناگوار گزارا
ہے انہوں نے اس واقعہ اور خط و کتابت کو بیان کرنے کا یہ مطلب بھی نکال لیا ہے کہ مصنف حضرت حسینؓ
کو (نعوذ باللہ) ایک لیرا بنانا چاہتا ہے۔ ایسے لوگوں کو جواب تو کہاں دیا جاسکتا ہے، ہاں
دعائے خیر ان کے لیے کی جاسکتی ہے۔

شیخ عالم جناب سید علی نقی (المعروف بقن صاحب) کی تصنیف "شہید انسانیت" دیکھتے ہوئے اس دعوے کی دلیل میں تاریخ طبری کا حوالہ نظر سے گزرا، یہ حوالہ جز ۷ ص ۹۳ کا ہے۔ طبری کے اس مقام پر واقعہ یہ الفاظ پائے جاتے ہیں کہ "فَلَمْ يُغَيِّذْ لِلْحَسَنِ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنَ الشَّرْطِ وَشَيْئًا" جن کا ترجمہ اگر کوئی چاہے تو بے شک ان الفاظ میں کر سکتا ہے کہ "شرطیہ کی گئی تھیں ان میں سے کوئی ایک بھی (معاویہؓ نے) پوری نہیں کی"۔ لیکن اہل علم سے بعید ہے کہ وہ طبری کے اس جملہ کا حوالہ اس مقصد کے لیے دیں کیونکہ اسی تاریخ طبری میں ایک صفحہ پہلے ص ۹۲ پر گزر چکا ہے کہ۔

وقد صالح الحسن معاوية علي	اور حسن نے معاویہ سے صلح اس شرط پر
ان جعل لنا في بيت مالہ	کی تھی کہ کوفے کے بیت المال میں جو
وخراج داسا بمجرد علي ان لا	کچھ ہے وہ ان کا ہو گا نیز داراب گرد
يُشْتَرَع علي وهو ليعم فاحذما	کاخراج ان کو ملا کرے گا اور ان کے سوا
في بيت مالہ بالكوفة وکان فيه	حضرت علیؓ پر سبب تہم نہیں ہوا اگر بیگاپس
خمسة آلاف الف .	انہوں نے وہ رقم لے لی جو کوفے کے بیت

میں تھی اور وہ پچاس لاکھ (درہم) تھی۔

اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ کوئی ایک شرط بھی پوری نہیں کی گئی۔ ایک صفحہ آگے چل کر یعنی ص ۹۳ پر طبری نے جن شرائط کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ پوری نہیں کی گئیں، ان کا قصہ دوسرا تھا۔ وہ قصہ طبری ہی کے بیان کے مطابق یہ تھا کہ یہ شرائط جن کا بیان آیا ہے تو وہ تھیں جو حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہؓ سے صلح کی خواہش کرتے ہوئے ان کو لکھ کر بھیجی تھیں۔ ادھر حضرت معاویہؓ خود نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے درمیان

۱۔ شہید انسانیت ص ۲۳، ۲۴۔ سید العلماء اکادمی لکھنؤ۔ ۲۔ شہر کا نام ہے عربی میں اسکو دارابجرد لکھا گیا ہے مگر مولانا شبلی کی الفاروق سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی میں اس کا اصل نام داراب گرد ہے۔

کشت و خون کا سلسلہ چلتا ہے۔ چنانچہ قبل اس کے کہ حضرت حسنؓ کا ماسلہ ان تک پہنچے انہوں نے خود دو آدمی ایک سادہ کاغذ پر دستخط کر کے اس پیغام کے ساتھ بھیجے تھے کہ حسنؓ جو شرائط صلح چاہیں اس کاغذ پر لکھ دیں مجھے منظور ہیں۔ چنانچہ حضرت حسنؓ نے اس کاغذ پر کچھ نئے شرائط بھی بڑھا کر لکھ دیئے۔ یہ تھے وہ شرائط جن کے بارے میں طبری کی ص ۹۳ کی روایت بتا رہی ہے کہ:-

فاختلفا فی ذالک فلم یبق
ان شرائط کے بارے میں اختلاف ہوا
للحسن علیہ السلام۔ الخ اور ان میں کوئی شرط معاویہؓ نے پڑھی نہیں۔

مولانا نقی صاحب نے اس پورے واقعہ کو قلم انداز کر دیا ہے اور افسوس ہے کہ اسی ایک جگہ نہیں اور بھی بہت سی جگہوں پر موصوف نے اسی طرح کا معاملہ شیعہ مزعوامات کو بنا ہتے کیلئے اپنی اس تصنیف میں کیا ہے جن میں سے بعض کا ذکر اپنے موقعہ پر آئے گا

بہر حال شرائط صلح پورے نہ کیے جانے کی بات بڑی زیادتی ہے، ایک شرط کے بالکل نقداً ایفاء کا ذکر تو طبری کی مذکورہ بالا روایت میں آ گیا ہے، دوسری شرط داراب گرد کا خراج، اس کے بارے میں طبری کے اندر کوئی مزید روایت نہیں ملتی۔ لیکن دوسرے ذرائع مثلاً ابن اثیر کی تاریخ کامل اور ابن کثیر کی البدایہ والنہایہ سے معلوم ہوتا ہے کہ داراب گرد کا تعلق بصرہ کی ولایت سے تھا اس کے خراج والی شرط پر بصرہ کے لوگ معترض ہوئے کہ یہ خراج تو ہمارا حق ہے یہ کسی اور کو نہیں دیا جانا چاہیے۔ ابن اثیر نے بس اتنی ہی بات بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ لیکن ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے اس کے بدلے میں ان کو سالانہ ہر چھ ہزار کے بدلے میں ایک ہزار دینار منظور کیے جو حضرت حسنؓ اپنے حسین جیات دمشق کے سالانہ سفر میں علاوہ دیگر عطیات و تحائف کے وصول فرماتے رہے۔

لہ فوضہ معاویہ عن کل سنت آلات الف درہم فی کل عام فلم یزل یتناول مع مالہ
فی کل زیادۃ من الجواز و التحف الی ان توفی۔ البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۲۵۔

رہی تیسری شرط کہ (کم از کم) حضرت حسنؑ کی موجودگی میں حضرت علیؑ پر سب تو تم نہ کیا جائے اس کے بارے میں ابن اثیر کا بیان ہے کہ یہ شرط پوری نہیں کی گئی۔ اور نہ یہ ایک بیان یہ تاثر دینے کے لیے کافی ہے کہ ابن اثیر بھی انہی مؤرخین میں سے ہیں جن پر حضرت علیؑ حسن حسین (رضی اللہ عنہم) اور حضرت معاویہؓ و یزید کے درمیان والے معاملات میں آنکھ بند کر کے اعتماد نہیں کیا جانا چاہیے۔ کیونکہ یہ بیان اگر صداقت پر محمول کر لیا جائے تو ہمیں یہ ماننے کے لیے تیار ہونا پڑے گا کہ (معاذ اللہ) حضرت حسنؑ کو غیرت اور عزت نفس کی کوئی ادنیٰ مقدار بھی دربار حق تعالیٰ سے عطا نہیں ہوئی تھی، ان کے والد ماجد کو حضرت معاویہؓ اور ان کے لوگ منہ پر بڑا بھلا کہتے تھے اور حضرت حسنؑ اس کے باوجود کبھی ایک حرف شکایت بھی منہ پر لائے بغیر ہر سال دمشق جا کر مقررہ وظائف و تحائف انہی حضرت معاویہؓ کے ہاتھ سے وصول کیا کرتے تھے ایسے ممکن ہے کہ اتنی نامناسب بات جو شرائط صلح کے بھی خلاف تھی، حضرت معاویہؓ اور ان کے حکام کے طرز عمل میں شامل رہے اور حضرت حسنؑ ۹-۱۰ سال تک اسے خاموشی سے برداشت ہی نہ کرتے رہیں بلکہ حضرت معاویہؓ کی خدمت میں سالانہ حاضر ہی بھی دیتے رہیں اور ان سے تحائف و وظائف لینا گوارا کرتے رہیں۔؟

ابن اثیر ہی نے داراب گرد کے خراج کے سلسلے میں اہل بصرہ کے اعتراض کی بابت یہ بھی لکھ دیا ہے کہ اس میں خود حضرت معاویہؓ کا اشارہ بھی شامل تھا مگر اس کا کوئی ثبوت؟ نہ ثبوت ہے نہ حوالہ۔ حالانکہ اگر اس بیان میں کچھ واقعیت ہوتی تو نہ تو یہ ممکن تھا کہ حضرت حسنؑ کو مصالحت کے وقت سے لیبر اپنی وفات تک (۹-۱۰ سال کے عرصے میں) اس کا پتہ نہ چلتا، جبکہ بصرہ بھی کوفے کی طرح آپ کی اور آپ کے والد ماجد کی عملداری کا حصہ رہا تھا، اور نہ ہی یہ بات قابل تصور ہے کہ سب کچھ جانتے بوجھتے آپ چھ ہزار سالانہ کی جگہ ایک ہزار سالانہ پر خاموشی سے راضی رہتے۔ اور حضرت حسنؑ کے بارے میں اگر کسی

۱۔ ج ۳، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۹۸۷ء۔ ۲۔ صلح ۱۳۷ھ میں ہوئی اور حضرت حسنؑ کی وفات ۲۵ھ میں۔

طرح ان کی نرم طبیعت وغیرہ کے حوالے سے شرائطِ صلح کی یہ سب مبتذہ کھلی اور چھپی خلافتِ دوزیاں قابلِ تحمل بھی مان لی جائیں تو حضرت حسینؑ کے بارے میں تو یہ تصور قطعی طور پر ناقابلِ قبول ہے۔ اُن کا مزاج بالکل مختلف تھا وہ سرے سے صلح کے ہی روادار نہ تھے۔ بس حضرت حسینؑ کے فیصلے سے مجبور ہو گئے تھے، ابنِ کثیر نے لکھا ہے کہ:-

’جب خلافتِ حضرت حسنؑ کے ہاتھ میں آئی اور انھوں نے مصالحت کا فیصلہ کیا تو حضرت حسینؑ کو یہ فیصلہ بہت شاق گذرا۔ وہ اپنے بھائی کی رائے کو بالکل صحیح نہیں سمجھتے تھے اور دُھر تھے کہ اہلِ شام سے قتال جاری رہے (ان کا اصرار اور صلح کی مخالفت یہاں تک تھی کہ حضرت حسنؑ کو کہنا پڑا کہ میں سوچتا ہوں کہ تمہیں گھر میں بند کر دوں اور جب تک مصالحت کی کاروائی سے پوری طرح فارغ نہ ہو جاؤں باہر نہ نکالوں۔‘

ایک روایت میں اس اختلافِ رائے کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت حسینؑ نے صلح کی بات سن کر حضرت حسنؑ سے کہا کہ ”میں آپ کو قسم دیتا ہوں کہ اپنے باپ کو جھوٹا اور معاویہ کو سچا مت ٹھہرائیے اس پر حضرت حسنؑ نے یہ کہہ کر ان کو خاموش کیا کہ میں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔“

الغرض حضرت حسینؑ کا مزاج بالکل مختلف تھا، ان کے لیے کسی بھی طرح نہیں سوچا جاسکتا کہ وہ ایسے حالات اور معاملات کے ہوتے ہوئے حضرت معاویہؓ کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنا گوارا کر سکتے تھے، حالانکہ اسی البدایہ والنہایہ میں مذکورہ بالا بیان کے بعد مذکور ہے کہ:-

”حسن کا یہ رویہ دیکھ کر حسینؑ نے خاموشی اور موافقت اختیار کر لی اور پھر جب خلافت کی باگ ڈور پوری طرح معاویہ کے ہاتھ میں آگئی تو اپنے بھائی حسنؑ کے ساتھ حسینؑ

۱۔ البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۶۳ ۲۔ ابنِ اثیر ج ۳ ص ۲۰۲۔

بھی معاویہ کے پاس آتے جاتے تھے اور معاویہ دونوں کا غیر معمولی اکرام فرماتے تھے
 مرحبا و اہلاً سے استقبال فرماتے اور بڑے بڑے عطیات دیتے۔^۱
 حتیٰ کہ حضرت حسن کا انتقال (۳۵ھ میں) ہو گیا تب بھی حضرت حسین نے حضرت
 معاویہ کے پاس سالانہ تشریف بڑی کا معمول تنہا ہی قائم رکھا۔^۲
 الغرض حضرت معاویہ اور حضرت حسنین کے درمیان جو حسن تعلق کی صورت اور
 بالخصوص حضرت معاویہ کی طرف سے اکرام و عطا کی جو روش ان کی خلافت کے پورے عرصے
 میں برقرار رہی، وہ نہ صرف اس الزام کی قطعی تردید کرتی ہے کہ حضرت معاویہ نے شرائط
 صلح کا احترام نہیں کیا تھا بلکہ ان بیانات کے لیے ایک تصدیق بھی فراہم کرتی ہے جو
 حضرت معاویہ کے حلم و عفو اور داد و دہش کے غیر معمولی اوصاف کے سلسلے میں مؤرخین
 کے یہاں ملتے ہیں۔^۳



۱۔ البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۶۳۔ ۲۔ ولما توفی الحسن کان الحسین یفقد الی معاویۃ فی کل عام
 فی عطیۃ دیکر مہ عوال سابق۔ ۳۔ مثلاً حضرت علیؑ کے دست راست حضرت عبداللہ بن عباسؓ
 کا قول ہے جو طبری نے نقل کیا ہے کہ "میں نے حکومت کے لیے معاویہ سے بڑھ کر موزوں آدمی نہیں دیکھا کہ لوگوں
 کے ساتھ بیکد کشادہ دلی کا بناؤ کرتے تھے" (ج ۶ ص ۱۸۸) یا خود حضرت معاویہ کا قول اپنے بارے میں جو علم و عفو کی
 ایک آزمائش کے موقع پر انکی زبان پر آیا کہ "مجھے گوارا نہیں کہ کوئی خطا میرے عفو سے بڑھ جائے اور کوئی جہالت میرے حلم سے
 یا کسی کی کوئی گزروی ایسی بھی ہو جائے جس کی میں پردہ داری نہ کر سکوں اور کسی کی بدسلوکی ایسی جس کا جواب میں
 حسن سلوک سے نہ سکوں۔" (الیضاً ص ۱۸۵) ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۶۳ میں پورے ایک صفحے (۱۶۳) پر
 حضرت معاویہ کے انہی اوصاف میں متعدد بیانات اور واقعات نقل کیے ہیں اور اپنے طور پر ان الفاظ
 میں ان کی ثنا بیان کی ہے کہ... "یعنی انہ کان جید السیرۃ حسن التجا وز جمیل العفو کثیر
 السور سرحمہ اللہ" محقر یہ کہ وہ عمدہ سیرت کے مالک، نہایت اعلیٰ عفو و درگزر کرنے والے اور عیوب
 کی بہت ہی پردہ داری کرنے والے تھے۔ (ج ۸ ص ۱۶۴)

باب دوم

کوفی مزاج — ریشہ دواپیاں — اور حضرت حسینؑ

حضرت معاویہؓ کے ہارے میں یہ تھوڑی سی گفتگو بالکل ضمناً آگئی ورنہ اصل مدعا تو ان حالات اور اسباب کی تحقیق تھی جن کے نتیجے میں حضرت معاویہؓ کا بیس سالہ پُرامن و پرسکون دور ختم ہوتے ہی واقعہ کربلا جیسا سانحہ وجود میں آگیا۔ اسی تحقیق کے سلسلے میں اہل کوفہ کے مزاج و کردار کی خصوصیات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔

اہل کوفہ

کوفہ کی بنیاد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے ہاتھوں سے پڑی تھی جو کسری (فارسی) حکومت کے خلاف اسلامی جہاد کے کمانڈر تھے۔ وہ مختلف عرب قبائل جو عراق کے محاذ پر مصروف جہاد تھے انہی کے خاندانوں سے یہ نیا شہر آباد کیا گیا۔ اور اس طرح یہ مسلمانوں کی سب سے بڑی چھاؤنی اور ان کی جنگی طاقت کا مرکز بن گیا۔ لیکن اس خصوصیت کے ساتھ اس شہر کی یہ خصوصیت بھی رہی کہ ۳۱ کے شہر لوہوں میں بڑی تلون مزاجی اور بے سہرے پن کی سی کیفیت پائی جا رہی تھی۔ اپنے حکام سے بیحد جلدی ناراض ہو جاتے اور مرکز سے شکایتیں کر کے

نئے حاکم کا مطالبہ کرنے لگتے تھے۔ یہ حال حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے پورے زمانے میں رہا۔ بلکہ عثمانی خلافت کے آخری دنوں میں تو ان کا مرض بڑھ کر اس کھلی سرکشی اور شوریدہ سری تک پہنچا کہ حضرت عثمانؓ کی خلافت ہی نہیں ان کی جان بھی اسی کی بھینٹ چڑھ گئی۔ اور اپنے ہی جیسے مہرئی اور بھرتی مفسدوں کے ساتھ مل کر ان لوگوں نے مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم میں خوف و دہشت کی وہ فضا قائم کی کہ خلیفۃ الرسول کی تدفین بھی بمشکل تین دن بعد رات کے اندھیرے میں مسلمانوں کے عام قبرستان جنت البقیع سے الگ ایک احاطے میں کی جاسکی۔ جسے عہد اموی میں جنت البقیع سے ملا یا گیا۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت سے دو سال پہلے کے واقعات میں تاریخ کچھ کوفیوں کا نام لے کر بتاتی ہے کہ انہوں نے حکام کے خلاف شکایتوں کے اظہار سے بڑھ کر خود ادارہ خلافت کو قریشی سلطنت کا نام دینا شروع کر دیا۔ امیر کوفہ سعید بن العاص نے اس فتنہ پر دازی کے خلاف کارروائی کی اجازت یا جو کچھ اور مناسب سمجھا جائے اس کی ہدایت مانگی۔ حضرت عثمانؓ نے مناسب سمجھا کہ ان کو شہر بدر کر کے حضرت معاویہؓ کے پاس دمشق بھیجا جائے کہ وہ شاید ان کا کچھ علاج کر سکیں گے۔ مگر ان کے مرض کے مقابلہ میں حضرت معاویہؓ کی حکمت اور بہارت بھی کام نہ دے سکی۔ تب یہ لوگ محص میں جہاں عبدالرحمن بن خالد بن ولید امیر تھے، بھیجے گئے اور ان کے طریقہ علاج (سختی) سے بظاہر یہ لوگ ٹھیک اور تائب ہو گئے مگر واقعے میں ایسا نہیں تھا۔ چنانچہ جیسے ہی کوفے میں کچھ اور لوگ ان کی والی صدارت بلند کرنے کو کھڑے ہوئے تو یہ فوراً ہی نمودار ہو گئے اور پھر جب مصر اور بصرے میں انہی کی طرح سے مرکزی حکومت کے خلاف شکایتیں پالنے والے لوگ بھی ابن سبا کی سازشی تحریک کے ذریعہ ایک رابطے میں مربوط ہو گئے تب یہ سب ۳۵ھ میں حج کے سفر کا ڈھونگ رچا کر مدینے

پر جا چڑھے اور ۱۸ روزی الحجہ کو حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا۔ دو ڈھائی ہزار کے قریب ان سب کی تعداد بتائی گئی ہے۔ یہ سب جھوٹ یا سچ حضرت علیؓ کا دم بھرتے تھے۔ چنانچہ بعد میں حضرت علیؓ کی بیعت بھی کی اور پھر جنگِ جمل اور جنگِ صفین میں آپ کے ساتھ نکلے اور جب جنگِ جمل سے پہلے فریقین کی نیک نیتی کی بنا پر صلح کی شکل پیدا ہو گئی تو سبائوں نے اس صلح کو تباہ کرنے کی وہ کوشش کی جس کا ذکر گذشتہ باب میں آچکا ہے، تاریخ کے بیان کے مطابق اس میں شبِ خون مارنے کا اصل کردار کوفیوں ہی نے ادا کیا۔ ملاحظہ ہو ابن اثیرؒ اور پھر انہی کی بدولت صفین میں حضرت علیؓ جنگِ بند کرنے پر مجبور ہوئے اور بعد میں آپ کا ہر دن ایسا گذرا کہ کہا جاسکتا ہے، آپ نے باقی وقت ان کے ساتھ رو رو کر پورا کیا۔ آپ کے اس دور کے خطبوں میں بار بار ایسے جملے ملتے ہیں کہ ”سب بڑا دھوکہ کھانے والا وہ ہے جو تمہارے دھوکے میں آیا۔“^۱ ایک خطبہ میں ہے:-

ایہا الفرقتہ التي اذا امرت	اے وہ گروہ کہ جب بھی میں نے کسی بات
لمرتع واذا دعوت لموتجب	کا حکم دیا اس نے نافرمانی کی، اور جب
ان امہلتو خضتم وان خورتم	کسی کا کسی طرف بلا یا بلیک نہ کہی ذرا
خوتم وان اجتمع الناس علی	بہلت مل جاتی ہے تو فضولیت میں لگ
امام طعنتم.....	جاتے ہو اور جب دشمن حملہ آور ہو تو
لا بالنعیر کم۔ ^۲	بردلی دکھاتے ہو اور جب لوگ کسی
	امام پر جمع ہو جائیں تو تم کیڑے نکالتے
	ہو۔۔ ہائے السوس تم پر۔

۱۔ مزید تفصیل کیلئے دیکھیے تاریخ ابن اثیرؒ اور تاریخ طبری۔^۲ بیخ البلاغۃ ج ۱ ص ۱۷۷ دارالمنیرۃ ص ۲ ایضاً ج ۲ ص ۱۷۷ بیخ البلاغۃ ایسے ارشادات سے بھری پڑی ہے اگر کوئی چاہے تو جلد اول ہی کا مطالعہ کافی ہوگا۔

یہی لوگ تھے کہ حضرت علیؑ کی زندگی میں جنگ سے جی چراتے اور آپ کے احکام سے سرتابی کرتے رہے اور جب حضرت حسنؑ نے مصالحت کی تو ان کے خیمے پر حملہ کر دیا۔ سامان بھی لوٹا اور زخم بھی لگایا۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کا حضرت معاویہؓ کے ساتھ کیسے گزارا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ حضرت معاویہؓ کے علم نے اگر کہیں جواب دیا تو یہ کوفہ والوں ہی کے ساتھ ہوا۔

القرض اس امن وامان اور اسلامی جمعیت کی بحالی کے دور میں اگر کہیں سے کچھ خلفشار پیدا کرنے کی خواہش اور جستجو ہوتی رہی تو وہ کوفہ ہی کی سرزمین سے تھی۔ حضرت حسینؑ کے متعلق ان لوگوں کو معلوم تھا کہ مصالحت سے وہ خوش نہ تھے۔ بس حضرت حسنؑ کے دباؤ سے مجبور ہو گئے تھے جیسا کہ اس سلسلے میں اوپر تاریخی بیان گزر چکا ہے۔ حضرت حسنؑ کی وفات کے بعد ان لوگوں نے سمجھا کہ اب حضرت حسینؑ کو آمادہ جنگ کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ چنانچہ البدایہ والہما یہ کی روایت کے مطابق:-

قدم المسیب بن عتبہ	مُسیَّب بن عُقبۃ فزاری حضرت حسنؑ
الفزاری فی عداۃ معہ	کی وفات کے بعد مع کئی اور آدمیوں
الحسین بعد وفات الحسن	کے حضرت حسینؑ کے پاس آیا اور ان
ندعوه الی خلع معاویۃ۔ ^۱	لوگوں نے آپ کو حضرت معاویہ کی بیعت
	توڑنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔

پھر یزید کے لیے ولی عہدی کی بیعت کا قصہ کھڑا ہوا تب ان لوگوں نے از سر نو یہی کوشش کی۔

لتابایع الناس معاویۃ	جب لوگوں نے عام طور پر یزید کیلئے
لیزید کان حسین یمن لم	معاویہ سے بیعت کر لی تو حضرت حسینؑ

۱۔ طبری ج ۶ ص ۹۳ ابن اثیر ج ۳ ص ۲۰۳ ۲۔ ج ۸ ص ۱۴۵۔

یبایع لہ۔ دکان اہل الکوفۃ
 یکتبون الیہ یدعونہ الی
 الخروج الیہم فی خلافتہ
 معاویۃ۔ لہ
 آگے ابن کثیر لکھتے ہیں:-

کل ذالک یأبئ علیہم
 حسینؑ نے ہر بار ہی ان کی اس بات
 کو قبول کرنے سے انکار کیا۔

حضرت حسینؑ کی رائے

لیکن حضرت حسینؑ کے اس انکار سے یہ سمجھ لینے کی گنجائش نہیں ہے کہ آپ کی
 اس رائے میں تبدیلی آگئی تھی جس رائے کی بنا پر آپ نے اپنے برادر بزرگ حضرت حسن
 کی مصاحبت پسندی سے اختلاف فرمایا تھا۔ بلکہ دوسرے تاریخی بیانات کی روشنی میں
 نظر آتا ہے کہ آپ کی رائے میں تو کوئی فرق نہیں آیا تھا البتہ جو بیعت آپ حضرت حسن
 کے ساتھ حضرت معاویہ سے کر چکے تھے یا تو اس کا احترام آپ کو کسی ایسے اقدام سے
 مانع تھا جس کی طرف اہل کوفہ بلا تے تھے یا آپ کی رائے میں اب وہ قابل احترام
 تو نہیں رہی تھی مگر مصلحت نہیں معلوم ہوتی تھی کہ ایسا اقدام کیا جائے۔ تاریخ کے
 بیانات سے دونوں ہی امکانات سامنے آتے ہیں۔ البدایہ والنہایہ میں ہے کہ جب
 کوفیوں نے حضرت حسینؑ کے پاس فتنہ انگیز آمدورفت شروع کی تو مدینے کے گورنر
 مروان نے حضرت معاویہ کو اس کی اطلاع دیتے ہوئے خطرات کی پیش بندی کی
 طرف توجہ دلائی اس پر حضرت معاویہ نے حضرت حسینؑ کو لکھا کہ:

ان من اعطی اللہ صفۃ
 جس شخص نے اللہ کو قول و قرار دیا ہو

لہ البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص ۱۷۵ لہ الیہ

بمیں، وعہدہ الجدیہ بالوقاء
وقد أنبتت ان قومًا من اهل
الکوفۃ قد دعوا الی الشقاق
واهل العراق من قد جرّبت
قد افسدوا علی ابيک و اخیک
فانق الله واذکر الميثاق
فانک متی تکدنن اکدنک لہ

(یعنی بیعت کی ہو، اسکولائٹ ہے کہ
وقائے عہدہ کرے مجھے اطلاع دی گئی ہے
کہ کوفہ کے کچھ لوگوں نے تمہیں فتنہ آرائی کی
دعوت دی ہے حالانکہ یہ اہل عراق وہ ہیں
جسکا تو تم خوب جانتے ہو کہ انھوں نے تمہارے
باپ بھائی کو کس فساد میں ڈالا پس اللہ
سے ڈرو عہدہ یاد رکھو اور یہ کہ اگر تم نے میرے
خلاف کوئی قدم اٹھایا تو میں بھی اٹھاؤنگا۔

اس خط پر حضرت حسین کا جواب یہ نقل کیا گیا ہے

اتانی کتابک وانا بغیر الذی بلغک
عنی جدیڈ والحسنات لا
یهدی لها الا الله وما اردت
لک محاربة ولا علیک خلافا
وما ظن لی عند الله عنرا
فی ترک جھادک وما علم فتنۃ
اعظم من دلائتک امرھذا
الامۃ۔ ۲

تمہارا خط ملا۔ معلوم ہونا چاہیے کہ میرا
حال اس سے مختلف ہے جو تمہیں میرے
متعلق معلوم ہوا ہے۔ اور یہ بس اللہ کا
فضل ہے جسکے سوا نیکیوں کی ہدایت
دینے والا اور کوئی نہیں، میں تمہارے خلاف
کسی محاذ آرائی اور مخالفت کا ارادہ نہیں
رکھتا ہوں۔ اگرچہ میں نہیں جانتا کہ تمہارے
خلاف جہاد نہ کرنے کیلئے میرے پاس اللہ
کے سامنے کیا عذر ہوگا اور میں نہیں جانتا
کہ اس سے بڑھ کر اور فتنہ کیا ہو سکتا ہے کہ
تمہارے ہاتھ میں اس امت کی سربراہی ہو۔

لہ ج ۸ ص ۱۴۵ ۲ ایضاً۔

اس جواب کے سخت لہجے کے باوجود یہی اندازہ ہوتا ہے۔ خاص کر پہلے فقرے کی روشنی میں۔ کہ حضرت حسین کے لیے اصلاً یہی بیعت مانع تھی۔ اور اس کو توڑ دینے کا خیال آپ نے اپنے آپ سے بعید اور اپنے لیے نازیبا قرار دیا تھا۔ لیکن کوئی شخص آخری فقرہ کا سہارا لیکر کہنا چاہے تو کہہ سکتا۔ ہے کہ بیعت کا خیال مانع نہیں تھا بلکہ بات مصلحت وقت کی تھی جو مانع ہو رہی تھی۔ یعنی حضرت معاویہ کے اقتدار کے استحکام کو دیکھتے ہوئے کسی مخالفت اقدام کی کامیابی کا امکان نظر نہیں آتا تھا۔ اور شیعیہ حضرات یہی کہتے ہیں، کیونکہ وہ دوسرے سے بیعت ہی کا انکار کرنا چاہتے ہیں۔ حیاة الامام حسین، جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے، کے شیعیہ مصنف باقر شریف القرشی لکھتے ہیں کہ:-

ولم یکن من سرائی الامام الخوارج امام حسین کی رائے میں معاویہ کے خلاف
علی معاویۃ، وذاک لعلمہ، یقتل خروج مناسب نہیں تھا کیونکہ وہ جانتے
الثورة وعدم مجاحها تھے کہ کامیابی نہیں ہوگی۔

اس کے بعد الاخبار الطوال ص ۲ اور انساب الاشراف (رج ۱) کے حوالے سے آپ کا یہ خط بھی نقل کیا ہے جو اہل کونہ کی طرف سے خروج کی دعوت کے جواب میں لکھا گیا تھا:-

..... داما انانفلیس رأی اور جہاں تک میرا تعلق ہے تو فی الحال
اليوم ذالک، تلصقوا برحکم میری رائے اس کی (خروج کی) نہیں
الله بالامراض داکمنوائف ہے۔ پس تم لوگ جب تک کہ معاویہ
البيوت واحترسوا من زندہ ہیں زمین سے چپکے رہو، گھروں
الظننت ما دام معاویۃ حیثا میں قرار پکڑو اور کسی طرح کے شک
فان یحدث الله به حدثاً شبہ کا ماحول مت پیدا کرو۔ ہاں

لہ حیاة الامام حسین ج ۲ ص ۲۳۰ -

وانا حی کتبت الیکم
برائی۔ لہ
اگر معاویہ کو کچھ ہو گیا اور میں اس
وقت زندہ ہوا تو میں تمہیں اپنی
رائے سے آگاہ کروں گا۔

اس خط کا انداز بظاہر ان لوگوں کی تائید میں جا رہا ہے جو سمجھتے ہیں کہ حضرت
حسینؓ کا عدم خروج بر بنائے حالات و اجتناب تھا نہ کہ اُس بیعت کے احترام
میں جو آپ نے حضرت حسنؓ کے ساتھ حضرت معاویہ کے ہاتھ پر کی تھی۔
بہر حال جو بھی واقعہ ہو، اس بات میں شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ حضرت
حسینؓ کا یہ رویہ بس حضرت معاویہؓ کی زندگی تک کے لیے تھا۔ حضرت معاویہؓ نے
اپنے بعد کے لیے جب بطور ولی عہد اپنے بیٹے یزید کا تقرر کیا اور چاہا کہ لوگ اُسے
قبول کر لیں تو حضرت حسینؓ کا اس کو قبول کرنے اور یزید کے لیے بطور ولی عہدیت
کرنے سے انکار اسی بات کی ایک علامت تھی کہ وہ اپنے آپ کو آئندہ کسی اقدام
کے لیے آزاد رکھنا چاہتے تھے اور اس میں کچھ نہ کچھ دخل کو فیول کا بلاشبہ تھا جیسا کہ
مذکورہ بالا تاریخی بیانات سے ظاہر ہوتا ہے۔



باب سوم

یزید کی ولی عہدی کی تجویز اور حضرت مغيرة بن شعبه

مؤرخین (طبری، ابن اثیر، ابن کثیر وغیرہ) کے بیان کے مطابق ۵۶ھ میں (یعنی اپنے انتقال سے ۴ سال پہلے) حضرت معاویہ نے طے کیا کہ اپنے بعد زمام خلافت سنبھالنے کے لیے یزید کو نامزد کر جائیں اور اس نامزدگی کے لیے رعایا سے رضامندی بھی حاصل کر لیں جس کی شکل اس زمانے میں بیعت تھی۔ تاکہ بعد میں کوئی جھگڑے قضیے کی صورت نہ پیدا ہو۔ حضرت معاویہ کی اس کوشش کی بابت آتا ہے کہ:-

وفیہا = دعا معاویۃ الناس الی	اور اسکی (۵۶ھ) میں معاویہ نے تحریک کی
البیعت لیزید ولدہ ان یکون	کہ لوگ انکے کھیلنے انکے بیٹے یزید کی ولی عہدی
ولی عہدہ من بعدہ.....	کے لیے بیعت کریں..... پس تمام اقلیموں
نیایع لہ الناس فی سائر الاقالیم	میں لوگوں نے اس کھیلے بیعت کر لی۔ سو اس
الاعبد الرحمن بن ابی بکر	عبدالرحمن بن ابی بکر کے اور سو عبداللہ بن عمر
وعبد اللہ بن عمرو الحسین	حسین بن علی، عبداللہ بن زبیر اور
بن علی وعبد اللہ بن زبیر وابن عباسؓ	عبداللہ بن عباس کے۔

لہ البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص ۵۶ -

جہاں تک یزید کی ولی عہدی کے لیے نامزدگی کا تعلق ہے وہ ایک یقینی واقعہ ہے
اسی طرح حضرت حسین کا اس کو قبول کرنے سے انکار بھی ایک قطعی واقعہ ہے۔ مگر ان دونوں
باتوں کی جو تفصیلات ہماری تاریخی کتابوں میں آتی ہیں ان میں ایک بڑا حصہ ناقابل یقین
ہے۔ یہ تفصیلات چونکہ خوب شہرت پا چکی ہیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ اس موقع پر تھوڑی
سی گفتگو ان تفصیلات پر ہو جائے۔ اس باب میں ہم پہلے واقعے کی تفصیلات پر گفتگو کریں گے۔

ولی عہدی کی تجویز

یزید کو ولی عہد بنا کر جانے کی تجویز کے سلسلے میں روایت بیان کی جاتی ہے
کہ یہ تجویز صحابی رسول حضرت مغیرہ بن شعبہ نے پیش کی تھی اور اس کا پس منظر خالص
ایک خود غرضانہ اور نفس پرستانہ پس منظر تھا۔ ایسی خود غرضی اور نفس پرستی کہ اس میں
اسلام اور ملت اسلام کی بدخواہی بھی انھیں بخوشی منظور ہوئی۔^{۱۵} (العیاذ باللہ)

حضرت مغیرہ کا مقام صحابیت

یہ مغیرہ بن شعبہ کون ہیں؟ ان اصحاب کرام میں سے ہیں جنہیں ۶ھ میں صلح
حدیبیہ کے موقع پر بیعت رضوان میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یہ نبی
صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اصحاب نبی کی وہ بیعت ہے جس کے بارے میں قرآن پاک نے
بشارت دی کہ

لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ
بَيَّأُوا بِعُورَةَ نَكْتِ الشَّجَرَةِ (الفتح آیت ۱۸)

بیشک الرضی عنی ہوا ان مسلمانوں کے لئے نبیؐ
وہ دخت کے نیچے تمھارے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے

۱۵ روایت کی تفصیل آگے آتی ہے۔ ۱۶ یعنی وہ بیعت جس پر روئے الہی کی بشارت نازل ہوئی ۱۷ الاصابہ
لابن حجر ج ۶ ص ۱۳، سیر اعلام النبلاء از حافظ ذہبی ج ۳ ص ۱۲ (بیروت) البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۵۸-۳۸

اور پھر اس صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت مغیرہ صرف شہادت ہی میں نہ تھے بلکہ ان کا ایک اور خاص قابل ذکر کردار بھی اس موقع پر تھا جو ان کے ایمانی مرتبے کا اظہار کرتا ہے، وہ کردار یہ ہے کہ اس صلح کے موقع پر قریش مکہ کی طرف سے جو صاحبِ سفیر ہو کر گئے تھے، ان کے لیے آئے تھے وہ حضرت مغیرہ بن شعبہ کے چچا عروہ بن مسعود نقضی تھے۔ عروہ بن مسعود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو شروع کی تو ان کا ہاتھ بڑھ بڑھ کر بار بار آنحضرت کی ریش مبارک تک پہنچاتا تھا۔ مغیرہ بن شعبہ تلوار لیے اور آہنی خود پہنے، جس میں چیرہ بھی چھپا ہوا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کھڑے ہوئے تھے۔ اپنے چچا کے اس طرز گفتگو پر بڑک کر بولے کہ "اپنا ہاتھ روک لو قبل اس کے کہ اس سے ہاتھ دھو بیٹھو" عروہ بن مسعود جو طائف اور مکہ کی نہایت مؤثر شخصیت تھے اس جملے پر سناٹے میں آ گئے۔ آنحضرت سے مخاطب ہو کر بولے کہ محمد! یہ کون شخص ہے؟ کس قدر بے نیکی زبان میں بات کرتا ہے! آنحضرت نے فرمایا "آپ ہی کا بھتیجا ہے۔" — اور یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ کوئی ایسے چچا بھتیجے تھے جن کے آپس کے تعلقات اچھے نہ رہے ہوں گے۔ نہیں ان کے آپس کے تعلقات نہایت اچھے تھے جس کی شہادت عروہ کا اگلا جملہ دیتا ہے۔ عروہ آنحضرت کا جواب سن کر حضرت مغیرہ کی طرف متوجہ ہوئے اور بولے "اچھا یہ تم ہو، دھوکہ باز! جس کے کئے کو کل ہی میں نے بھرا ہے" — یہ اشارہ تھا اس واقعے کی طرف کہ حضرت مغیرہ جو ابھی کچھ دن پہلے اسلام لائے تھے، اس سے متصلاً پہلے انھوں نے ایک سفر میں اپنے ساتھیوں کی کسی بات پر خفا ہو کر ان سب کو تیغ کر دیا تھا۔ عروہ بن مسعود نے ان سب کی دیت اپنے پاس سے ادا کر کے معاملے کو ختم کیا تھا۔

حضرت مغیرہ کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ جب ان کے شہر طائف والے درسنہ میں پہلے ہوئے تو ان کے مخصوص بُت "لات" کا بُت خانہ توڑنے کیلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

لے سیر اعلام النبلاء ج ۳ ص ۲۵۰ - ۲۵۱ ایضاً -

نے جن دو اشخاص کو بھیجا تھا ان میں سے ایک یہی میسر بن شعبہ تھے۔ (دوسرے ابوسفیان بن حرب تھے)

۹۔ جن میں ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری غزوہ، غزوہ تبوک ہوا ہے یہ غزوہ اپنی چند در چند سختیوں اور دشواریوں کی وجہ سے "غزوہ عسرت" بھی کہلایا ہے۔ اور اسی حوالے سے اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس کے شرکاء پر اپنی عنایت خاص کا اعلان بھی قرآن پاک کی سورہ ۹ (التوبہ) میں بایں الفاظ فرمایا ہے۔

لَقَدْ تَابَ اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ
وَالْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ
الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ
الْعُسْرِ وَمَنْ بَعْدَ مَا كَادَ يَزِيغُ
قُلُوبَ قَوْمٍ مِنْهُمْ لَمَّا تَابَ
عَلَيْهِمْ إِنَّتَبَهُمُ زُرُوفُ
لَحِيئِهِمْ ۗ رَأَيْتُمْ ۙ

اور اللہ نے رحمت کی نظر فرمائی نبی پر
اور ہاجرین و انصار پر کہ جنہوں نے تنگی
کے وقت میں نبی کا ساتھ دیا تھا جبکہ
ان میں سے بعض کے دل کج ہوئے جا رہے
تھے پھر اللہ نے ان پر بھی نظر رحمت
فرمائی بے شک وہ ان کے لیے رؤف
اور رحیم ہے۔

حضرت میسرہ کو اس غزوہ میں شرکت کا بھی شرف حاصل تھا اور وہ ہاجرین کے زمرے میں تھے۔ حضرت میسرہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ستائش سے اوپر احادیث مروی ہیں۔ اسی غزوہ تبوک کے موقع کی بھی ایک روایت چمڑے کے موزوں پر مسخ کرنے ان سے بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور مؤطا امام مالک وغیرہ میں مروی ہوئی ہے، کہیں غزوہ تبوک کے ذکر کے ساتھ اور کہیں بغیر اس کے ذکر کے۔

حضرت میسرہ خلفائے راشدین کے دور میں

دو زبوی کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور میں بھی وہ ایک معتمد شخصیت اور
۱۳۲۶ھ سے دیکھئے سیر اعلام النبلاء ج ۳ ص ۲۲ مع حاشیہ۔

ہمات میں نمایاں رہے۔ شجاعت میں بھی مرد تھے اور تدبیر و حکمت اور فطانت و ذہانت میں بھی فرد، حافظ ذہبی لکھتے ہیں :-

من كبار الصحابة اولي الشجاعة والمكيدة شهيد
ببيعة الرضوان۔ ۱۰
بڑے درجے کے صحابہ میں سے تھے صاحب شجاعت بھی اور صاحب حکمت و تدبیر بھی۔

غیر معمولی ذہانت اور اصابت رائے کی بنا پر "مغيرة الرأي" کہلاتے اور اولین عرب میں شمار ہوتے تھے ۱۰ حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں بھی وہ متمدن رہے۔ بحرین کے گورنر بنائے گئے، بصرے کی گورنری پر رہے اور پھر کوفے کی ۱۱۔ بصرے کی گورنری کے زمانے میں ان پر ایک سنگین اخلاقی الزام لگا۔ حضرت عمرؓ نے معزول کر کے شہادت طلب کی۔ شہادت ناکام ہوئی تو روایت میں ہے کہ :-

فكبر عمر۔
حضرت عمرؓ نے (خوشی سے) تکبر کیا۔ ۱۲

اور اس کے بعد جب پھر ایک موقع آیا کہ کوفے کی گورنری کے سلسلے میں حضرت عمرؓ سخت پریشان تھے، جس آدمی کو بھی وہاں بھیجتے وہ ناکام ہوتا۔ اس لیے کہ جیسا کہ اوپر گزرا وہ سخت بے سہارے لوگ تھے۔ ادھر کوئی حاکم پہنچا اور ادھر انہوں نے اس کے خلاف شکایتوں کا سلسلہ شروع کیا تو اس موقع پر آپ نے گہرے غور و فکر اور مشاورت کے بعد حضرت مغیرہ بن شعبہ ہی کا انتخاب کیا۔

۱۳ حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں لکھا ہے کہ پیام کے سر کے میں شامل تھے یعنی وہ شدید جنگ جو میلہ کذاب کے خلاف لڑی گئی ۱۳۱، اس کے بعد سواد عراق میں حیر کا شہرہ مقام اسلامی حکومت کے دائرہ میں آیا تو وہاں حضرت ابو بکرؓ کی طرف بکار سرکار بھیجے گئے ۱۳۲۔ ۱۴ سیر اعلام النبلاء ج ۳ ص ۲۱۰۔ ۱۵ اصحابہ ج ۳ ص ۱۳۱۔ ۱۶ اعلام ج ۲ ص ۲۲۔ ۱۷ اصحابہ ۱۳۲-۱۳۱۔ ۱۸ اعلام ج ۳ ص ۲۸۔

فاروقی انتظامیہ کا ایک اہم اصول اور حضرت مغیرہ

اس مشاورت اور انتخاب اور اس کے پس منظر کی تفصیل بجائے خود بڑی بصیرت افزا ہے اور فاروقی بلکہ اسلامی انتظامیہ (ADMINISTRATION) کا ایک نہایت اہم اصول اس کے ذریعہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ تفصیل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت عمار بن یاسر کو کوفے کی گورنری پر بھیجا۔ حضرت عمارؓ ان سابقین اولین میں ہیں جنہوں نے بڑی مصیبتیں اسلام کی راہ میں اٹھائی ہیں، مگر کوفے والے تو بس کوفے والے فوراً ہی شکایتیں شروع کر دیں۔ نہ صرف یہ شکایت تھی کہ نا اہل ہیں بلکہ یہ بھی کہ امانت و دیانت سے بھی خالی ہیں۔ حضرت عمرؓ نے واپس بلا لیا اور کہا کہ عمار میں جانتا تھا کہ یہ کام تمہارے بس کا نہ ہو گا مگر میرا دھیان اس آیت کی طرف گیا جس میں ارشادِ حق ہے کہ:-

وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ
اُدْرِمُ ارَادَهُ كَرْتَهُ هِيَ كَرَانُ لُكُوْلٍ پَرَا صَا
اَسْتَضْعَفُوْا فِى الْاَرْضِ وَنَجْعَلُهُمْ
كِرِيْسِ جَنِّ كُو كُرْمَرٍ بِنَا كَر رُكْهَ لِيَا كِيَا هِيَ
اَرْسَمَةٌ وَنَجْعَلُهُمُ الْوَارِثِيْنَ
پس ان کو سب برابر ہی دیں اور زمین
(سورہ ۲۸، قصص، آیت ۵) کی وراثت بخشیں۔

اس لیے میں نے تم کو بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ ان کو واپس بلا نے کے بعد حضرت عمرؓ نے کوفے کے وفد سے پوچھا کہ اچھا تم بتاؤ کس کو چاہتے ہو۔ انہوں نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کا نام لیا۔ یہ بھی بڑے پلے کے صحابی تھے ان لوگوں کے اپنے بھی تھے۔ مین سے تعلق تھا اور مین کے بہت سے قبیلے کوفے میں آ بسے تھے۔ مگر سال بھر مشکل سے گزرا کہ ان کے خلاف بھی شکایت شروع ہو گئی اور حضرت عمرؓ نے ان کو کوفے سے ہٹا کر بصرے بھیجا اور اب اس خالی جگہ کے لیے فکر مند تھے کہ کیا کریں، کس کو بھیجیں، مسجد میں جا کر

۱۶ تاریخ ابن اثیر ج ۳ ص ۱۶ - ۱۷ ایضاً۔

لیٹے اور زیندا آگئی۔ اسی حالت میں حضرت مغیرہ بن شعبہ وہاں پہنچ گئے، حضرت عمرؓ بیدار ہوئے تو انھوں نے اپنی قیامت شناسی کے ماتحت کہا کہ آپ کچھ زیادہ ہی فکر مند معلوم ہو رہے ہیں خیریت تو ہے۔ حضرت عمرؓ نے قصہ بتایا۔ اسی دوران میں اہل شوریٰ بھی آگئے ان کے دریافت کرنے پر کہ معاملہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ:-

ان اهل الكوفة قد عضلوني اهل كوفتي نے مجھے بڑے ٹھکے میں ڈال دیا،

اور پھر نئے تقرر کے سلسلے میں مشورہ طلب کرتے ہوئے ان حضرات سے فرمایا کہ مسئلہ میرے سامنے یہ ہے کہ حکام اور والیان کے تقرر کے سلسلے میں کیا اصول برتوں؟ اعلیٰ اسلامی صفات والے کو ترجیح دوں اگرچہ وہ انتظامی لحاظ سے کمزور ہو؟ یا انتظامی لحاظ سے مضبوط اور اہل افراد کو ترجیح دی جاوے اگرچہ وہ اسلامی صفات کے لحاظ سے اعلیٰ مقام کے نہ ہوں بس میاں نہ ہوں۔ آپ کے الفاظ جو روایت میں نقل ہوئے ہیں وہ یہ ہیں:-

ما تقولون في تولية رجل ضعيف مسلم او رجل قوی مسدّد؟

اس پر جواب دینے والے حضرت مغیرہؓ تھے انھوں نے فرمایا کہ:-

اما الضعيف المسلم فان اسلامه
لنفسه وضعف عليك وعلى
المسلمين واما القوي المسدّد
فان سداده لنفسه وقوته
لك وللمسلمين له

امیر المؤمنین! جہا تک انتظامی اعتبار سے کمزور مگر اسلامی لحاظ سے اعلیٰ درجہ کے مسلمان کا سوال ہے تو اسکی اسلامیت کا فائدہ تو اسکی ذات کو پہنچے گا مگر اسکی کمزوری نقصاً آپکو اور مسلمانوں کو اس کے برعکس بس میاں مگر مضبوط فرد ہوتو اسکی میاں روی اس کے لیے ہوگی اور مضبوطی آپ کے اور عامتہ المسلمین کے لیے۔

لہ تاریخ ابن اثیر ج ۳ ص ۱۴

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے جب مذکورہ بالا سوال اہل مشورہ کے سامنے رکھا تھا تو ان کا اپنا رجحان بھی اسی طرف تھا۔ اور وہ جو شکایت ان سے مروی ہے کہ یا اللہ کیا کر دوں متقی ملتا ہے تو متعظم نہیں ہوتا اور جو متعظم ہوتا ہے اُس میں تقویٰ نہیں ملتا۔ اس شکایت اور تجربے کے نتیجے میں بالآخر وہ یہی طے کرنے پر مائل ہو گئے تھے کہ تقویٰ کو کم اور انتظام کو زیادہ اہمیت دی جائے۔ چنانچہ اس موقع پر جو کہ آپ کی وفات سے دو ڈھائی سال پہلے یعنی ۱۲ھ کا واقعہ ہے، حضرت مغیرہ کا جواب سننے کے بعد آپ نے گویا اسی کو قبول کر لیا اور حضرت مغیرہ ہی کے لیے طے کر دیا کہ وہ کوفہ کی ذمہ داری سنبھالیں۔ روایت کے الفاظ ہیں:-

فولت المغيرة الكوفة فتى
عليها حتى مات عمر ذالك
نحو سنتين ادنا ياداة
پس آپ نے کوفہ کی ولایت مغیرہ ہی کے سپرد
کر دی اور وہ اس عہد پر رہے حتیٰ کہ
حضرت عمرؓ نے وفات پائی اور یہ کوئی
دو سال یا کچھ زیادہ کی مدت ہوئی۔

حضرت مغیرہ کی دوسری عظمت

حضرت مغیرہ کی ایک عظمت وہ تھی جو سورہ توبہ اور سورہ فتح کی ان قرآنی آیات سے ثابت ہوتی ہے جن کا حوالہ اوپر گزرا اور جن کی رو سے حضرت مغیرہ ایک طرف ان (چودہ سو) سرفروش انسانوں میں سے ہیں جن سے پروردگار عالم نے اپنی خوشنودی کا اعلان صلح حدیبیہ کے موقع پر فرمایا۔ اور دوسری طرف ان تیس ہزار فرمانبرداروں کی فہرست میں بھی ان کا نام ثبت ہے جن کو پروردگار نے غزوة عسرت کی صعوبتیں اٹھانے پر بہرہ و کرم کی ایک خصوصی نظر سے سرفراز فرمایا۔ یہ ان کی ایک اور سبب بلندتر عظمت تھی۔ دوسری عظمت اوپر کے واقعے کے سامنے آتی ہے کہ حدیبیہ اور تبوک کی سرفرازیوں حاصل ہونے کے باوجود ان کے لئے

لہ ابن اثیر ج ۳ ص ۱۶ -

یہ بات ذرا بھی پریشان کن نہیں ہوئی کہ حضرت عمرؓ جس گفتگو کے سیاق و سباق میں ان کو کونے کی حکومت دے رہے ہیں اس کی رو سے اُن کا درجہ ایک ذرا کم متقی مسلمان کا ہوا جاتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ انہوں نے تو گویا اپنے ہی ہاتھ سے اپنے اوپر "کم متقی مسلمان" کا لیبل لگا لیا۔ ظاہر ہے کہ سب صحابہ کرامؓ ایک درجہ کے نہیں تھے، تقویٰ اور طہارت میں بھی ان کے درجات مختلف تھے۔ اور اسے بس اُن کی عظمت کی بات کہا جاسکتا ہے کہ ایسی ایسی قرآنی بشارتوں سے سرفرازی کے باوجود اُن میں سے اگر کوئی اپنے آپ کو تقویٰ اور طہارت اور تدبیر میں مقابلتہً کمتر دیکھتا تھا تو بے تکلف اپنے آپ کو کمتر ہی جانتا اور کمتر سمجھ جانے پر راضی ہوتا تھا۔ اللہ کی طرف سے ملے خوشنودیوں کے تمنغے پر نظر کر کے غرے میں نہیں مبتلا ہوتا تھا البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد... دلکن سدّ دوا دار بوا۔ لہٰذا پر نظر کر کے اللہ سے آخرت میں عفو و عنایت کی امید رکھتا تھا۔

بدنام کن روایت کا متن

شبیعہ حضرات سوائے تین چار کے تمام اصحاب نبیؐ کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ مرتد ہو گئے تھے بلکہ سابقین اولین ابو بکر و عمر اور عثمان وغیرہ تو شروع ہی سے معاذ اللہ منافق تھے۔ ایسا گمان رکھنے والوں کے لیے ٹھیک ہے کہ وہ ان حضرات کی شان میں جو بھی چاہیں سو ادب کریں مگر جو شخص اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایسے گمان کو اپنے لیے بدعتی کی بات سمجھتا ہو وہ کیسے مان سکتا ہے کہ یہ لوگ جنہوں نے اسلام کے لیے ایسی جاں نثاریاں اور فرمانبرداریاں کیں کہ خدا کے پاک نے بھی سند قبولیت

لہ حدیث نبویؐ، ان الدین لیسر، دلنیشاد الدین احد، الاغلبہ فسدّ دوا دار بوا والنشر وا۔ الحدیث اللہ کا دین آسان ہے جو کوئی اس میں شدت پندی کرے گا بالآخر مغلوب ہو جائیگا پس میانہ روی سے کام لو، اور (رضائے حق کی) خوشخبری پاؤ۔ (مشکوٰۃ باب الاقتصاد فی العمل بحوالہ بخاری)

عطا فرمادی وہ اسلام کی جڑ کھودنے کا کام کریں گے اور فخر سے کہیں گے کہ میں نے اسلام اور امت اسلام کے لیے تباہی کی داغ بیل ڈال دی ہے۔ یہی بد بختانہ بات ہے جو یزید کی ولی عہدی کی تجویز کے سلسلے میں حضرت مغیرہ جیسے صاحب فضائل صحابی رسول کی طرف ہماری تاریخی کتابوں میں منسوب کی گئی ہے اور جس کے متعلق ہم نے کہا تھا کہ تفصیل آگے آئے گی۔ تاریخ کی جو کتابیں اس وقت ہمارے سامنے ہیں ان میں سب سے زیادہ غضب ان اثیری کی کتاب "الکامل فی التاریخ" میں ڈھایا گیا ہے۔ اور یہ بیان دیا گیا ہے کہ:-

اور اس سنہ (۵۶) میں لوگوں نے یزید بن معاویہ سے ولی عہدی کی بیعت کی۔ اور اس معاملے کی ابتدا مغیرہ بن شعبہ سے ہوئی تھی۔ ہوا یوں کہ معاویہ نے کونے کی آمارت سے مغیرہ کو معزول کر کے سعید بن عاص کو مقرر کرنے کا ارادہ کیا۔ مغیرہ کو یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے طے کیا کہ مجھے معاویہ کے پاس جا کر خود ہی اپنا استعفیٰ پیش کر دینا چاہئے تاکہ لوگوں کو یہ ظاہر ہو کہ مجھے اس عہدہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ پس یہ طے کر کے وہ معاویہ کے پاس گئے اور وہاں (مشرق) پہنچ کر اپنے دوستوں سے کہا کہ میں نے آج ولایت اور امارت حاصل نہیں کر لی تو کچھ کبھی بھی نہیں کر سکوں گا۔ یہ کہہ کر سیدھے یزید کے پاس پہنچے اور اس سے بولے کہ میاں، بڑے بڑے اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور بزرگان قریش گزر چکے اب صرف ان کی اولاد رہ گئی ہے اور تم ان میں سے سمجھ بوجھ کے اعتبار سے بھی اور سنت و سیاست کے علم کے اعتبار سے بھی افضل لوگوں میں ہو، میں نہیں جانتا کہ آخر امیر المؤمنین کو کیا چیز مانع ہے کہ وہ تمہارے لیے ولی عہدی کی بیعت لے لیں! یزید یہ سن کر بولے کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ بیل منڈھے چڑھے گی؟ مغیرہ نے کہا کیوں نہیں؟ پس یزید اپنے باپ کے پاس پہنچے اور یہ گفتگو بتائی۔ معاویہ نے بات سن کر مغیرہ کو بلایا اور پوچھا کہ یہ یزید کیا کہہ رہا ہے؟

انہوں نے کہا کہ ہاں امیر المؤمنین! ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میرے سامنے اس
 اختلاف اور خورنیزی کا منظر ہے جو عثمانؓ کے قتل کے بعد رونما ہوا (میں نہیں
 چاہتا کہ یہ دوبارہ ہو) زید کی شکل میں آپ کے بعد ذمہ دار لوگوں کو سنبھالنے والا
 ایک فرد موجود ہے۔ پس اس کا تقرر کر دیجئے تاکہ آپ کو کچھ ہوتو لوگوں کے لیے
 ایک جگہ پناہ اور آپ کا خلف موجود ہو اور کوئی فتنہ و فساد رونما نہ ہو پائے
 معاویہ نے یہ سن کر کہا کہ اس کام کی صورت کیا ہوگی؟ میفرمے جواب دیا کہ کوفے والوں
 کو متفق کرنے کے لیے میں کافی ہوں، بصرے کے لیے زیادہ موجود ہے اور ان دو بڑے
 شہروں کے بعد کوئی نہیں رہ جاتا جو آپ کی مخالفت کرے۔ معاویہ نے یہ سن کر کہا کہ
 اچھا تم اپنے منصب پر واپس جاؤ اور اپنے بھروسے کے لوگوں سے بات چیت کرو،
 پھر دیکھیں گے۔ یہ کہہ کر معاویہ نے ان کو رخصت کیا اور یہ لوٹ کر اپنے دوستوں میں
 پہنچے اور بولے کہ میں نے معاویہ کا پاؤں ایسی رکاب میں پھنسا یا ہے کہ اب نکلنے والا
 نہیں ہے اور امت محمدیہ میں پھوٹ کا وہ سامان کیسا ہے کہ اب اب تک اس میں جوڑ
 کی صورت نہ ہو۔

کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی اور بھی ہے لیکن جتنا اوپر آیا اس کا آخری (خط کشیدہ) جملہ
 ایسا ہے کہ اس کے بعد کچھ اور ستانے کی ضرورت نہیں۔
 کیا کوئی گنجائش اس بات کی ہے کہ ہم اصحابِ بیعتِ رضوان کے لیے اور مجاہدین
 غزوہ تبوک کے لیے خدائے ذوالجلال کی وہ خوشنودی اور کرم فرمائی بھی مانیں جس کا
 نہایت بلند آہنگ اعلان قرآن پاک میں ہوا ہے۔ اور اس کے ساتھ ان میں سے
 کسی کے بارے میں یہ ماننے کو بھی تیار ہو جائیں کہ اس نے دنیا کی ایک حقیر غرض

لہ ابن اثیر ج ۳ ۲۳۹۔ ۲۔ اصل عربی الفاظ یہ ہیں: "لقد وضعت رجل معاویة
 فی غرر بعید الغایة علی امتہ محمد وفتقت علیہم فتقلاً لا یرتق ابداً۔"

کے لیے دیدہ و دانستہ نہ صرف اسلام دشمنی کا ایک کام کیا بلکہ اس کا فخر سے اعلان بھی دستور میں کیا؛ خدا کی پناہ اور ہزار بار پناہ۔ ہم یہ لہجویات بلکہ کفریات مان کر قرآن اور اس کے اعلان کو جھٹلانے کا کام کیسے کر سکتے ہیں؟

کچھ اور اس سے بڑھی ہوئی روایتیں

ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے ان قابل فخر مؤرخین کا معیار روایات کے قبول کرنے میں کیا تھا اور انھوں نے کیسے رافضیت سے وابستہ نہ ہونے کے باوجود ایسی روایت کو بلا نقد تبصرہ لے لیا؛ لیکن ان پر آنکھ بند کر کے اعتماد ہم بہر حال نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے یہاں تو اس سے بھی زیادہ ناقابل یقین اور ایمان سوز روایتیں موجود ہیں۔

حضرت مغیرہ ہی کے بارے میں ایک روایت طبری میں ہے اور ابن اثیر نے بھی اسکو حسب عادت من وعن لے لیا ہے۔ سنیہ اور خود فیصلہ کیجیے کہ کیا اس کو مانا جاسکتا ہے روایت ہے کہ:-

”سنہ ۳۴۰ میں حج مغیرہ بن شعبہ کی امارت میں ہوا۔“

اس کی تفصیل ابن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ:-

”جب اس سال میں کہ جس میں علی قتل کیے گئے، موسم حج آیا تو مغیرہ بن شعبہ نے معاویہ کی طرف سے ایک جعلی خط بنایا اور اس کی بنیاد پر لوگوں کو سنہ ۳۴۰ کا حج کرایا۔ اور کہا گیا ہے کہ انھوں نے یوم ترویہ (۸ رذی الحجہ) میں وقوف عترہ کرایا (جو تاریخ کو عرفات میں ہوتا ہے) اور عترہ کے دن یعنی نبوی تاریخ کو قربانی کرائی (جو تاریخ کو ہوتی ہے) اور اس ڈر سے کرایا کہ کہیں ان کی جعل سازی کا پتہ نہ چل جائے۔ اور ایک بیان اس سلسلے میں یہ بھی ہے کہ یہ جلدی جلدی کی کاروائی انہوں نے اس لیے کی کہ انہیں اطلاع مل گئی تھی کہ کل صبح کو عقبہ بن ابی سفیان امیر حج کی حیثیت سے مکہ پہنچے اور انہیں“

آپ ذرا غور کیجئے، مغیرہ شہمی میں کیسی کیسی خرافات تیار کرنے والوں نے تیار کی ہیں۔ اور ہماری تاریخی کتابوں میں ان کو جگہ مل گئی ہے۔ ماں یحییٰ مغیرہ بن شعبہ ان فضائل سے آراستہ ہونے کے باوجود جن کا ذکر اوپر کیا گیا۔ اس حد تک بھی (معاذ اللہ) کر سکتے تھے کہ جعلی تقریر نامہ بنا کے حج کی امیری ہی نہ کریں بلکہ اس امیری کی خاطر حج کا حلیہ بھی لگاڑیں۔ یعنی ۹ ذی الحجہ کے بجائے ۸ کو حج (وقوفِ عرفہ) کرادیں) اور اے بجائے، ۹ کو قربانی کرادیں۔ لیکن کیا اس وقت کے اور وہ تمام مسلمان بھی اندھے ہو گئے تھے حج کرنے آئے تھے، ان میں سے کسی کو خبر نہیں رہی کہ مغیرہ کیا غضب کر رہے ہیں یا کسی کے بھی منہ میں زبان نہ تھی جو انہیں ٹوکتا؟ آخر کون اس بہبودہ روایت کو مان سکتا ہے؟ مگر ہم دیکھ رہے ہیں کہ تنہا طبری ہی نے نہیں اس کو قابل بیان نہیں سمجھا بلکہ ابن اثیر نے بھی بلا چون و چرا نقل کر دیا ہے۔ خدا بھلا کرے ابن کثیر نے ضرور اسے نقل کرنے کے بعد یہ کہنے کی ضرورت سمجھی ہے کہ ”یہ روایت باطل ہے، حضرت مغیرہ کے بارے میں ایسے گمان کی کوئی گنجائش نہیں، کیونکہ صحابہ کرام ایسی باتوں سے بالاتر تھے، یہ روایت دراصل شیعیت کا شوشہ ہے۔“

حاصل کلام

بہر حال اس کا امکان تو تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ حضرت مغیرہ نے ایک صاحب لائے اور دورانِ اندیش انسان کی طرح جس کے لیے وہ مشہور تھے۔ حضرت معاویہ کے بعد اختلاف کے اندیشے سے یہ رائے قائم کی ہو کہ اس کی پیش بندی کے لیے یزید کی ولی عہدی مناسب رہے گی۔ لیکن یہ بات کہ انھوں نے محض کوئے کی اپنی امارت پچانے کے لیے یہ داؤں کھیلا اور اس بات کا پورا شعور رکھتے ہوئے کھیلا کہ اس تجویز کے ذریعہ وہ امت مسلمہ کو

تباہی و بربادی کے راستے پر ڈال رہے ہیں۔ یہ قطعاً ناقابل قبول بات ہے قرآن پاک کی صاف صاف شہادت ہے کہ ”الذان سے راضی ہوا“۔ ”اللہ نے ان پر رحمت کی نظر کی۔“ اس قرآنی شہادت کے مقابلے میں کوئی بھی ایسی روایت کیسے قابل قبول ہو سکتی ہے جو حضرت مغیرہ کو ایسے کردار کا حامل دکھائے جس کے ساتھ اللہ کی رحمت و رضامندی ہرگز جمع نہیں ہو سکتی؟ اور پھر روایت بھی وہ جس کی کوئی سند تک ہمارے سامنے نہیں ہے۔

ایک اور پہلو

اتنی ہی بات نہیں کہ یزید کی ولی عہدی کے لیے حضرت مغیرہ کی تجویز کی یہ روایت از روئے درایت لائق تسلیم نہیں ہے بلکہ روایتی حیثیت سے بھی اس کی خامی یہ ہے کہ ابن اثیر تو اپنی بلا سند روایت میں واقعہ کی صورت یہ بیان کرتے ہیں جیسا کہ اوپر گزر چکا کہ ۶۵ھ میں حضرت معاویہ نے حضرت مغیرہ کو کوفے کی امارت سے معزول کر کے سعید بن عاص کو ان کی جگہ لانے کا ارادہ کیا۔ مغیرہ کو پتہ چلا تو وہ اس ارادے سے سیدھے عازم دمشق ہوئے کہ عہدے سے اپنی بے نیازی ظاہر کرنے کے لیے خود جا کر استعفیٰ دیدیں انہ۔ جبکہ طبری میں سند کے ساتھ صورت واقعہ یہ بیان کی گئی ہے کہ مغیرہ اپنے ضعف کا عذر لے کر معاویہ کے پاس پہنچے کہ ان کا استعفیٰ قبول کر لیا جائے۔ جس پر حضرت معاویہ نے قبول کر لیا اور ان کی جگہ پر سعید بن عاص کو لانے کا ارادہ کیا۔

دونوں روایتوں میں صورت واقعہ بالکل مختلف ہے۔ ابن اثیر کی روایت میں حضرت معاویہ ارادہ کرتے ہیں کہ حضرت مغیرہ کو ہٹا کر سعید بن عاص کا تقرر کر دیں اور اس کو سن کہ حضرت مغیرہ استعفیٰ دینے جاتے ہیں جبکہ طبری کی روایت میں حضرت مغیرہ خود سے استعفیٰ کے خواہش مند ہوتے ہیں اور نتیجتاً حضرت معاویہ ارادہ کرتے ہیں کہ سعید بن عاص لے۔ تاریخ ابن اثیر میں سند کی روایت درج نہیں ہوتی۔

کا تقرر کر دیا جائے۔ اس اختلاف کی صورت میں طبری کی باسند روایت کو قدرتی طور پر ابن اثیر کی بے سند روایت پر ترجیح ہونی چاہیے۔ طبری کی روایت آگے ایسی کوئی بات نہیں بیان کرتی جس کو حضرت مغیرہ جیسے ایک صحابی رسول کے حق میں مانتا ہمارے لیے ممکن نہ ہو۔

طبری کی روایت کا سقم

لیکن طبری کی روایت میں بھی ایک جھول ہے، یعنی آگے جو صورت واقعہ انھوں نے بیان کی ہے وہ عقلاً کچھ سمجھ میں آنے والی نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت مغیرہ کا استعفیٰ منظور ہونے اور سعید بن عاص کا ان کی جگہ پر نام آنے کی بھنگ جو حضرت مغیرہ کے سرکریز (کاتب) کے کان میں پڑی تو وہ (سعید کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے) ایک دم سعید کے پاس جا پہنچے اور خوشخبری سنائی۔ اس کا پتہ حضرت مغیرہ کو چل گیا اور یہ چیز جو انھیں ناگوار ہوئی تو ایک دم یزید کو ولی عہدی کا خواب دکھانے کی اسکیم تیار کر کے یزید کے پاس پہنچ گئے۔ یزید یہ سنہرا خواب لے کے اپنے والد کے پاس پہنچے اور والد نے اس کی خوشی میں حضرت مغیرہ کو ان کی جگہ پر بحال کر کے کوئے واپس بھیج دیا کہ جاؤ اور اس خواب کو واقعہ بنانے کی تدابیر کریں۔

مغیرہ بن شعبہ خود سے استعفیٰ دینے کو جاتے ہیں ضعیف العمری کا تقاضا ہے۔ پھر یہ کیا بات ہوئی کہ جو شخص ان کا سرکریز تھا وہ نئے ہونے والے امیر کو فہ کو خوش کرنے کیلئے اس کے پاس خوشخبری لے کر پہنچ گیا تو آپ نہ صرف اس سے بگڑ گئے بلکہ اپنا استعفیٰ ہی القط کرنے کی ٹھان لی۔ یہ تو ایک بچوں والا مزاج ہوا۔ حالانکہ مغیرہ مانے ہوئے صاحب رائے اور دانشمند اور شہر کے پیٹے میں ہیں! بظاہر روایت کا یہی ناقابلِ تہم پہلو ہے جس کی بنا پر ابن کثیر نے اسے طبری ہی کے حوالے سے درج کرنے کے باوجود اس کا یزید کا زین

والاجزہ نکال کر بس یوں بیان کیا ہے کہ :-

..... استغفے منظور ہونے اور سعید بن عاص کا تقرر کیے جانے کی خبر سننے سے

مغیرہ کو شاید کچھ پچھتاوا سا ہوا جس کی بنا پر وہ زید کے پاس گئے۔ ^۱.....

اور چونکہ ابن اثیر نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں صراحت لکھا ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب کی بنیاد اصلاً طبری کی روایات پر رکھی ہے اور بعد میں وہ دوسری کی روایات سے مناسب اضافے کرتے ہیں اس لیے یہ سمجھنا غلط نہ ہوگا کہ اصل روایت تو ان کے سامنے بھی طبری ہی کی ہے مگر ابن کثیر کی طرح انہوں نے بھی اس کو اصل صورت سے پیش کرنے میں دقت محسوس کی تو اس کی اصلاح انہوں نے ابن کثیر سے بھی زیادہ کر دی۔ اور خود ہی استغفے دیکر خود ہی نام ہونے کو بھی حضرت مغیرہ جیسے ہوشمند اور بختہ کار سے لعید دیکھ کر واقعہ کو یوں بیان کیا کہ اصل ارادہ معاویہ کی طرف سے ہوا تھا کہ مغیرہ کو معزول کر کے سعید کا تقرر کر دیا جائے۔ مغیرہ کو اس کی بھنک پڑی تو وہ اس کی کاٹ کے لیے اپنا استغفے لے کر پہنچ گئے۔ اور استغفے کے ساتھ ساتھ زید کے کان میں ولی عہدی کا افسوس بھی پھونک دیا جس کے نتیجے میں معاویہ کو خود ہی ضرورت محسوس ہوئی کہ مغیرہ کو ان کے عہدے پر باقی رکھا جائے۔

سوال یہ ہے کہ ایسی روایت کی وقعت کیا ہے جو اتنی ناقابلِ نہم ہو کہ طبری کا نام لیکر بیان کرنے والے بھی اس کو کافی رد و بدل کے بغیر بیان کے قابل نہ سمجھتے ہوں؟

ایک اور سوال

حضرت مغیرہ بن شعبہ کا انتقال معتبر روایات کے مطابق ۳۹ھ یا ۴۰ھ میں

۱۔ البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۸۶۔ ۲۔ ابن اثیر کی بیان کردہ روایتوں کا پورا ترجمہ اور گزرت چکا ہے۔

ہو جاتا ہے۔ اب ذرا غور کیجئے کہ طبری کی روایت بھی ہے اگرچہ بہت مختصر طور پر اور ابن اثیر نے تو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے کہ مغیرہ بن شعبہ جب کوفے واپس گئے تو حضرت معاویہ سے کیے ہوئے وعدے کے مطابق یزید کی ولی عہدی کے لیے زمین ہموار کرنے میں لگ گئے اور پھر وفود تیار کر کے دمشق بھیجے جو حضرت معاویہ سے جا کر درخواست کریں کہ اپنے بعد کیلئے یزید کی ولی عہدی کی شکل میں بندوبست کر جائیں۔ لیکن یہ ساری روایتیں ہمیں ۵۶ھ کے واقعات کے ذیل میں ملتی ہیں بایں طور کہ ۵۶ھ میں یزید کو ولی عہد سلطنت بنایا گیا اور اس کی تجویز دراصل مغیرہ بن شعبہ نے رکھی تھی اور اس طرح قصہ پیش آیا تھا۔

سوال یہ ہے کہ یہ قصہ پیش آیا کب تھا؟ کون سے سنہ کی بات ہے؟ اور جس سنہ میں یہ قصہ پیش آیا کہ مغیرہ بن شعبہ نے استغفہ دیا یا وہ معزول کیے گئے اور پھر انہوں نے یزید کی ولی عہدی کی تجویز سے حضرت معاویہ کو خوش کر کے اپنا عہدہ بچایا اس کا ذکر اسی سنہ کے واقعات میں نہیں کیوں نہیں ملتا جس سنہ میں یہ واقعہ پیش آیا تھا؟ چونکہ ۵۶ھ یا اس سے پہلے ہی کا کوئی سنہ ہو سکتا ہے جبکہ حضرت مغیرہ زندہ تھے (طبری اور ابن اثیر کے صفحات حکام کی معزولیوں، تقرریوں، استغفوں اور ترقیوں کے تذکروں سے پھرے ہوئے ہیں حتیٰ کہ خود مغیرہ بن شعبہ ہی کا بالکل اسی طرح کا ایک استغفہ دینے کا واقعہ بھی ۵۶ھ کے واقعات میں موجود ہے۔ لیکن جس معزولی اور دوبارہ تقرری کا تعلق یزید کی ولی عہدی جیسے اہم واقعہ سے ہے اور پھر اس کے ساتھ حضرت مغیرہ کے بھیجے ہوئے وفود کا دمشق آنا جانا بھی جڑا ہوا ہے، اس کا ذکر اور اس کے اہم متعلقات اور نتائج کا ذکر ہمیں سنہ وقوعہ کے اندر نہیں ملتا! اس کے بعد اس ولی عہدی سے لوگوں کے اختلاف کی باتیں چلتی ہیں۔ بات حضرت حسین اور حضرت ابن زبیر کے خروج اور محاذ آرائی تک

۱۔ البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۸۱، ابن اثیر ج ۳ ص ۲۲۵، بیان واقعات سنہ ۵۶ھ طبری ج ۶ ص ۱۶۹

۲۔ پوری تفصیل کے لیے دیکھیے ابن اثیر ج ۳ ص ۲۳۹ ۳۔ دیکھیے طبری ج ۶ ص ۱۲۴-۱۲۳

پہنچتی ہے۔ طرح طرح کی گفتگوئیں ہیں، تبصرے ہیں، تنقید ہے، تائید ہے کسی ذیل میں بھی ہیں حضرت مغیرہ کا نام اس سلسلے میں سننے کو نہیں ملتا۔ حالانکہ بالکل قدرتی بات تھی کہ کبھی حضرت معاویہ کے ہی منہ پر اپنی پوزیشن کی صفائی کے سلسلے میں یہ نام آتا کہ بھائی یہ تو ایک غیر اموی کا تجویز کیا ہوا نام ہے، اور وہ بھی ایسے ایسے اوصاف و فضائل رکھنے والا، اسی طرح عادیہ غیر ممکن تھا کہ اس ولی عہدی کی مخالفت کرنے والے اور پھر ولی عہد سے لڑائی لڑنے والے اس کو اور اس کے باپ کو برا بھلا کہنے کے ساتھ دوچار نام اس تجویز پیش کرنے والے کو بھی نہ رکھتے۔ ۱۵۶ھ کی ان روایتوں کے علاوہ جن کا ذکر اوپر کیا گیا کہیں سے کہیں تک آپ کو حضرت مغیرہ کا ذکر اس تفسیر سے جڑا ہوا نہیں ملے گا۔ کیا معاملے کا یہ پہلو ان روایتوں کی واقعیت میں شک پیدا کرنے کا حق نہیں رکھتا۔

اور اب سند کی بات

اور سند کے لحاظ سے بھی یہ روایت کوئی قابل اعتناء درجہ کی نہیں ہے۔ اسکے ایک راوی علی بن مجاہد کے باریک بن معین کا قول ہے کہ ”کان یضع الحدیث“ حدیثیں گھڑا کرتا تھا۔ (میزان الاعتدال ج ۳ ص ۱۵۲) جو شخص حدیثیں گھڑ سکتا ہو وہ تاریخی روایات میں کیا کچھ نہیں کر سکتا؟ حافظ ابن حجر تقریب التہذیب میں لکھتے ہیں کہ ”متروک ہیں“ اور ”لیس فی شیوخ احمد اصنف منہ“ (امام احمد کے شیوخ) (اساتذہ) میں ان سے زیادہ ضعیف کوئی دوسرا نہیں ہے) (ج ۱ ص ۲۶)



باب چہارم

ولی عہدی کی راہ میں زیاد کا وجود رکاوٹ؟

یزید کی ولی عہدی کی تجویز کے سلسلے میں جو راوی یہ بتاتے ہیں کہ یہ تجویز کونے کے اموی گورنر مغیرہ بن شعبہ کے دماغ سے نکلی تھی اور نہایت بچکانہ حرکت کے طور پر نکلی تھی، وہی راوی ایک مزید بات اس سلسلے میں یہ بھی بتاتے ہیں کہ حضرت معاویہ نے اپنے ایک دوسرے اہم گورنر زیاد سے بھی اس سلسلے میں رائے مانگی تھی اور اس نے رائے یہ دی کہ اس معاملے میں عجلت مناسب نہیں ہے، فی الحال اسکو التوا میں رکھنا اور موزوں حالات کا انتظار کرنا مناسب ہوگا۔ حضرت معاویہ نے یہ رائے بلا چون و چرا قبول کر لی، اس کے

۱۔ طبری ج ۶ ص ۱۷۱۔ زیاد بصرے کا گورنر تھا۔ اس کو زیاد بن ابیہ، زیاد بن سمیہ، زیاد بن ابی سفیان وغیرہ کئی ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ یعنی نسب کے اعتبار سے ایک کمزور آدمی تھا۔ مگر نہایت باصلاحیت طائف کے قبیلہ ثقیف میں ہجری ۱۰ سنہ میں پیدا ہوا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں اس کی صلاحیتیں کھلنا شروع ہوئیں اور حضرت عمرؓ نے اسے بڑھا دیا۔ بصرہ میں گورنرول کا سکرٹری رہا۔ حضرت علیؓ کا عہد آیا تو آپ نے اسے فارس کی گورنری دی۔ اور حضرت حسنؓ کی صلح کے بعد یہی ایک گورنر تھا جس نے سال بھر تک حضرت معاویہ کے اقتدار کو تسلیم نہیں کیا بالآخر ۴۲ھ میں اطاعت قبول کر لی اور کوفے میں رہائش کی اجازت حاصل کی۔ حضرت معاویہ اس سے اتنے خائف تھے (باقی اُسندہ صفحہ ۸۸)

بعد انہی راویوں کی یہ بھی روایت ہے کہ:- جب زیاد کا انتقال ہو گیا تو معاویہ نے
 لٹامات زیاد دعا بکتاب یزید کو خلیفہ نامزد کرنے کی ایک دستاویز
 بکتاب فترا علی الناس تیار کر کے لوگوں کے سامنے پڑھی جو
 باستخلاف یزید۔ ان حدث یہ تھی کہ معاویہ کی موت واقع ہو جائے
 بہ حدث الموت فیزید تو یزید جانشین ہو گا جس پر سب لوگوں
 ولی عهد فاستوثق له الناس نے سوائے پانچ انسداد کے
 علی البیعة لیزید الا خمسة یزید کی ولیعہدی کے لیے اپنا اقرار
 نفر۔ لہ دیا۔

روایت کے الفاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے حضرت معاویہ کو بس زیاد کی
 موت کا انتظار تھا۔ چنانچہ ابن اثیر اور ابن کثیر دونوں نے بھی جو واقعات کو طبری
 کی طرح الگ الگ روایات میں توڑ کر نہیں بلکہ ایک تسلسل کے ساتھ بیان کرتے
 ہیں، زیاد کا مشورہ اور حضرت معاویہ کے یہاں اس کی قبولیت نقل کرنے کے بعد
 استخلاف یزید کی از سر نو تحریک کو زیاد کی موت کے ساتھ نکل اسی طرح جوڑ کے
 بیان کیا ہے جیسے بس زیاد کا وجود اس راہ میں رکاوٹ تھوڑا ہٹا اور حضرت معاویہ
 از سر نو سرگرم ہو گئے۔ حالانکہ زیاد کا انتقال بائفاق مؤرخین ۳۵ھ میں
 دگدگ شدہ صفحہ کا بقیہ، کہ کوفے کے گور حضرت مغیرہ کو لکھا کہ زیاد اور اس کے ساتھ فلاں فلاں نمایاں شیعان علی کو پابند
 کر دو کہ نماز باجماعت مسجد میں پڑھیں (یعنی تاکہ نگاہ میں رہیں) مگر نہ تو زیاد جیسا آدمی ایسی زندگی پر
 راضی رہ سکتا تھا نہ حضرت معاویہ ایسے کارآمد آدمی کو اپنا بنائے بغیر چھوڑ سکتے تھے۔ بالآخر دونوں
 قریب آئے اور ۴۵ھ میں زیاد کو بصرے کی گور نری مل گئی اور پھر مسلسل ترقیاں پاتا ہوا ۵۲ھ
 میں انتقال کر گیا۔ (طبری ج ۶ - ابن اثیر ج ۳ - سیر اعلام النبلاء ج ۳ -

لہ طبری ج ۶ ص ۱۱۱ - ابن اثیر ج ۳ ص ۲۵ البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۸۷ -

ہو گیا تھا۔ جبکہ حضرت معاویہ کی ازسرنو سرگرمی کا وقت ۵۶ھ میں بتایا جا رہا ہے۔ ۵۶ھ کے واقعات کے عنوان کے تحت طبری کے الفاظ ہیں۔

وفیہاد عامعا دیتہ الناس اور اسی سنہ میں معاویہ نے لوگوں کو
الی بیعتہ ابنہ یزید من بعدہ اپنے بعد اپنے بیٹے یزید کی بیعت کی دعو
وجعلہ ولی العهد دی اور اسے ولی عہد بنا دیا۔

اور تقریباً یہی الفاظ ابن کثیر اور ابن اثیر کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں۔

پس اول تو کوئی وجہ ایسی سامنے نہیں ہے جس کی بنا پر یہ سمجھنا معقول ہو کہ حضرت معاویہ زیاد کے ڈر سے اپنی دلی خواہش دبا کر بیٹھے رہے۔ دوسرے اگر یہی واقعہ تھا تو زیاد کا انتقال ۵۳ھ میں ہو جانے کے بعد ۵۶ھ تک مزید کون چیز انھیں روکے رہی؟ اور پھر کیا تک ہے کہ ۵۶ھ میں ہونے والے واقعہ کو اس انداز سے بیان کیا جائے کہ جیسے وہ زیاد کی موت کے فوراً بعد ہی پیش آگیا تھا جو کہ تین سال قبل ۵۳ھ میں ہو چکی تھی؟

قرین قیاس بات

جہاں تک زیاد سے مشورے کا سوال ہے وہ تو عین ممکن بلکہ قرین قیاس ہے، کیونکہ زیاد کا تعاون ناگزیر تھا، لیکن تجویز کے اجراء کو زیاد کی موت سے خواہ مخواہ مربوط کرنا جس سے یہ تاثر ہوتا ہے کہ بس زیاد کا وجود رکاوٹ بنا ہوا تھا جس کی وجہ سے ولی عہد کی تجویز ۸۔۱۰ سال سرد خانے میں پڑی رہی۔ چنانچہ وہ راتے سے ہٹا اور

لے طبری ابن اثیر اور ابن کثیر تینوں کے یہاں اس کا ذکر موجود ہے۔ لیکن ابن کثیر ۵۶ھ کے واقعات میں جہاں انہوں نے زیاد کی وفات کے بعد حضرت معاویہ کا سرگرم عمل ہونا بیان کیا ہے وہاں پتہ نہیں کیسے یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ زیاد کی وفات اسی سنہ میں ہوئی تھی "فلما مات زیاد وكان هذا السنة شرع معاویۃ الخ" ظاہر ہے یہ کوئی بھول چوک یا ایسے اس کے کسی کو غلط جان نہیں ہونا چاہئے۔ ج ۶ ص ۱۶۸

معاویہ پھر سرگرم عمل ہو گئے۔ یہ ربط ایک زبردستی کا ربط ہے اور قابل قبول نہیں نظر آتا۔ اس کے مقابلے میں قابل قبول یہ بات ہو سکتی ہے کہ ۵۶ھ میں اپنی عمر اور صحت کے تقاضے سے حضرت معاویہ کو یہ خیال غالب ہوا ہو کہ انھیں اپنے بعد کے لیے انتظام میں مزید دیر نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اس وقت ان کی عمر ستر سے اوپر ہو چکی تھی اور چار سال بعد ۶۰ھ میں ان کا انتقال ہی ہو گیا۔ حضرت معاویہ کی سرگرمی کی جو تفصیلات اہل تاریخ نے لکھی ہیں ان میں صاف طور سے اس کا اشارہ پایا جاتا ہے بلکہ بعض کے بیانات میں تو صراحت کا درجہ ہے۔ مثلاً طبری میں ہے کہ جو پانچ آدمی زید کی دلی عہدی سے متفق نہیں ہوئے تھے۔ جس کا ذکر اوپر دی ہوئی طبری کی روایت میں آ گیا ہے۔ ان کو ہوار کرنے کے لیے حضرت معاویہ نے حجاز کا ایک سفر کیا تو ان میں سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ بات چیت میں انہوں نے کہا کہ:-

إني ارحب ان ادع امة
محمد بعدى كالضأن لا
راعى لها۔ ۱۰

مجھے ڈر ہے کہ کہیں میں امت محمدی اللہ
علیہ وسلم کو اپنے بعد بکر لوں گے اس لوٹ
کی طرح نہ چھوڑ جاؤں جس کا کوئی

دیکھنے والا نہ ہو۔

اور ابن اثیر میں ہے کہ انہوں نے (اپنے سفر سے پہلے) مدینے کے گورنر مروان بن حکم کو لکھا کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنے بعد کے لیے کسی کو نامزد کر جاؤں، سو تم اس سلسلے میں اہل مدینہ کی رائے معلوم کرو۔ اس خط کا مضمون ابن اثیر میں اس طرح دیا گیا ہے کہ:-

۱۰ حضرت معاویہ کی عمر ۳۳ سال سے لیکر ۸۵ سال تک بتائی گئی ہے۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ "ان کی عمر اس وقت (موت کے وقت) ۷۸ سال تھی اور کہا گیا ہے کہ اسی سے اوپر تھی اور یہی زیادہ شہور ہے" البدایہ والنہایہ جلد ۸ ص ۱۳۳ - ۱۰ طبری ج ۶ ص ۱۶ -

اتی قد کبرت سستی و دقت
 عظمی و خشیت الاختلاف
 علی الامۃ بعدی وقد رأیت
 ان اتخیر لہم من یقوم
 بعدی و کرہت ان اقطع
 امرًا دون مشورۃ من عندک
 فاعرض ذالک علیہم
 و اعلمنی بالذی یردّون
 علیک۔ لہ

میری عمر بہت ہو چکی ہے اور بڑیاں
 گھل رہی ہیں۔ اور مجھے ڈر ہے کہ
 امت میں میرے بعد اختلاف ہو۔ اس
 لیے ضروری سمجھ رہا ہوں کہ اپنے بعد کیلئے
 کسی آدمی کو طے کر دوں۔ لیکن تمہارے
 پاس جو لوگ ہیں (یعنی اہل مدینہ) انکے
 مشورے کے بغیر کوئی فیصلہ کر دینا مجھے
 پسند نہیں۔ پس تم میری یہ بات اُن
 لوگوں پر پیش کرو اور ان کے جواب
 سے آگاہ کرو۔

ایک اور فائدہ

ابن اثیر کی اس عبارت سے جہاں ہمارے اس قیاس کو دلیل ملتی ہے کہ ۵۶ھ میں
 حضرت معاویہؓ یزید کی ولی عہدی کے لیے جو سرگرم ہوئے وہ اس لیے نہیں تھا کہ زیاد کا
 انتقال ہو جانے سے راستہ صاف ہو گیا تھا بلکہ ضعیف العمری اور اپنے وقت کے قریب
 ہو جانے کا احساس اس کا باعث ہوا تھا۔ اسی کے ساتھ ابن اثیر کی بیان کردہ ان روایتوں
 کی تردید یا تضعیف کا سامان بھی؛ ابن اثیر کی اس مذکورہ بالا روایت میں پایا جاتا ہے
 جو یزید کی ولی عہدی کے سلسلے میں حضرت میسرہ بن شعبہ کے متعلق ان کی کتاب میں ایک
 ہی صفحہ پہلے درج ہوئی ہیں اور اس جلیل القدر صحابی کی مضحکہ خیزی کا سامان بن رہی ہیں
 گذشتہ صفحات میں ہم نے اُن روایتوں کی طرٹ اشارہ کیا تھا تفصیل نہیں دی
 تھی۔ ان روایتوں کے مطابق حضرت میسرہ جب یزید کی ولی عہدی کی تجویز سے حضرت

لہ ابن اثیر ج ۳ ص ۲۵

معاویہ کو خوش کر کے کوفے کی عمارت پر اس وعدے کے ساتھ واپس ہوئے کہ کوفے والوں کو اس تجویز سے متفق کرنا میرا کام ہے تو پھر انہوں نے وہاں سے ایک وفد بھی تیار کر کے حضرت معاویہ کے پاس اپنے لڑکے کی سرکردگی میں دمشق بھیجا تھا جو تیس یا چالیس آدمیوں پر مشتمل تھا۔ اس وفد نے یزید کے بڑے گیت گائے اور حضرت معاویہ پر زور دیا کہ دلی عہدی کا تاج بس یزید کے سر پر رکھ ہی دیں۔ تو ان کو مناسب جواب دینے کے بعد حضرت معاویہ نے ابن مغیرہ سے پوچھا کہ تمہارے باپ نے کتنے میں ان سب کا دین خریدا؟ صاحبزادے نے جواب دیا "تیس ہزار میں"۔ یا دوسری روایت کے مطابق "چار سو دینار میں"۔

یہ مضحکہ خیز واقعات ہو چکے ہوں اور پھر بھی حضرت معاویہ مروان کو ایسے انداز میں خط لکھیں جیسے کہ دلی عہدی کے سلسلے میں کوئی بات کہی اس سے پہلے ہوئی ہی نہیں سکتی کیا یہ کوئی سمجھ میں آنے والی بات ہے؟ مروان تو اندرون خانہ کے آدمی تھے۔ اگر یزید کی دلی عہدی کی تجویز پہلے کسی طرف سے ہو چکی ہوتی اور اس کی تائید کیلئے کہیں سے وفود بھی آپکے ہوتے تو کہاں ممکن تھا کہ حضرت معاویہ اس معاملے میں مروان کو بالکل اجماع سمجھ کر خط لکھتے؟



باب نجمہ

دلی عہدی کی بیعت اور اسکے مخالفین کا قصہ

اوپر طبری کی روایت گزری ہے کہ یزید کی دلی عہدی پر پانچ حضرات کے سوا اور سب نے اتفاق کر لیا تھا۔ اس کے بعد کی روایت میں ان پانچ حضرات کے نام طبری نے یہ دیئے ہیں :-

حسین بن علی۔ عبداللہ بن عمر۔ عبداللہ بن زبیر۔ عبدالرحمن بن ابی بکر
عبداللہ بن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہم)

مگر اس ایک ابتدائی روایت کے سوا حضرت عبداللہ بن عباس کا نام اس اختلاف کے سلسلے میں کہیں نہیں ملتا۔ صرف باقی چار نام مختلف موقعوں پر مذکور آتے ہیں حتیٰ کہ خود اس روایت میں جو آگے بیان ہوا ہے کہ حضرت معاویہ نے ان میں سے ہر ایک سے مل کر یہ بات کی اور وہ بات کی۔ اس میں چار کے بعد پانچویں عبداللہ بن عباس سے حضرت معاویہ کی کوئی بات نقل کرنے کے بجائے یہ لکھا ہوا ہے کہ "قال ولعمریں کر ابن عباس" جس کا مطلب ہے کہ روایت کے اصل اور بنیادی راوی جو ایک جھول اور نامعلوم الاسم

ہے مثلاً حضرت معاویہ کی جو وصیت یزید کے لیے بیان کی گئی ہے اس میں ہی چار نام اس حیثیت سے مذکور ہیں کہ ان لوگوں کی طرف سے تم کو اختلاف کا سامنا ہو سکتا ہے۔ طبری ج ۶ ص ۱۸۹-۱۷۹۔

شخصیت ”سرجل بنخلہ“ ہیں۔ ان سے روایت کرنے والے صاحب جن کا نام ابن عجل ہے وہ کہتے ہیں کہ نخلہ والے صاحب نے بات چیت کے بیان کے سلسلے میں ابن عباس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ یعنی بیان کے شروع میں اختلاف کرنے والوں کے جو نام انہوں نے گناے تھے ان میں تو ابن عباس کا نام تھا۔ مگر ان حضرات سے حضرت معاویہ کی گفتگو کا جو قصہ بیان کیا اُس میں پھر حضرت ابن عباس کا کوئی تذکرہ نہیں آیا۔ پس اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نام کسی غلطی سے آگیا اور نہ آنا نہیں چاہیے تھا۔ اور بظاہر یہی وجہ ہے کہ ابن اثیر جو طبری کے حوت بجز متعلقہ ہیں انہوں نے بھی اس قصے کے بیان میں چارہی نام لیے ہیں حضرت ابن عباس کا نام ان کے بیان میں نہیں ملتا۔ ابن کثیر نے البتہ ان کا نام بھی طبری کی پیروی میں باقی رکھا ہے۔ واللہ اعلم کیونکر؟

نہ صرف ابن عباس بلکہ ابن ابوبکر بھی!

بہر حال ابن عباس کا ذکر اس نہرست میں قطعی طور پر غلط ہے اور صرف ابن عباس کا نام نہیں غلط ہے بلکہ عبد الرحمن بن ابی بکر کا نام بھی محلِ غور ہے کہ آیا تاریخی اعتبار سے یہ نام ۶ھ کے واقعات کی نہرست میں شامل ہو سکتا ہے یا نہیں؟ حضرت عبد الرحمن بن ابی بکر کا سن وفات عام طور پر ۳۵ھ مانا گیا ہے۔ خود ابن اثیر کی یہی روایت ہے چنانچہ اختلافی گفتگوؤں کا لمبا چوڑا قصہ پورے ڈھائی صفحے میں بیان کرنے کے بعد آخر میں وہ یہ لکھنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ :-

و ذکر عبد الرحمن بن ابی بکر اور اس قصے میں عبد الرحمن بن ابی بکر
لا یتقیم علی قول من یجعل کا ذکر ان لوگوں کے قول کے مطابق

یعنی مقام نخلہ کے ایک صاحب۔ معجم البدان میں نخلہ نام کے دو مقام ہیں۔ ایک نخلہ شامیہ اور دوسرا نخلہ محمودیہ ۵۶۷ھ بمیدادیشن (واللہ اعلم یہاں کونسا نخلہ راہ ہے۔ ۳ ج ص ۲۳۶ -

وفات، سنت ثلاث و خمسين
 و انما يصح علي قول من يجعلها
 بعد ذلك الوقت
 ٹھیک نہیں بیٹھتا جو ان کا سنہ وفات
 ۵۳ھ بتاتے ہیں۔ یہ صرف ان لوگوں
 کے قول پر ٹھیک بیٹھے گا جو ان کا
 سن وفات اسکے بعد بتاتے ہیں۔

ہمارے سامنے جو کتابیں ہیں ان میں صرف ابن کثیر کی البدایہ والنہایہ میں یہ قول
 ملتا ہے کہ حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر کا سن وفات ۵۸ھ ہے اور اس کو وہ کشیر
 من علماء التاریخ "کا قول بتاتے ہیں مگر نام کسی ایک کا نہیں لیتے۔ جب کہ اس کے
 مقابل ۵۳ھ کے قول میں واقدی کا نام ہے، محمد بن سعد کا نام ہے اور ابو سعید وغیرہ کا
 نام ہے۔ اس "وغیرہ" میں ہم ابن قتیبہ کی المعارف کا اضافہ کرتے ہیں۔

اور خود ابن کثیر کی البدایہ والنہایہ ہی میں اس کا ایک ذرنی قرینہ پایا جاتا ہے کہ
 ۵۸ھ کا قول صحیح نہیں ہے۔ اور وہ قرینہ یہ ہے کہ ۵۸ھ کے ذنیات (OBITUARIES)

ہی میں ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کا نام بھی آتا ہے۔ چنانچہ بھائی بہن کے
 یہ دونوں نام البدایہ والنہایہ میں پہلو پہلو موجود ہیں اور اسی کے ساتھ حضرت عبدالرحمن
 کے تذکرہ وفات میں یہ بتاتے ہوئے کہ ان کی وفات مکہ کے راستے میں مکہ سے
 ۶- یا ۱۲ میل کے فاصلہ پر ہوئی تھی جہاں سے ان کو مکہ لے جایا گیا اور بالائی مکہ میں
 دفن کیا گیا۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ:-

فلما قدمت عائشۃ مکة
 زارتہ و قالت لو شہدتک
 لم ابلک علیک ولو کنت عندک
 پس جب حضرت عائشہ مکہ آئیں تو قبر
 پر گئیں اور کہا کہ میں اگر (تمہاری
 موت کے وقت) موجود ہوتی تو نہ

لہ ج ۳ ص ۲۵۲ ۵ ج ۸ ص ۵۹ طبع مطبعة السعادة۔ مصر ۳ ص ۷۶
 طبع اول مطبعة اسلامیہ ازہر، قاہرہ -

لما نقلك من موضع الذی روتی اور تم کو اس جگہ سے منتقل بھی
متّ فیہ لہ نہ کرتی جہاں تمہاری موت واقع
ہوئی تھی۔

اس عبارت سے یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ اپنے بھائی عبدالرحمن کی خبر
وفات سن کر مکے گئی تھیں بلکہ عبارت کا تقاضا یہ ہے کہ مکہ ان کا جانا ہو تو وہ بھائی کی
قبر پر بھی گئی تھیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ازواجِ مطہرات کا مکے
جانا اگر ہوتا تھا تو وہ صرف حج کے لیے ہوتا تھا ۵۸ھ میں حج کا موسم حضرت عائشہؓ
نے پایا نہیں۔ اس لیے کہ ان کی وفات کا ہدیہ رمضان اور قبول بعض شوال قرار دیا گیا
ہے، جیسا کہ البدایہ والنہایہ میں مذکور ہے۔ پس اگر یہ واقعہ ہے کہ حضرت عائشہؓ اپنے
بھائی عبدالرحمن کی قبر پر گئیں تو ضروری ہے کہ حضرت عبدالرحمن کی موت ۵۷ھ کے
حج سے پہلے کا واقعہ ہو۔ پس اس لیے ۵۸ھ سن وفات نہیں ہو سکتا۔

بہر حال یہ بات مشکوک ہے کہ ۵۶ھ میں یزید کی ولی عہدی سے اختلاف کرنے
والے حضرات میں عبدالرحمن بن ابی بکرؓ بھی ہوں۔ ہاں اگر الاصابہ فی تمییز الصحابہ
(از ابن حجرؒ) کی روایت صحیح ثابت ہو جائے جس کے مطابق حضرت عبدالرحمن کا سن
وفات ۵۶ھ ہوتا ہے اور وفات کا واقعہ حضرت معاویہ سے گفتگو کے بعد پیش آیا ہو
تو پھر یہ بیان صحیح ہو گا کہ حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ بھی ان صحابہ میں شامل تھے جنہوں نے
یزید کے لیے ولی عہدی کی بیعت سے انکار کیا۔ مگر اس گنجکک کا کیا کیا جائے کہ اس
روایت کے متصلاً بعد ابن حجر اس روایت کی تائید میں مؤرخ ابن سعد وغیرہ کا جو بیان پیش
کرتے ہیں اس میں جہاں یہ ہے کہ حضرت عبدالرحمن کا انتقال اسی سال ہوا جس سال

لہ البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۸۹ ۲ ج ۸ ص ۹۲۔ ۳ ص ۱۶۹ مطبع شریفیہ۔ ابن حجر کی بیان کردہ
اس روایت میں حضرت عائشہؓ کے سفر مکہ کی بابت یہ صراحت بھی پائی جاتی ہے کہ یہ سفر حج کا سفر تھا۔

حضرت معاویہ زبیر کی ولی عہدی کے سلسلے میں حجاز آئے تھے، وہیں یہ بھی ہے کہ۔

ومات عائشۃ بعد لا بسنتہ اور عائشۃ کا انتقال ان کے سال بھر

سنت تسع و خمسين۔ بعد ۵۹ء میں ہوا۔

یعنی اب حضرت معاویہ کے سفر کا سنہ ۵۶ء کے بجائے ۵۸ء ہو گیا حالانکہ وہ منفقہ

طور پر ۵۶ء ہے۔

بہتر ہے کہ اس گنجلک مسئلے کو اب چھوڑ ہی دیا جائے کیونکہ اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں کہ عبدالرحمن بن ابی بکرؓ اس اختلاف میں شریک تھے یا نہیں شریک تھے۔ مسئلے میں چونکہ شک کا پہلو سامنے آ گیا تھا اس لیے ایک طالب علمانہ خواہش یہ تھی کہ صفائی ہو جائے مگر معلوم ہوا کہ آسان نہیں ہے۔ مزید کافی وقت لگ سکتا ہے جس کی گنجائش سردست نہیں۔ اس لیے اس ضمنی مسئلے کو چھوڑ کر اب ہم اصل مسئلے پر آتے ہیں یعنی اختلاف کی جو کہانیاں بیان کی جاتی ہیں دیکھا جائے کہ ان میں کہاں تک تصدیق

ابن کثیر کا بیان

اختلاف کی کہانی کا بیان اس روایت میں بھی ہے جس کا ذکر ابھی اوپر اس حوالے سے گزرا ہے کہ اس کے بنیادی راوی ایک نامعلوم شخص ہیں جنہیں ”مقام تخلص کے ایک صاحب“ کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔ مگر اس روایت والی کہانی میں ایک تشنگی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کہیں بیچ سے شروع کر دی گئی ہے، شروع کی کچھ کڑیاں رہ گئی ہیں۔ اس تشنگی کو ابن کثیر کا بیان دور کرتا ہے۔ اگرچہ اس میں اختصار ہے اس لیے ہم ابن کثیر کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ زیاد کے مشورے کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں :-

” پس جب زیاد کا انتقال ہو گیا — اور یہ اسی سن کی

بات ہے۔ تو معاویہ نے ولی عہدی کے لیے کاروائی شروع کر دی۔ یزید کے لیے سعیت طے کی اور تمام اطراف میں اس کے لیے لکھا۔ پس مملکت کی تمام اقلیموں میں لوگوں نے بیعت کر لی، سوائے عبدالرحمن بن ابی بکرؓ اور عبداللہ بن عمرؓ، حسین بن علیؓ، عبداللہ بن زبیر اور ابن عباسؓ کے۔ اس پر معاویہ نے عمرے کے عنوان سے مکہ کا سفر کیا اور مکہ سے لوٹتے ہوئے جب ان کا گزریں میں ہوا تو انہوں نے ان پانچوں میں سے ہر ایک کو الگ الگ بلایا اور ڈرایا دھمکا۔ سو ان سب میں سب سے زیادہ سخت اور بے باک جواب دینے والے عبدالرحمن بن ابی بکرؓ تھے اور سب سے زیادہ نرم کلام والے عبداللہ بن عمرؓ۔ پھر معاویہ نے ایک خطبہ دیا اور اس وقت یہ پانچوں ان کے منبر کے نیچے موجود تھے۔ اس خطبہ کے بعد لوگوں نے یزید کی (ولی عہدی کی) بیعت کی۔ یہ پانچوں بیٹھے رہے، انہوں نے موافقت کی اور نہ کوئی اختلاف ظاہر کیا۔ اس لیے کہ یہ ڈرائے دھمکائے جا چکے تھے۔ پس ساری مملکت میں یزید کی باقاعدہ بیعت ہو گئی اور تمام علاقوں سے وفود (اس کی توثیق کے لئے) یزید کے پاس پہنچے۔

طبری کی روایت

طبری کی روایت میں اس بیان کا اول و آخر نہیں ہے۔ صرف وہ مکالمہ ہے جو حضرت معاویہ اور ان اختلاف کرنے والے حضرات کے درمیان ہوا، جس کی تفصیل ابن کثیر نے نہیں دی محض حوالہ دیا ہے۔ وہ مکالمہ یہ تھا :-

”جب معاویہ آئے تو انہوں نے حسین بن علی کو بلوایا اور کہا کہ بیعتیے، سوائے

لے یہ عبارت اوپر گزر چکی ہے اور ہم وہاں تنبیہ کر چکے ہیں کہ یہ سہو ہے زیاد کا سن وفات ۵۴ھ ہے۔

۲۷ البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۸۶ -

ان پانچ آدمیوں کے جن کی قیادت تم کرتے ہو، اور سب لوگ اس معاملے میں متفق ہو چکے ہیں، تو بتاؤ کہ اس اختلاف کی تمہیں کیا ضرورت پیش آرہی ہے؟ حسینؑ نے جواب میں پوچھا: ”میں ان کی قیادت کر رہا ہوں؟“ کہا: ”ہاں تم قیادت کر رہے ہو۔“ حسین نے کہا: ”اچھا تو ان کو آپ بلا دیجئے۔ وہ اگر بیعت کر لیں تو آپ دیکھیں گے کہ میں بھی ان میں کا ایک ہو جاؤں گا، ورنہ پھر آپ میرے بارے میں تیز نہ ہوں۔“ معاویہ نے کہا: ”تم ایسا کرو گے؟“ کہا: ”ہاں بالکل۔“ اس پر معاویہ نے ان سے اقرار مانگا کہ وہ اس بات چیت کو کسی پر ظاہر نہیں کریں گے۔ حسین نے بچنے کی کوشش کی۔ مگر بالآخر قول دے دیا۔ وہ نکلے تو راستے میں ابن زبیر نے ایک آدمی بٹھا رکھا تھا۔ اس نے کہا کہ آپ کے بھائی ابن زبیر پوچھتے ہیں کہ بڑے میاں سے کیا بات ہوئی ہے؟ حسین نے بچنا چاہا مگر اس آدمی نے پیچھے پڑ کے کچھ نہ کچھ ان سے نکلوا ہی لیا۔ حسین کے بعد معاویہ نے ابن زبیر کو بلاوا بھیجا اور ان سے بعینہ یہی بات ہوئی۔ جو حسین سے معاویہ نے کہا تھا وہی ابن زبیر سے کہا اور جو جواب حسین نے دیا تھا بالکل وہی ابن زبیر نے دیا۔ معاویہ نے ان سے بھی اقرار مانگا کہ کسی کو بتاؤ گے نہیں۔ ابن زبیر نے اس پر کہا کہ امیر المؤمنین ہم آپ حرمِ الہی میں ہیں۔ اور یہاں آپ سے اقرار گویا اللہ سے اقرار ہے اور یہ بڑی بھاری بات ہے، یہ میں نہیں کر سکتا ہوں۔ اس کے بعد وہ گئے تو عبداللہ بن عمر کو بلاوا گیا۔ ان سے معاویہ نے ذرا نرم بات کی اور یہ کہا کہ ”دیکھو میں ڈرتا ہوں کہ اپنے بعد امتِ محمدؐ کو ان بکریوں کی طرح چھوڑ جاؤں جن کا کوئی چرواہا نہ ہو۔“ اور تمہیں معلوم ہے کہ سب لوگ بیعت کر چکے ہیں لہٰذا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکہ مکرمہ کا واقعہ ہے۔

صرت وہ پانچ نفر باقی ہیں جن کی قیادت تم کرتے ہو۔ آخر تمہیں کیا ضرورت پیش آکر ہی ہے؟ ابن عمر نے جواب دیا کہ میں تمہیں اس مقصد کی ایسی صورت بتاؤں کہ جس سے کوئی برائی بھی نہ آوے اور امت میں فتنہ و فساد کا سدباب بھی ہو جائے، کہا ضرور بتاؤ۔ کہا تم جمع میں بیٹھو میں آؤں گا اور اس بات پر تمہاری بیعت کروں گا کہ تمہارے بعد جس شخص پر بھی امت متفق ہوگی، میں اس سے بیعت کر لوں گا اگرچہ وہ ایک حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو، معاویہ نے کہا تم ایسا کرو گے؟ کہا بے شک۔ اس کے بعد (حرم سے) گھر یعنی قیام گاہ پر آگئے اور عبدالرحمن بن ابی بکر کو بلوایا اور کہا کہ ابن ابی بکر تم کس برتنے پر میری مخالفت کے پڑے ہو؟ ابن ابی بکر نے جواب دیا میں اس میں خیر دیکھتا ہوں، کہا میں تمہیں قتل کر دوں گا، جواب ملا کہ اگر تم نے ایسا کیا تو تم پر دنیا میں اللہ کی لعنت ہوگی اور آخرت میں دوزخ تمہارا ٹھکانہ۔ ابن عون کہتے ہیں نخلہ والے آدمی نے (پانچویں شخص) ابن عباس کا کوئی ذکر اس مکالمے کے سلسلے میں نہیں کیا۔“

ایک سوال اور اس کا حل

طبری کی اس روایت کو پڑھ کر لازمًا یہ سوال پیدا ہونا چاہیے کہ عبدالرحمن بن ابی بکر کی کیا خصوصیت تھی کہ ان سے حضرت معاویہ نے بہت کڑے اور کڑے انداز میں بات کی۔ جب کہ دیگر افراد کے ساتھ ان کا انداز گفتگو یہ نہیں تھا؟ اس سوال کا کچھ حل شاید ابن اثیر کے بیان سے نکلے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب زیاد کی موت کے بعد معاویہ نے یزید کے لیے ولی عہدی کی بیعت حاصل کرنے کا عزم کر لیا تو سب سے پہلے تو انھوں نے

لے طبری ج ۶ ص ۱۶۰۔

عبداللہ بن عمر کو ہوا کرنے کی کوشش کی جس میں ان کو ناکامی ہوئی۔ بعد ازاں میں نے
کے گورنر مروان بن حکم کو لکھا کہ :

”میسری عمر بہت ہو گئی ہے، ہڈیاں گھسل رہی ہیں اور میں

ڈرتا ہوں کہ میرے بعد امت میں (اقتدار کے مسئلے پر) اختلاف رونما ہو اس

لیے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اپنے بعد کے لیے کسی آدمی کو نامزد کر جاؤں،

لیکن میں یہ نہیں پسند کرتا کہ یہ کام ان لوگوں کے مشورے کے بغیر کر لوں جو تمہارا

پاس ہیں (یعنی اہل مدینہ) پس تم یہ میری بات ان کے سامنے رکھو اور ان کے

جواب سے مجھے آگاہ کرو۔ چنانچہ مروان نے یہ مسئلہ اہل مدینہ کے سامنے

رکھا اور ان لوگوں نے جواب دیا کہ ہاں بالکل مناسب بات ہے ہم بھی پسند

کریں گے کہ وہ ہمارے لیے کسی کو نامزد کریں اور اس میں کوتاہی نہ کریں۔

مروان نے یہ روداد حضرت معاویہ کو بھیج دی۔ وہاں سے جواب میں یزید کا

نام آیا۔ مروان نے لوگوں کو جمع کر کے بتایا کہ امیر المؤمنین نے آپ کے لیے

پوری خیر خواہی کے ساتھ اپنے فرزند یزید کو اپنے بعد کے لیے انتخاب کیا ہے۔

یہ سن کر عبدالرحمن بن ابی بکر کھڑے ہو گئے اور بولے کہ مروان تم بھی جھوٹے اور

معاویہ بھی جھوٹے۔ تم دونوں کی نیت اس انتخاب میں امت محمدیہ کے

ساتھ بھلائی کی نہیں بلکہ تم لوگوں کی نیت یہ ہے کہ خلافت کو ہرقلیت بنا دو۔

کہ ایک ہرقل مرا تو دوسرا آگیا..... اسی طرح حسین ابن علی، عبداللہ بن زبیر اور ابن عمر

نے بھی اس تجویز کی مخالفت کی۔ اور مروان نے پھر اس کی اطلاع معاویہ کو دی۔

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبدالرحمن کے ساتھ حضرت معاویہ کی شدت کے پس منظر

میں حضرت عبدالرحمن کی یہ شدت تھی جو ابن اثیر کی مذکورہ بالا روایت میں نظر آتی ہے۔

نہ یہ شاہانِ روم کا لقب تھا۔ ۲ ابن اثیر ج ۳ ص ۲۵

جبکہ دوسروں (حضرت حمین وغیرہ) نے یہ شدت نہیں اختیار کی تھی۔ یہ واقعہ پہلے پیش آچکا تھا اس کے بعد حضرت معاویہ نے حجاز کا سفر کیا ہے۔ شاید اسی لیے حضرت عبدالرحمن کے ساتھ ان کا انداز گفتگو مختلف تھا۔

وفود کی کہانی

ابن اثیر ہی کے بیان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مروان کو جب حضرت معاویہ نے یزید کا نام اپنے ولی عہد کی حیثیت سے مدینہ بھیجا تھا کہ اس کے لیے اہل مدینہ کی منظوری حاصل کریں تو ساتھ میں یہ بھی ہدایت کی تھی کہ مدینے سے کوئی وفد بھی اس منظوری کے اظہار کے طور پر دمشق آنا چاہیے۔ اور اسی طرح دوسرے گورنروں کو بھی ان کے علاقے سے متعلق لکھا تھا۔ چنانچہ یہ وفد پہنچے۔ ابن اثیر نے ان میں سے خاص طور پر دو کا ذکر کیا ہے۔ ایک اہل مدینہ کا وفد جس میں سے محمد بن عمرو بن حزم کا نام دیا گیا۔ دوسرا اہل بصرہ کا وفد جس میں احنف بن قیس کا نام مذکور ہوا ہے۔

ابن اثیر نے ان وفود کے اجتماع کی کاروائی جس طرح دی ہے اس سے یہ تاثر ہوتا ہے کہ اس اجتماع سے جو مقصد حضرت معاویہ کا تھا کہ یزید کی ولی عہدی پر تمام مملکت کے نمائندوں کی ہر اتفاق ثابت کرالی جائے۔ یہ مقصد اس اجتماع سے تو حاصل نہیں ہو سکا بلکہ ایک انتشاری کیفیت کے ساتھ اجتماع برخواست ہوا۔ البتہ بعد میں حضرت معاویہ نے لطف و عطا اور مدارات کے ذریعہ لوگوں کو ہموار کیا اور اکثریت سے یزید کی ولی عہدی پر بیعت حاصل کر لی۔ اور اس کے بعد حجاز کا سفر کیا تاکہ وہاں جو لوگ بیعت سے انکار کر رہے ہیں ان کا انکار ختم کرایا جائے۔ انہیں سمجھایا جائے کہ اب جب کہ اور سب ہی لوگ متفق ہو چکے تو کچھ کا اختلاف جاری رہنا مناسب نہیں۔

۱۔ ابن اثیر ج ۳ صفحہ ۲۵ ۲۔ ایضاً صفحہ ۲۵۱

یہی وہ سفر ہے جس کی روداد طبری کے نیز البدایہ والنہایہ کے حوالے سے اوپر پڑھی جا چکی ہے۔

سوالیہ نشان ؟

یہ بات کوئی ناممکن نہیں ہے کہ وفود کا اجتماع ناکام رہا ہو اور نہ یہ کہ اس کا تدارک حضرت معاویہ نے مدارات و عطیات اور تالیفات سے کیا ہو۔ ایک آدمی اگر حضرت معاویہ سے حسن ظن رکھتا ہے تو وہ اس بارے میں بلا کسی دقت کے یوں سوچ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ انھوں نے نیک نیتی سے اور اچھے مقصد سے کیا تھا۔ لیکن اجتماع کی جو روداد ابن اثیر نے بیان کی ہے اس کا منطقی تقاضا یہ ہے کہ اجتماع اپنے مقصد کے اعتبار سے کامیاب رہا ہو، نہ کہ ناکام۔ جبکہ مدارات و عطیات سے کام لینے کی بات جو انہوں نے بلا کسی ثبوت، مثال اور حوالے کے صرف ایک فقرے میں بیان کر دی ہے وہ اپنے لیے کسی وزن کا تقاضہ نہیں کرتی۔ بلکہ داد و دہش کا جو تنہا ایک واقعہ انھوں نے اس قصے کے بالکل شروع میں بیان کیا ہے وہ تو اس بات کا ثبوت ہے کہ داد و دہش سے کچھ کام نہیں بنا۔

اجتماع کی روداد جو ابن اثیر نے بیان کی ہے وہ یہ ہے :-

ثم ان معاوية قال للضحاک بن قیس الفهري لما اجتمع
 پھر جب وفود جمع ہو گئے تو معاویہ نے
 ضحاک بن قیس سے کہا کہ میں اولاً

لہ لکھا ہے کہ زیاد کی موت کے بعد یزید کی ولی عہدی کا تہیہ کیا تو حضرت عبداللہ بن عمر کو ایک لاکھ درہم بھیجے جو انہوں نے پیشہ ہونے کے بعد لینے سے انکار کر دیا کہ یزید کی ولی عہدی کے سلسلے میں ہیں ۲۵۔
 ۳۶۔ کم عمر صحابہ میں سے ہیں۔ بعض احادیث کی روایت بھی ان سے ہے۔ حضرت معاویہ کے خاص الخالص حامیوں میں تھے۔ ۵۶ھ کے اس اجتماع کے وقت کوفہ کے گورنر تھے۔ بعد میں (بقیہ مشاغل ۱۰۳)

الفود عنداً: ائی متکلمنا اذا	یکچھ کہوں گا پھر جب میں خاموش ہوں
سکتُ فکن انت الذی	تو تم کھڑے ہو، یزید کی بیعت کی تحریک
تدعو الی بیعتہ یزید و تحثنی	کر دو اور مجھے اس کے لیے ترغیب دو
علیہا فلما جلس معاویة	یس جب معاویہ خطاب کرنے بیٹھے
للناس تکلم فعضم امر الاسلام	تو اسلام کی عظمت، خلافت کی حرمت
و حرمة الخلفة و حقها و ما	(SANCTITY) اور اس کا حق اور
امر الله به من طاعة و لالة	اولوالامر کی اطاعت کے بارے میں اللہ
الامر ثم ذکر یزید و فضله	کے احکام بیان کیے، پھر یزید اور اس
و علمه بالسیاسة و عرض	کی خوبیوں کا باخصوص اس کے بیانی
بیعتہ ففاض الضحاک	شعور اور آگاہی کا تذکرہ کر کے اسکی
فحمد الله و اثنی علیہ ثم	بیعت کا مسئلہ پیش کیا۔ اس کے بعد
قال: یا امیر المؤمنین انہ	ٹھیک اسی انداز سے ضحاک بولے،
لا بد للناس من والی بعدک	حمد و ثنا کے بعد کہا کہ امیر المؤمنین لازم
وقد بلونا الجماعۃ و الالفة	ہے کہ آپ کے بعد کے لیے صاحب
فوجدناهما احقن للدماء	امر کا تقرر ہو جائے تاکہ جماعت اور
واصلح للدماء و آمن	یکجہتی قائم رہے جس کی برکتیں ہم نے

(بقیہ حاشیہ ص ۱۰۳ کا) حضرت معاویہ نے ان کو دمشق میں انتظامیہ کی سربراہی پر ڈکی حضرت معاویہ کی نماز جنازہ انہیں پڑھائی
یزید کے زمانے میں یہ اپنے منصب پر برقرار ہے یزید کی موت کے بعد انکی رائے تھی کہ کس لوگ عبداللہ بن زبیر کی بیعت کر لیں
اور قریب تھا کہ لوگ بات چل جاتی اور اسلامی جمیعت پھر سے بحال ہو جاتی مگر ابن زیاد نے مروان کو امیدوار بنا کے
کھڑا کر دیا۔ ۶۴ھ میں مروان کے مقابلے میں عبداللہ بن زبیر کی طرف سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔
اصابع ۳ ص ۲۴۴ سیر اعلام النبلا ج ۳ ص ۲۴۱ تا ۲۴۵۔

السبل وخیرانی العاقبة	آزمائی ہیں کہ اس میں جانوں کی حفاظت
والایام عوج رواجع والله	ہے، راستوں کا امن ہے اور
کل یوم ہوفی شأن ویزید	عاقبت کی بھلائی ہے۔ زمانہ کی کج
بن امیر المؤمنین فی حسن	رقاری ہم سب پر روشن ہے اور
ہدیہ و قصد سیرتہ	اللہ کی شان بے نیازی بھی، میں سمجھتا
علی ما علمت و ہومن	ہوں کہ یزید بن امیر المؤمنین اس کام
افضلنا علماً و حلماً و اجناً	کے لیے نہایت موزوں ہیں، ان کے
رأیاً فلولہ عہدک و	حسن سیرت کا حال آپ پر عیاں ہے
اجعلہ لنا علماً بعدک	یزید علم، حلم اور رائے میں وہ ہم سب سے
ومفرغاً لیلجأ الیہ	قائم ہیں۔ پس ان کو اپنے بعد کیلئے
ونسکن فی ظلہ۔ ذکلم عمر و	نامزد کر کے ہمارے لیے ایک نشان
بن سعید الامتدق بنحو	و حکم اور ایک پناہ گاہ کا انتظام کیجیے۔
من ذالک، شم قام یزید	کہ جس کی پناہ اور سائے میں ہم فرار
بن المقفع العدری فقال	پکڑیں پھر عمر بن سعید الامتدق بولے

اے کاتبنا بعین میں ہیں۔ بعض نسخہ نگاروں میں شمار کیا ہے لیکن یہ صحیح نہیں (اصابہ ابن حجر) ابن کثیر نے ذکر میں لکھے ہیں کہ ان من سادات المسلمین ومن الکرماء المشہورین (رج ۸ ص ۳۱۱) اور یہی اوصاف انکے والد ماجد سعید بن العاص کے تھے جو حضرت عثمان کی تربیت میں رہے تھے اور حضرت عثمان کے زمانے میں کوفے کے گورنر رہے پھر حضرت معاویہ کے زمانے میں بھی اولاً کوفے کی پھر مدینے کی گورنری پر رہے (اصابہ ج ۲) عمرو بن سعید اس اجتماع کے وقت کسی عہد پر تھے یا نہیں، یہ معلوم نہیں ہو سکا البتہ بعد میں وہ مکے اور مدینے کی گورنری پر رہے ہیں۔ حادثہ ذکر بلا کے وقت وہ پورے حجاز کے گورنر تھے۔ واقعہ کے بیان میں ان کا ذکر آئے گا۔ غالب گمان یہ ہے کہ ۶۷ھ کے اس اجتماع کے وقت بھی وہ برسر عہدہ ہوں اور جیسا کہ دستور تھا ان کے والد سعید کے ۵۳ھ یا ۵۴ھ میں انتقال کے بعد انھیں کوئی جگہ دے دی گئی ہو۔

هذا امير المؤمنين و اشار
 الى معاوية فان هلك فهذا
 و اشار الى يزيد و من ابى
 فهذا و اشار الى سيفه
 فقال معاوية اجلس فانت
 سيد الخطباء و تكلم من
 خضر من الوفود فقال معاوية
 لا حنف ما تقول يا ابا بجر
 فقال مخافكم ان صدقنا
 و نخاف الله ان كذبنا
 و انت يا امير المؤمنين اعلم
 بيزيد في ليله و نهاره
 و سره و علانيته و
 مدخله و مخرجه
 فان كنت تعلمه الله تعالى
 و لامة رضاً فلا تساور
 فيه و ان كنت تعلمه

اور کچھ سبب باتیں انہوں نے بھی کیں۔
 اس کے بعد بیزید بن مہدی نے عرض کی کہ
 ہوئے اور معاویہ کی طرف اشارہ کر کے
 بولے یہ امیر المؤمنین ہیں ان کو اگر
 کچھ ہو جائے تو بیزید کی طرف اشارہ
 کر کے بولے کہ۔ پھر یہ ہیں۔ اور اس
 کے بعد اپنی تلوار کی طرف اشارہ کیا
 کہ جو انکار کرے اس کے لیے یہ ہے
 معاویہ نے کہا بس بیٹھ جاؤ تم
 سب بڑے خطیب ہو، اس طرح
 تمام وفود نے اظہار خیال کیا۔ حنف
 نہیں بولے تھے معاویہ نے ان کے
 مخاطب ہو کر کہا کہ ابو بکر کینیت ہے
 تم بھی تو کچھ کہو۔ اس پر انہوں نے
 کہا کہ اگر سچ کہوں تو آپ لوگوں کا
 خوف ہے اور جھوٹ میں اللہ کا
 خوف۔ امیر المؤمنین مختصر یہ ہے کہ

لہ ان صاحب کمال معلوم نہ ہو سکا۔ ۲۰ حنف بن قیس بصری تابعین میں ہیں قتنے کے وقت میں
 حضرت علی کے خاص حامیوں میں تھے اپنی نیک سیرت، علم و قار اور دانش کی وجہ سے حضرت معاویہ کے
 دور میں بھی محترم اور عزیز رہے۔ ابو بکر کینیت تھی اور کینیت سے مخاطب کرنا عرب میں تعظیم کی علامت تھی۔
 (ابن اثیر ج ۳، اصابع اول)

غیر ذالک فلا تزودہ الذی
وانت صائر الی الآخرۃ
وانما علینا ان نقول سمعنا
واطعنا، وقام رجل من
اهل الشام فقال ما ندري
ما تقول هذه المعديۃ
العراقیۃ وانما عندنا
سمع وطاعة وضرب
وازدلائل فتفرق الناس
یحكون قول الاحنف لہ

آپ یزید کے لیل دنہار اور ظاہر و
باطن سے واقف ہیں۔ اگر آپ سمجھتے
ہیں کہ اس کے انتخاب میں اللہ اور
امت کی رضا ہے تو کسی سے مشورے کی
کوئی ضرورت نہیں۔ اور اگر ایسا نہیں
سمجھتے تو پھر اب جب آپ کا جمل چلاؤ،
ہے اس کی شخص دنیا کا بند و بست
مت کیجئے۔ اور ویسے آپ جو بھی طے
کریں گے ہمارا فرمن تو سمعنا واطعنا
ہے، اور اس پر ایک شامی کھڑا ہوا
اور بولا ہم نہیں سمجھتے کہ یہ عرانی زبان
کہنا کیا چاہتی ہے۔ ہم تو بس سمع
وطاعت جانتے ہیں اور سیدھی
سیدھی باتیں۔ اس پر لوگ منتشر ہو گئے
اس طرح کہ احنف کا قول ان کی
زبان پر تھا۔

اب ذرا غور کیجئے کہ وفود کا اجتماع حضرت امیر معاویہ منفقہ کر رہے ہیں۔ وفود نیچھے
ہوئے ان کے گوزنروں کے ہیں۔ ماحول دمشق کا ہے۔ سب تقریریں یزید کی ولی عہدی
کی حمایت میں ہو رہی ہیں۔ بعض تقریروں میں بڑی صفائی، صراحت اور سنجیدگی سے آسے
اسی سیرت اور ان صفات کا حامل بتایا جا رہا ہے جو منصب خلافت کو درکار ہیں۔ ایسے

لہ ابن اثیر ج ۳ م ۲۵۱ - ۲۵۰ -

ماحول میں صرف ایک تقریر، نہایت مختصر حضرت احف بن قیس کی ہوتی ہے، جو بہت محتاط اور بند بند طریقے پر کچھ مختلف رائے دیتے ہیں۔ مگر ساتھ میں یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ جو بھی فیصلہ امیر المؤمنین کر دیں گے ہم اس کی مخالفت نہیں کریں گے۔ فرمانبرداری کریں گے۔ پھر اس تقریر کے بعد ایک شامی کھڑے ہو کر کہتا ہے کہ یہ کیا "نیسے دروں نیسے بروں" کا انداز ہے۔ ہم شامی صرف ایک اور سیدھی بات جانتے ہیں، سمع اور طاعت !

کیا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ایسے ماحول میں یہ اجتماع بلا کسی فیصلے کے انتشار پر ختم ہوا ہوگا جیسا کہ ابن اثیر بتاتے ہیں؟ بظاہر یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے اور اس لیے وہ نتیجہ جو ابن اثیر بتاتے ہیں کہ :-

استوثق اکثر الناس
وبایعہ ۱۰۰
لوگوں کی اکثریت نے ٹوٹتی کر لی
اور بیعت کر لی۔

یہ نتیجہ اسی اجتماع کا ہونا چاہیے جو اسی مقصد کے لیے بلایا گیا تھا کہ اس خیالی مدارت و عطا کا جس کا کوئی ثبوت اور حوالہ دیئے بغیر ابن اثیر اس نتیجہ کو اسی کا کرشمہ ٹھیراتے ہیں۔ دمشق کے اس اجتماع کی کاروائی کے ذکر سے ہمارا مقصد صرف اُس کمی کو پورا کرنا تھا جو طبری کی روایت میں رہ گئی تھی۔ تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اس روایت کے مطابق حضرت معاویہ نے جاز کا سفر کر کے حضرت جیس بن اور عبداللہ بن زبیر وغیرہ سے جو یہ کہا کہ سب لوگ یزید کی ولی جہدی کے لیے بیعت کر چکے ہیں تم ہی لوگ کیوں مخالفت کر رہے ہو؟ تو اس کا پس منظر کیا تھا، کب اور لوگوں نے بیعت کر لی تھی اور کس طرح یہ کاروائی ہوئی تھی؟

۱۰۰ کچھ اسی طرح کی بات وفد مدینہ کے محمد بن عمرو بن حزم سے بھی منسوب کی گئی ہے مگر اسے وفد کے اجتماع کی کاروائی میں نہیں، اس کاروائی سے باہر دکھایا گیا ہے اجتماع میں انکی شرکت نہیں دکھائی گئی۔ اس لیے ہم نے اس کا ذکر یہاں نہیں کیا ہے۔

۱۰۰ ایضاً ص ۲۵

ابن اثیر اور حضرت معاویہؓ کا سفر حجاز

ابن اثیر کے بیان میں معاملہ کی ایک اچھی خاصی — یا کم از کم فی الجملہ — معقول صورت کو جس طرح خواہ مخواہ بد صورت کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ ابھی ہم نے دیکھی اور یہی وہ باتیں ہیں جنہوں نے ہماری تاریخ کے اس باب کو قطعی بیکطرفہ اور نامنصفانہ رنگ دیدیا ہے۔ اب اس کے بعد ابن اثیر کی زبانی حضرت معاویہ کے سفر حجاز کی روداد بھی سن لیجئے، اس میں ابن کثیر کے اس مجمل بیان کی جو ہم اوپر دے آئے ہیں — تفصیل ہے کہ جو — چار یا پانچ — اصحاب مخالفت کر رہے تھے ان کو حضرت معاویہ نے ڈرا دم کا کر خاموش کیا اور اسی تفصیل کے اجزاء کافی مشہور ہوئے ہیں حالانکہ ان کے بے تکچین کی انتہا نہیں ہے۔ اس کے باوجود ان کی شہرت و قبولیت کو ہم صرف اپنی روایات پرستی کی معراج کہہ سکتے ہیں۔

ابن اثیر بتاتے ہیں کہ جب "لطف و عطا اندازات" کے ذریعہ اکثر الناس کی اور خصوصاً اہل عراق و شام کی بیعت یزید کی ولی عہدی کے لیے حاصل کر لی گئی تو معاویہ نے ایک ہزار سواروں کے ساتھ حجاز کا رخ کیا چلتے چلتے مدینے کے پاس پہنچے تھے کہ اول آدمی جو نظر پڑا وہ حسین بن علیؓ تھے۔ معاویہ انہیں دیکھ کر بولے :-

لامرجباً ولا اہلاً بدنتہ استغفر اللہ! کون نظر آیا، قربانی کا اجرا
یند فرق دمھا واللہ مہریقھا۔ ہے جس کا خون اچھل رہا ہے اور
اللہ اسے بہائے گا۔

حسینؓ نے جواب دیا :-

لے اسی روایت پرستی کا تم اقبال نے کیا ہے۔
یہ امت روایات میں کھو گئی حقیقت خرافات میں کھو گئی

مهلًا فانی واللہ لست باہل ایسی درستی مت کیجئے، میں واللہ
لہذا المقالة۔ ایسی بات کا مستحق نہیں ہوں۔

معاویہ بولے، "اس سے بھی بڑی بات کے مستحق ہو"۔ پھر ابن زبیر نے اُنکو
دیکھ کر بولے "مکار گوہ جو اپنا سربل میں گھسالتی ہے اور دم پٹکا کرتی ہے
لیکن قریب ہے کہ دم سے پکڑ لی جائے گی اور کر توڑ دی جائے گی" اسے مجھ سے
دور کرو۔" چنانچہ ان کی سواری پر دو ہتھ مار کر راستے سے ہٹا دیا گیا۔ اس کے
بعد عبدالرحمن بن ابی بکرؓ نے معاویہ بولے "لامرحباً ولا اہلاً۔ بوڑھا ہے
جو سٹھیا گیا اور عقل سے پیدل ہوا"۔ یہ کہہ کر ان کو بھی راہ سے ہٹا دیا گیا۔ اور
پھر ہی سلوک ابن عمر کے ساتھ کیا گیا۔ تب یہ لوگ معاویہ کے ساتھ ساتھ
مدینہ کی طرف کوچیل دیئے۔ دراصل ایک وہ ان کی طرف کوئی التفات نہیں کر
ہے تھے۔ مدینہ پہنچ کر یہ لوگ معاویہ کے پیچھے پیچھے ان کی اقامت گاہ پر
بھی پہنچے۔ جہاں ان کا ان کی حیثیت کے مطابق استقبال نہیں
ہوا۔ تب یہ لوگ مدینہ چھوڑ کر مکے چلے گئے۔ معاویہ نے مدینہ میں ایک تقریر
کی جس میں خلافت کے لیے زید کی اہلیت اور دوسروں پر اس کی فوقیت بیان
کر کے مخالفت کرنے والوں کو دھمکایا کہ اسے اب برداشت نہیں کیا جائیگا
اس کے بعد ام المومنین حضرت عائشہؓ کے یہاں حاضری دی۔ جہاں ام المومنین
نے ان سے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ تم نے حسینؓ وغیرہ کو قتل کی دھمکی دی ہے؟
انہوں نے جواب دیا کہ ام المومنین یہ لوگ فی الواقع اس سے بالاتر ہیں۔
لیکن آپ مجھے یہ بتائیں کہ میں زید سے بیعت کر چکا ہوں اور ان لوگوں کے پاس
سب بیعت کر چکے ہیں، تو کیا اب یہ بیعت توڑ دی جائے؟ حضرت عائشہؓ نے

سے یہاں ایک بار پھر نوٹ کر لیجئے کہ ابن عباسؓ کا نام اس فہرست میں نہیں ہے۔

جواب دیا کہ نہیں، مگر ان کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ، مجھے امید ہے کہ جو تم چاہتے ہو وہی ہو جائے گا۔ معاویہ بولے بہت اچھا میں ایسا ہی کروں گا۔ پھر کچھ دن ٹھہر کر مکہ روانہ ہوئے۔ اور اب خواہش کہ ان چاروں رحضرت حسینؑ وغیرہ سے ملیں۔ جو کہ کتے ہی میں تھے۔ اس خواہش کا علم ان لوگوں کو ہوا تو وہ بطنِ مَرِّ (مَرِّ الظُّہْرَانِ) میں آکر ملے۔ سب سے پہلے ملنے والے حضرت حسینؑ تھے۔ انھیں دیکھ کر معاویہ بولے ”مرحباً و اہلاً یا ابن رسول اللہ و سید شباب المسلمین“ اور حکم دیا کہ ان کے لیے سواری لائی جائے۔ پس اب وہ سنوار ہو کر معاویہ کے ساتھ ساتھ چلے۔ علیؑ اب باقی تین کے ساتھ ہی معاملہ کیا۔ اور اب ان چاروں کے جلو میں اس طرح چلے کہ کوئی پانچواں اس زمرے میں شامل نہیں تھا۔ اور اسی شان کے ساتھ ان چاروں کو لے کر مکے میں داخل ہوئے، پھر جتنے دن رہے ہر دن نبی اکرامؐ، نبی احسانؑ تھا۔ اور دوسری کوئی بات نہیں تھی، حتیٰ کہ عمرے کے ارکان ادا ہو گئے اور چل چلاؤ کا وقت آنے لگا۔ تو ان چاروں نے آپس میں کہا کہ کسی دھوکے میں نہ آجانا۔ یہ سب جو ہو رہا ہے ہماری محبت میں نہیں ہو رہا ہے۔ ”مطلب سعدی دیگر است“ لہذا جواب سوچیے کہ جب مطلب کی بات ہم سے کہی جائے گی تو کیا کہنا ہے۔ پس ان لوگوں نے طے کیا کہ بڑے میاں مطلب کی بات کہیں گے تو ابن زبیر ان کو جواب دیں گے۔ چنانچہ وہ وقت آ گیا اور معاویہ نے ان کو طلب کر کے کہا کہ تمھارے ساتھ جو میرا رویہ رہا ہے وہ تم جانتے ہو، تم سے سترشتہ داریوں کا جو پاس و لحاظ مجھے رہا ہے وہ بھی تم پر عیاں ہے اور اس کے مقابلے میں جو تم لوگوں کی روش رہی ہے اس کے لیے میرا تحمل بھی تم سے مخفی نہیں۔ اب اس وقت بات بیزید کی ہے۔ وہ تمھارا بھائی ہے،

۱۔ مکے سے چار پانچ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں کا نام (معجم البلدان) اسکو وادی فاطمہ بھی کہتے ہیں۔

تھا! ابن عم سے چاہتا ہوں کہ خلافت کے عہدے کے لیے تم اسے آگے بڑھاؤ،
 رہے خلافت کے اختیارات 'عزل و نصب' تحصیل خراج و تقسیم دولت، وہ سب
 تمہارے ہاتھ میں ہو گا۔ یزید تمہارے آڑے نہیں آئے گا۔ یہ لوگ
 خاموش رہے، کچھ بولے نہیں۔ معاویہ نے دوبارہ کہا کہ تم کچھ جواب نہیں دیتے،
 پھر ابن زبیر سے مخاطب ہوئے کہ تم بولو۔ تم ہی ان کے خطیب ہو۔ ابن زبیر
 نے جواب دیا کہ میں تین باتیں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔

۱۔ اپنے بعد کے لیے ایسے چھوڑ جائیے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چھوڑ گئے
 تھے کہ کسی کا تقرر نہیں کیا، لوگوں نے ابوبکرؓ کو منتخب کر لیا۔

معاویہ بولے کہ آج تم میں کوئی ابوبکرؓ جیسا نہیں ہے پس اختلاف ہو گا۔
 ۲۔ ابن زبیر نے کہا کہ اچھا پھر ابوبکرؓ کی طرح کیجئے کہ خلیفہ نامزد کیا مگر اپنی اولاد
 یا حاندان کا نہیں۔

۳۔ یا عمرؓ کی طرح کیجئے کہ انتخاب خلیفہ کے لیے شوریٰ نامزد کر دی، مگر اس میں اپنی
 اولاد یا حاندان کے کسی فرد کو نہیں رکھا۔

معاویہ نے کہا اور کوئی صورت تمہارے پاس پیش کرنے کو نہیں ہے! ابن زبیر
 بولے کہ نہیں۔ باقی لوگوں سے پوچھا تو انہوں نے بھی یہی جواب دیا۔

معاویہ نے کہا اچھا اب بات چیت ختم ہوئی۔ میں نے چاہا تھا کہ تم
 لوگوں کی رضامندی حاصل کر لوں۔ مگر معلوم ہوا کہ یہ نہیں ہو سکے گا۔ پس
 حجت تمام ہوئی۔ اب کوئی مجھے الزام نہ دے۔ اب تک میرا معاملہ یہ تھا کہ میں
 تقریر کرنے کھڑا ہوتا اور تم میں سے کوئی بھی برسرِ عام میری تکذیب کرنے کھڑا
 ہو جاتا تو میں اسے برداشت کر لیتا اور درگزر کر جاتا تھا۔ لیکن آج مجھے لوگوں
 میں کچھ کہتا ہے۔ اس موقع پر اگر تم میں سے کسی نے میری تکذیب کی تو

نجد اور مکہ کا نکلنے سے پہلے اور اس کے سر پر پہنچ چکی ہوگی۔ یہ کہہ کر اپنے محافظ دستے کے سربراہ کو بلایا اور کہا کہ ان میں سے ہر ایک کے اوپر اپنے دو آدمی تمشیر بکھن مسلط کرو۔ اور ہدایت کرو کہ اگر میری تقریر کے دوران ان میں سے کوئی کچھ بولے تو اس کی گردن اڑادیں۔ اس کے بعد معاویہ اور ان کے ساتھ میں یہ چاروں بھی چلے حتیٰ کہ معاویہ منبر پر پہنچے اور حمد و ثنا کے بعد کہا کہ یہ (حسین، ابن زبیر، ابن عمر، ابن ابوبکر، سادات مسلمین اور عمائدین ملت ہیں۔ جن کے مشورے ہی سے تمام کام انجام پاتے ہیں) انہوں نے زبیدی کی ولی عہدی قبول کی اور بیعت کر لی ہے۔ بس اب آپ سب لوگ بھی اللہ کا نام لے کر بیعت کریں۔ چنانچہ سب اہل مکہ نے بیعت کر لی۔ اور معاویہ نے اسی وقت سواری کھینچوائی اور مدینہ کو روانہ ہو گئے اب اہل مکہ نے ان لوگوں سے سوال کیا کہ آپ لوگ تو کہتے تھے کہ ہم ہرگز بیعت نہ کریں گے۔ یہ کیا ہوا؟ ان لوگوں نے کہا کہ نجد اہم نے بیعت نہیں کی ہے۔ لوگوں نے کہا پھر آپ نے تردید کیوں نہیں کی۔ اس آدمی کو بولنے کیوں دیا! بولے اس نے ہمارے ساتھ داؤں کھیلا اور ہم ڈر کے مارے نہیں بول سکے۔ ادھر معاویہ مدینے پہنچ گئے اور مدینے والوں نے بھی بیعت کر لی۔ یہ کام کر کے معاویہ شام روانہ ہو گئے اور بنی ہاشم کے ساتھ اپنے برتاؤ میں سختی شروع کی۔ (یعنی و ظالمت وغیرہ روک دیئے) اس پر ابن عباس دمشق پہنچے اور کہا کہ یہ کیا قصہ ہے؟ معاویہ نے کہا قصہ کیا ہوتا۔ وہ تمہارے حسین صاحب بیعت نہیں کر رہے ہیں اور تم لوگ ان سے کچھ نہیں کہہ رہے۔ ابن عباس نے کہا: معاویہ تم جانتے ہو کہ میں اگر چاہوں تو بعض ساحلی علاقوں میں جا کر ڈیرا ڈال دوں، اور وہاں کے لوگوں کو تمہارے خلاف کھڑا کر دوں۔ بولے نہیں نہیں ابن عباس تمہیں تمہارے و ظالمت دیئے جائیں گے۔ تمہیں راضی رکھا جائے گا۔

بلکہ پہلے سے زیادہ دیا جائے گا۔“

ایک لمحہ و فکر یہ

ذرا غور کیا جاتا چاہیے کہ اس پورے بیان میں سوائے ان دو تین جملوں کے جن کا تبادلہ ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ اور امیر معاویہ کے درمیان ہوا اور یا پھر سوائے اس مختصر گفتگو کے جو حضرت ابن زبیرؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان انتخاب خلیفہ کے موضوع پر ہوئی کوئی اور بات ہے جس کا کوئی مستحیدہ آدمی یقین کر سکے؟ امیر معاویہؓ کے لیے تو ہر جبری اور گری بات ہم نے لائق یقین فرض کر رکھی ہے۔ اس لیے ان کے مسئلہ اخلاق، حلم، مدارات، رکھ رکھاؤ وغیرہ کے علی الرغم مان لیجئے کہ وہ مدینہ کے پاس حسین بن علیؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور عبدالرحمن بن ابی بکرؓ کے ساتھ ایسی ہی بدخلقی سے پیش آئے جیسی بدخلقی مذکورہ بالا بیان میں دکھائی گئی ہے مگر کیا ایسی ہی آسانی سے یہ بھی ماننے کی چیز ہے کہ یہ معززین مدینہ امیر معاویہؓ کے ہاتھوں نہ صرف اس آخری درجے کی تذلیل و تحقیر کا نشانہ بنے پر بے چون و چرا راضی ہو گئے بلکہ ہل من مزید کہتے ہوئے پھر اُٹھی کے پیچھے لگے رہے، اور بار بار ان کے ہاتھوں تذلیل ہی کے جام پی کر کہیں ان کی سیری ہوئی یعنی ناراض ہو کر یا شرمندہ ہو کر مکہ چلے جانے کا خیال ان کو آیا۔۔۔ لیکن یہ ناراضگی یا شرمندگی بھی پھر کچھ دیر پائا ثابت نہ ہوئی جیسے ہی مکے کے قریب پہنچ کر امیر معاویہؓ نے ان کو یاد فرمایا یہ پھر دوڑ کے مکے سے باہر ہی ان کے استقبال کو پہنچ گئے اور پھر ان کی عنایتوں اور عطاؤں سے سرفراز ہونے کو یہ جانتے بوجھتے تیار ہو گئے کہ یہ سب بناوٹ اور زبرد کے لیے خواہش بعیت کی تمہید ہے!

استغفر اللہ۔ یہ وہی ابن عمرؓ، ابن ابوبکرؓ، ابن علیؓ اور ابن زبیرؓ ہیں جن کی عظمتوں کے کلمے

ہم پڑھتے ہیں؟ یا جس عظمت سے عاری ان کے ہم نام چند بولنے اور بالشتے —
یا سخرے؟ معاویہ دشمنی کا یہ اندھا پن تو دیکھے! —
اور ابھی بس کہاں ہے؟ ہم نے تو اس قصے میں یہ بھی پڑھا کہ یہ جن کے ناموں
کی دھوم ہے کہ ان کا مرنا اور جینا حق کے لیے تھا، انسانی، روحانی اور اخلاقی رفعتوں
کے لیے تھا۔

وہ ہم سے بھی زیادہ کشتہ تیغ ستم نکلے

وہ حسین ابن علیؑ جنھوں نے اپنی اور اپنی اولاد کی اور اپنے اہل خاندان کی گردنیں کر بلا
میں کٹوا دیں۔ مگر عبید اللہ بن زیاد کے جبر کے آگے کسی قیمت پر جھکنا گوارا نہ کیا۔ وہ
ابن زبیرؓ جو شیعروں کی موت مرے دلت کی زندگی قبول نہیں کی، وہ ابن عمرؓ جنھیں حق
بات کہنے سے کبھی کوئی روک نہ سکا اور ہر جبار ان کے رعب حق پرستی کے آگے جھکا۔
اور وہ ابن ابی بکرؓ جو حسب روایات ولی عہدؓ یزید کی مخالفت میں ہمیشہ سب سے
آگے، سب سے تیز اور صاف گو رہے۔ ان شیرانِ خدا کے بارے میں اس روباہی کا
یقین ہمیں دلایا جا رہا ہے کہ امیر معاویہ نے جو دھکی دی کہ خبر دلا کر زبان کھولی، تو ان
سب کے پورے وجود پر وہ لرزہ اور سکتہ طاری ہوا کہ معاویہ خانہ خدا میں مجمع کے سامنے
ان کی موجودگی میں ان کے بارے میں یہ غلط بیانی کرتے رہے کہ یہ چاروں یزید کی بیعت
کر چکے ہیں، اور ان میں سے کسی کے لب کو جنبش نہیں ہو سکی!

کسی ناقابلِ تصور باتیں ہیں! مگر ہمارے یہاں ٹکسالی سکوں کی طرح چل رہی
ہیں۔ ابن کثیرؒ جیسا محتاط مؤرخ بھی معاویہ دشمنی کی اندھی دبا کے اس زہر سے نہیں
بچ پایا اور تفصیل سے گریز کے باوجود اتنا بہر حال لکھ دیا۔ جیسا کہ گزر چکا۔ کہ:

”معاویہ نے ان میں سے ہر ایک کو الگ بلا کے ڈرایا دھکایا..... پھر
ان کی موجودگی میں منبر پہ جہ کے تقریر کی جس پر لوگوں نے یزید کی بیعت کر لی

اور یہ خاموش بیٹھے دیکھتے رہے کیونکہ انھیں ڈرا یاد دہم کایا جا چکا تھا۔
اسے اگر معاویہ دشمنی کا اندھا پن نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے کہ معاویہ کا چہرہ معاذ اللہ
سیاہ کرنے کے جوش میں اس بات کا ہوش بھی کھو یا گیا کہ ان کے چمکدار چہروں پر بھی
سیاہی پھری جا رہی ہے جن کی خاطر معاویہ سے دشمنی ٹھیرائی ہے!

اور ذرا یہ بھی دیکھنے کی چیز ہے کہ یہ واقعہ کس جگہ کا بیان کیا جا رہا ہے؟ ابن اثیر
کے بیان کے مطابق حرم مکی (مسجد حرام) کا اور ابن کثیر کے بیان کے مطابق حرم مدنی
(مسجد نبوی) کا۔ کیا کسی "معاویہ" کی واقعی یہ جرات تھی کہ ان دونوں حرموں میں سے
کسی حرم کے اندر پیش قدمی لوگوں کو ان حضرات کے سروں پر مسلط کرتا کہ حکم عدولی پر
گردن اڑادی جائے۔؟

پہلی بات یہ ہے کہ اگر واقعہ میں یہ سب کچھ ہوا تھا اور یہ حضرات خصوصاً حسین ابن علیؑ
اور عبداللہ بن زبیرؑ اس وقت جبرأت دکھانے اور جان پر کھیلنے کے بجائے ڈر سہم کر بیٹھ
گئے تھے تو پھر زبیرؑ کی خلافت کے قیام کی ذمہ داری میں یہ شریک ہوئے اور تین چار
سال اسی خاموشی میں گزار کر سترہ سالوں میں وفات معاویہ کے بعد جو کھڑے ہوئے تو بے جواز
بھی کھڑے ہوئے اور بے وقت بھی۔

علیؑ نہا، یہ اضطراب بیان کس بات کی جعلی کھا رہا ہے؟ ابن اثیر کہتے ہیں کہ واقعہ
حرم مکی کے اندر پیش آیا۔ جبکہ ابن کثیر کا بیان ہے کہ حرم مدنی میں پیش آیا؟ ایسی روایت
پر کس حد تک اعتبار کیا جاسکتا ہے؟

غرض کوئی ایک نہیں سمجھی کلیں اس روایت کی ٹیڑھی ہیں اور صاف معلوم ہوتا
ہے کہ جیسے تاریخ اسلام اور شاہیر اسلام کا مضحکہ اڑانے کے لیے یہ روایت بنائی گئی ہو۔

لہ اس سلسلے میں روایت کا آخری جز حضرت ابن عباسؓ کی دھمکی والا بھی دیکھ لیجئے اور پھر حضرت معاویہؓ
کا جواب بھی۔ کیا اسے مسخروں کی لڑائی کے سوا کچھ اور کہا جائے گا؟ اور یہی وہ معاویہ (لقیہ ص) پر

مگر ہمارے مؤرخین نے اسے ایک "تاریخی امانت" کے طور پر محفوظ رکھنا ضروری سمجھا۔
واللہ اعلم ان حضرات کے سامنے۔ جو کہ علم دین کے بھی ماہرین میں سے ہوئے ہیں۔
کیا چیز تھی جس نے حدیث نبویؐ "کفنی للسرا کذباً ان یحدتھ بکل ما سمع"
(آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ جو بات سنے (ملاحظہ تحقیق کئے) نقل کر دے
اور آیت قرآنی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ
فَاسِقٌ بِبَيِّنَاتٍ فَتَّبِعُوهُ.....
اے ایمان والو جب کوئی فاسق کوئی
خبر تم کو پہنچائے تو ذرا اس کی تحقیق
کر لیا کرو۔

کو تاریخی واقعات کی روایتوں کے سلسلے میں قابل اطلاق نہیں سمجھا جبکہ حدیث کی روایت
کے سلسلے میں ان ہدایات کا خیال ضروری مانا گیا۔؟

واقعہ کی قرین قیاس صورت

اوپر کی بحث کا مقصد یہ نہیں ہے کہ سرے سے کسی ایسے واقعے کے وجود ہی کا انکار
کر دیا جائے جس میں حضرت مساویہؓ نے رفع اختلاف کی خاطر حجاز کا کوئی سفر کیا ہو اور
ان حضرات (حضرت حسینؓ اور عبداللہ بن زبیر وغیرہ) سے ملے ہوں جن کو زیند کی دلی عہدی
قبول کرنے سے ابا (انکار) تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ ہمارے خیال میں تو یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں
ہوگا کہ ان ملاقاتوں میں کوئی تلخی ترشی ہی نہیں ہوئی۔ لیکن اس میں کسی شبہ کی گنجائش
نہیں ہے کہ اس طرح کے قصے ہرگز نہیں پیش آئے جو ابن اثیر کی تاریخ نے سنائے ہیں۔
واقعہ کی تمام روایات و بیانات کو دیکھتے ہوئے اور مذکورہ بالا بحث میں اٹھائے گئے
نکات و سوالات کو بھی سامنے رکھتے ہوئے روایات کے جو اجزاء قابل قبول نظر آتے

(حاشیہ کا بیہ) ہیں جو حجاز میں جا کر حجازیوں پر شیر ہو گئے اور اپنے پادے تخت دشمنوں میں بانگ بھیرا انا للہ ثم انا الیہ

ہیں ان کی روشنی میں سارے قصے کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی کہ حضرت امیر معاویہؓ، جیسا کہ ابن کثیر کا بیان ہے، عمرؓ کی نیت کر کے شام سے حجاز کے لیے نکلے اور عمرؓ سے فراغت پا کر مدینہ منورہ میں قیام کیا۔ یہاں انھوں نے مدینے کے ان حضرات سے بات کر کے جو یزید کی ولی عہدی کے مخالف تھے اس اُلجھن کو دور کرنا چاہا جو ان کی مخالفت کی وجہ سے اس معاملے میں پڑ رہی تھی۔ یہ لوگ تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت حسین بن علیؓ ان حضرات سے حضرت معاویہؓ کی گفتگو کی روداد کے سلسلے میں طبری کی روایت زیادہ قرین قیاس تھی جو ص۔ پر گزر چکی ہے۔ کیونکہ۔

(الف) یہ چاروں افراد میں سے ہر فرد کے ساتھ علیحدہ گفتگو دکھاتی ہے۔ اور حضرت معاویہؓ جیسے مدبر اور سیاست داں سے ایسے حالات میں کہ ایک مخالفت کا محاذ انھیں توڑنا ہے۔ ہی بات قرین قیاس ہے کہ وہ ہر فرد سے الگ اور تنہا گفتگو کریں۔

(ب) یہ ان چار افراد کو تین خانوں میں بانٹتی ہے۔ حضرت حسینؓ اور حضرت ابن زبیرؓ کا ایک خانہ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا اپنا الگ خانہ اور حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ کا ایک تیسرا خانہ۔ اور یہ بالکل واقعی تقسیم ہے۔ یہ چاروں حضرات اسی طرح کی تقسیم کے مستحق تھے۔ اور حضرت معاویہؓ جیسے صاحب نظر اور صاحب بصیرت آدمی سے یہی توقع کی جانی چاہیے کہ وہ ان حضرات کی اسی طرح زمرہ بندی کریں۔ اور ہر ایک سے اس کے زمرے کے مطابق گفتگو کریں۔ چنانچہ حضرت حسینؓ اور حضرت ابن زبیرؓ سے انھوں نے بالکل ایک بات کی اور دونوں نے ایک ہی جواب بھی دیا۔ اور یہی دونوں حضرات تھے جنھوں نے حضرت معاویہؓ کے بعد یزید کی خلافت اور طاقت کو چیلنج کرنے کی کیساں روش اختیار کی۔ یہ گفتگو دونوں طرف سے بالکل سیاسی انداز کی اور نہایت ناپ تول والی نظر آتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی پوری زندگی کی روشنی میں یہ اطمینان کیا جاسکتا تھا

کہ وہ خود اپنے لیے خلافت کے دعویدار نہیں ہو سکتے۔ ان معاملات میں ان کی سب سے بڑی دلچسپی امت کا اتحاد ہے۔ وہ بالآخر زید پر راضی ہو جائیں گے، چنانچہ ان کی گفتگو بھی یہی تاثر دیتی ہے اور حضرت معاویہ کی طرف سے بات میں بھی ایک کھلا پن اور اعتماد کی کیفیت نظر آتی ہے۔ حضرت عبدالرحمنؓ راگر ۶۵ھ میں زندہ تھے تو خلافت کے دعویدار نہ ہونے میں تو بظاہر حضرت عبداللہؓ عمرؓ ہی کے زمرے کے آدمی تھے مگر زید کی مخالفت میں سب سے زیادہ تشدد پائے جاتے تھے اور اسلامی نظام خلافت میں باپ کی طرف سے بیٹے کی نامزدگی کی بظاہر کوئی گنجائش نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے ساتھ حضرت معاویہ کی گفتگو دیکھی جائے تو دونوں ایک دوسرے کے لیے ناقابل برداشت نظر آتے ہیں۔ نہ سمجھنے کی کوئی امید پائی جاتی ہے، نہ سیاسی رکالے کی کوئی گنجائش! یہ بات کتنی ہی ناخوشگوار ہو لیکن طرفین کی پوزیشن کے پیش نظر سمجھ میں آنے والی ہے۔ طرفین دو انتہاؤں پر تھے۔

طبری کی روایت کے یہ دو پہلو (الف اور ب) ایسے ہیں جو ہمیں آمادہ کرتے ہیں کہ اس روایت کو بطور واقعہ تسلیم کر لیں۔ مگر روایت کی دو یا تین کمزوریوں کی وجہ سے ہم اس پر زور نہیں دے سکتے۔

۱۔ روایت کا بنیادی راوی قطعی نامعلوم شخصیت ہے ”رجل بنخلہ“ (نخلہ کا ایک آدمی) اور پچھلے جہاں روایت گزری وہاں ہم بتا چکے ہیں کہ نخلہ بھی کوئی ایک متعین جگہ نہیں ہے۔ اس نام کی دو بستیوں کا ذکر معجم البلدان میں ہے لیکن دونوں میں سے ایک کا تعین بھی ہو جائے تب بھی مجہولیت تو برقرار ہی رہے گی۔

۲۔ جبکہ ابن اثیر کی روایت میں جو گفتگو بیان کی گئی ہے اس میں مخالفین کی طرف سے حضرت زیدؓ کی گفتگو تو قرین قیاس ہو سکتی ہے مگر حضرت معاویہ کی طرف سے منسوب باتیں بالکل بچکانہ اور ظلمات قیاس ہیں۔ اتنے سخت مخالفین سے ایسی بچکانہ بہلاوے کی باتیں حضرت معاویہ کے متعلق نہیں سوچی جاسکتیں۔

۲۔ یہ روایت مجالیقین میں پانچ آدمیوں کا شمار کرتی ہے۔ اور پانچواں نام حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا دیتی ہے مگر جیسا کہ اوپر ایک جگہ بحث آچکی ہے، اس نام کا شائبہ قطعاً غلط ہے اور اس کی ایک دلیل۔ یا قرینہ۔ خود روایت ہی میں موجود ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کے ساتھ کوئی گفتگو روایت میں نہیں دکھائی گئی۔

۳۔ اس میں گفتگو کی جگہ کا نام تو نہیں لیا گیا کہ مکہ تھا یا مدینہ، مگر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی زبان سے یہ الفاظ کہلوا اے گئے ہیں کہ ”یا امیر المؤمنین نحن فی حرم اللہ عزوجل“، امیر المؤمنین ہم اس وقت حرم الہی میں ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بات چیت مکہ مکرمہ میں ہو رہی تھی جبکہ جن لوگوں نے حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ کو اس گفتگو کے وقت تک زندہ بتایا ہے انہوں نے یہ بھی کہا ہے۔ جیسا کہ پیچھے اس سلسلے کی بحث میں گزر چکا ہے۔ کہ وہ حضرت معاویہؓ کے اس سفر ہی کے دوران میں زبیر کے لیے ان کی مہم سے ناراض ہو کر مکے چلے گئے تھے اور اس سفر ہی میں مکہ سے آٹھ دس میل دور رات کو سوتے ہیں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ تب اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت عبدالرحمنؓ کا اگر ۵۳ھ میں انتقال نہیں ہو چکا تھا، جو کہ عام طور پر ان کا سنہ وفات مانا گیا ہے، اور وہ ۵۶ھ میں حضرت معاویہؓ کے اس سفر کے وقت بقیہ جیات تھے تو لازماً حضرت معاویہؓ سے ان کی ملاقات کی جگہ مدینہ ہے نہ کہ مکہ۔

ان تین موٹی موٹی باتوں کی وجہ سے طبری کی روایت کے متعلق ہم یہ اطمینان تو نہیں کر سکتے کہ فی الواقع یہی گفتگو ان حضرات کے درمیان پیش آئی ہوگی۔ مگر اس کے حق میں جانے والے قرائن کو دیکھتے ہوئے اور ابن اثیر وغیرہ کے بیانات کے سلسلے میں یہ دیکھتے ہوئے کہ ایک طرف تو وہ قطعاً ناقابل تصور ہیں جیسا کہ تفصیلی بحث کر کے دیکھا جا چکا۔ اور دوسری طرف سرے سے کوئی سند ہی اپنے ساتھ نہیں رکھتے۔ ہیں رودادِ گفتگو کی حد تک طبری کا بیان بہر حال قابل ترجیح اور واقعیت سے قریب تر

معلوم ہوتا ہے۔

اور اس گفتگو کے بعد جس میں کوئی خاص امید افزا بات نہیں تھی ظاہر ہے کہ حضرت معاویہؓ کو اس نتیجہ پر پہنچ جانا تھا کہ یہ لوگ فی الحال بیعت کرنے والے نہیں ہیں۔ جبکہ اور سب جگہ بیعت ہو چکی ہے۔ تو اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ بیعت اور ولی عہدی توڑی جائے گی کہ رکھی جائے گی؟ اسے مضبوط اور مکمل کیا جائے گا یا ایک غیر منفصل اور غیر قطعی حالت میں رکھا جائیگا؟

حضرت معاویہؓ جیسے ایک مضبوط ارادے کے شخص سے، ایک انتہائی ذمہ دار حیثیت کے شخص سے یہ توقع غالباً نہیں کی جاسکتی کہ وہ ایک ایسے علاقے کے تین چار افراد کے اختلاف کی بنا پر جس کا سیاسی وزن حضرت علیؓ کے مدینے کو چھوڑ کر کوفہ کو دارالخلافہ بنالینے کے بعد سے ختم ہو گیا تھا۔ اپنی اب تک کی ساری کارروائی لپیٹ کر رکھ دیں گے اور اپنے بارے میں ایک کمزور اور کوتاہ پس حکمراں ہونے کا تاثر دیں گے، جبکہ وہ اپنی کل زندگی کو ملت کی ایک ناگزیر ضرورت کی نظر سے بھی دیکھ رہے تھے۔ جیسا کہ آگے آئیگا۔

ہمارے نزدیک قرین قیاس ہے کہ انھوں نے ان حضرات کو (ان کی ذاتی حیثیتوں کے باوجود) نظر انداز کر کے دیگر اہل مدینہ کو خطاب کرنے اور اعتماد میں لینے کا فیصلہ کیا ہو۔ اور یہی وہ خطاب رہا ہوگا جس کا ذکر ابن اثیر کی روایت میں گزرا۔ جس کا خلاصہ ان کے بیان کے مطابق یہ تھا۔

ورخطب معاویۃ بالمدینۃ	اور معاویہؓ نے مدینے میں خطاب کیا
فند کر یزید ومدحہ	جس میں یزید کا ذکر کر کے اس کی
وقال من احق منہ بالخلافۃ	خوبیاں بیان کیں اور باعتبار عقل
فی فضلہ وعقلہ وموضعہ	فضل اور حیثیت اسے خلافت کے
وما اظن قومًا بہم نتمہین حتی	لیے موزوں تر بتاتے ہوئے کہا کہ

تصیبہم بوائق تحت اصولہم جو لوگ مخالفت کر رہے ہیں میں
وقد انذرت ان اعنت سمجھتا ہوں کہ وہ اپنے آپ کو تباہ
التذریعہ کیے بغیر باز آنے والے نہیں ہیں۔

ابن اثیر کے اس بیان کی بھی ایسی کوئی سند نہیں ہے کہ اس کو رد کرنا مشکل ہو۔ بلکہ سرے سے سند ہے ہی نہیں۔ لیکن اس وقت کے جو حالات ہمارے سامنے آرہے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے یہ بات کچھ بعید نظر نہیں آتی کہ حضرت معاویہؓ ان حضرات کے اختلاف سے تنگ آرہے ہوں اور اپنی ذمہ داری کا تقاضہ سمجھ رہے ہوں کہ سختی کا انداز اختیار کر کے اس اختلاف کو دبا یا جائے چنانچہ انہوں نے اپنے اس خطاب میں اس طرح کے جملے بھی کہے ہوں، جن کی ترجمانی ابن اثیر نے مذکورہ بالا الفاظ سے کی ہے۔ مگر سختی کا وہ انداز کہ ان لوگوں کو جلسے میں شریک کر کے زبان بند رکھنے کا حکم دیا جائے اور شمشیر بکھٹ سپاہی ان کے سر پر مسلط کیے جائیں تاکہ خوف کا عالم ان پر طاری رہے۔ یہ قطعی ناقابل یقین بات ہے۔ نہ حضرت معاویہؓ کے بیس سالہ دور میں اس جبر و ستم کی۔ اور خاص طور سے ان مؤقر حضرات کے ساتھ۔ کوئی مثال ملتی ہے نہ اہل مدینہ سے تو قیام کی جاسکتی ہے کہ وہ جبر کا یہ مظاہرہ دیکھتے ہوئے خاموش رہ جاتے۔ اور نہ ہی ان بزرگوں کے متعلق تصور کیا جاسکتا ہے کہ وہ اتنے بزدل اور سست ہمت تھے کہ مالک بن انس، احمد بن حنبلؓ اور ابوحنیفہؓ کی مثال بھی پیش کرنے کے اہل نہ ہوئے اور مزید برآں یہ جبر بالکل بیکار تھا۔ اگر ان حضرات کو اس کے بعد پابند نہ کیا جاتا

_____ کہ اب یہ اپنا اختلاف کسی پر ظاہر نہ کریں گے۔ مگر اس جبر کے قصے ہی میں ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جیسے ہی معاویہؓ جلسہ ختم کر کے رخصت ہوئے

۱۔ ابن اثیر ج ۳ ص ۲۵۱۔

ویسے ہی ان حضرات نے اس بات کی اظہار بھی کر دیا کہ ان کے متعلق جھوٹ بولا گیا
ورنہ انھوں نے نہ بیعت کی ہے نہ وہ اس سے راضی ہیں۔

فیصلہ کن بات

واقعہ یہ ہے کہ اس جبر و دباؤ والے قصے کی روایتیں اتنی مختلف قسم کی ہیں کہ
اول تو ان کا اختلاف ہی ان کو ناقابل توجہ بتا دینے کے لیے کافی ہے۔ اور وہ کافی
نہ ہو تو جبر و دباؤ کے قصے پر جو اشکالات وارد ہوتے اور سوالات اٹھتے ہیں ان کی
تاب یہ قصہ کسی طرح نہیں لاسکتا۔ اور اس سب پر مزید آخری درجے کی اور نہایت واضح
فیصلہ کن بات یہ ہے کہ یہ سب ہی مختلف روایتیں یہ بھی بتاتی ہیں کہ جبر کا عمل کر کے
بیعت حاصل کرنے کے بعد معاویہ فوراً ہی دمشق کے لیے روانہ ہو گئے اور ان مجبور حضرت
کی زبانی سب اہل مدینہ کے سامنے اس جبر کاراز کھل گیا جس میں ان حضرات پر جبر
کے ساتھ باقی اہل مدینہ سے جھوٹ اور غلط بیانی بھی شامل تھی۔ سوال یہ ہے کہ
کیا کوئی عقل باور کر سکتی ہے کہ اہل مدینہ سے جو بیعت ان کی لاعلمی
میں ایسے جبر اور جھوٹ کے بل پر لی گئی اس کے خلاف ان کے اندر کوئی
رد عمل اس وقت نہیں ہوا ہو گا جب انھیں فوراً ہی پتہ ہوا ہو گا
کہ ان کے امیر المؤمنین معاویہ ان کے ساتھ کیسا فریب (معاذ اللہ)
کر کے گئے ہیں؟ کیا کوئی امکان سوچا جاسکتا ہے کہ ایسی بیعت
جو ان کی توں قائم رہ جائے۔ ایک آدمی بھی نہ نکلے جو اپنی گردن سے
اس دھوکے کی بیعت کو نکال کر پھینکتا ہوا بتایا جائے؟
سب روایتیں بتاتی ہیں کہ جبر کا ماحول فوراً ہی ختم ہو گیا تھا۔ معاویہ اپنے ”مسلم
سواروں“ کو ساتھ لے کر واپس جا چکے تھے۔ لیکن ایک روایت بھی یہ نہیں بتاتی

کہ ادنیٰ شورش اور ادنیٰ رد عمل بھی مدینے کی آبادی میں اس ”جبر و فریب“ کے خلاف
ہوا ہو۔ تب کیا یہ جبر اور جھوٹ کے قصے سوائے جھوٹ کے اور کچھ ہو سکتے ہیں اور
ان پر کان دھرنا چاہیے؟ مگر افسوس یہ خرافاتی باتیں آج کے تحقیق پسند دور
میں بھی ٹکسالی سکوں کی طرح چل رہی ہیں۔ کیونکہ ہم ان باتوں کو دہرانے پانسنے
کے پشتہا پشت سے عادی ہو گئے۔ اور جس چیز کے ہم تدم سے عادی چلے آئے
ہوں وہ ایک تو عادت کی وجہ سے نہیں چھوٹی۔ دوسرے اس کی قدامت جیسے
ایک طرح کا تقدس اور ایک وزن اسے بخش دیتی ہے۔ اے اللہ تو ہی مدد فرما۔



باب ہشتم

یزید کی ولیعہدی پر حضرت معاویہ کو اصرار کیوں؟

اور
دیگر حضرات کو اس کے اختلاف کیوں؟

اصرار اور اس کی بنیاد

ہمارے سامنے ایسی کوئی چیز نہیں ہے جس کی بنیاد پر قطعی انداز میں کہا جاسکے کہ امیر معاویہ کو کیوں اصرار تھا کہ اپنے بعد کے لیے اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنا جائیں۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ:-

ذالك من شدة محبة الوالد	اور یہ بات اس شدید محبت کی وجہ
لولد ولما كان يتوسم	سے تھی جو ایک باپ کو بیٹے سے ہوتی
فدمن النجابة الدنيوية	ہے۔ نیز اس کی دنیوی شرافت و
وسيا اولاد الملوك ومعرتهم	اصالت کی بنا پر اور خاص کر وہ
بالحروب وترتيب الملك	جو بادشاہوں کی اولاد میں سنون
والقيام بأبتهم وكان يظن	جنگ اور نظم مملکت سے واقفیت

ان لا یقرم احدًا من ابناء الصحا
فی هذا المعنی ولہذا
قال لعبد اللہ بن عمر
فیما خاطبہ بہ اتی خفت
ان اذ الرعیۃ من بعدی
کالغنم المطیرۃ لیس
لہا راع یلہ
اور شاہانہ کروفر کی اہمیت ہوتی ہے۔
زیر معاویہ سمجھتے تھے کہ اس معنی میں
صحابہ کی اولاد میں کوئی دوسرا نہیں
ہے جو کاروبار مملکت سنبھال سکے۔
..... چنانچہ عبداللہ بن عمر سے انہوں
نے کہا تھا کہ میں راگر زید کو نہ بناؤں
تو ڈرتا ہوں کہ ہیت کو اپنے بعد ایسے
چھوڑ جاؤں گا جیسے بارش میں بکریا
کہ جن کا کوئی چرواہا نہ ہو۔

اسی ذیل میں ابن کثیر نے امیر معاویہ کی وہ گفتگو بھی نقل کی ہے جو انہوں نے حضرت
عثمان کے بیٹے سعید بن عثمان سے اس معاملہ میں کی تھی۔ ابن کثیر نے تو لکھا ہے کہ سعید
نے زید کے مقابلے میں اپنا استحقاق بتایا تھا اس پر امیر معاویہ نے وہ بات کہی تھی، مگر
طبری اور ابن اثیر کے مطابق اصل بات یہ تھی کہ اس زمانے میں جب کہ زید کی ولی عہدی
کا قصہ چھڑا ہوا تھا، سعید آئے اور خواہش کی کہ انھیں خراسان کی ولایت دیدی جائے
امیر معاویہ نے معذرت کی کہ وہ علاقہ تو ابن زیاد کی تحویل میں ہے۔ اس پر سعید بگڑ گئے
اور کہا کہ تم جو کچھ ہوئے میرے باپ کی وجہ سے ہوئے اور آج تم مجھے اس طرح کا جواب دیکر
مال لے رہے ہو، جبکہ اپنے بیٹے کے لیے تم خلافت کا بند و بست کر رہے ہو۔ حالانکہ میں کیا
اپنی ذات سے اور کیا اپنے مال باپ سے، ہر لحاظ سے زید پر فائق ہوں، اس پر امیر معاویہ
کا جو جواب نقل کیا گیا ہے وہ ابن کثیر نے اپنے مذکورہ بالا بیان ہی کے ذیل میں نقل کیا
ہے کہ امیر معاویہ نے جواب میں کہا کہ:-

لے البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۸۷۷ -

بے شک تمہارے والد کے احسانات ناقابل انکار ہیں اور تمہارے باپ بیشک
 یزید کے باپ سے بڑھ کر بھی تھے، تمہاری ماں بھی یزید کی ماں سے اس بنا پر
 نائق کہ وہ قریشی تھیں اور یزید کی ماں بنی کلب کی۔ لیکن تم جو اپنے بارے
 میں کہتے ہو تو سنو کہ تمہارے جیسے اگر اتنے بھی ہوں کہ غوطہ دمشق بھر جائے
 تب بھی یزید مجھے تم سے محبوب تر ہو گا۔^۱

گویا ابن کثیر کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اگرچہ امیر معاویہ کے اس فیصلے میں محبت پدری کا بھی دخل
 تھا مگر تنہا یہ بات نہیں تھی، بلکہ وہ یزید کو کاروبار مملکت کے لیے اہل تر بھی جانتے تھے۔
 اسی سیاق میں وہ مزید لکھتے ہیں کہ:-

وروینا عن معاویۃ انہ قال	ہم معاویہ کے سلسلے میں نقل کر چکے ہیں
یومًا فی خطبۃ: اللہم ان	کہ انہوں نے ایک دن اپنے خطبے میں کہا
کنت تعلم انی ولیتہ لانیما	تھا کہ اللہ اگر تو جانتا ہے کہ میں نے
اراء اهل لذلک فاتمزلہ	اس کو یزید کو، اس کی اہلیت کی بنا پر
ما ولیتہ وان کنت ولیتہ	ولی عہد بنایا ہے تو اس ولایت کو تو
لائی احبہ فلا تسم لہ	تکمیل تک پہنچا دے اور اگر میرا یہ کام
ما ولیتہ۔ ^۲	اس لیے ہے کہ مجھے اس سے محبت ہے،

تو پھر اسے تو پورا نہ ہونے دے۔

اس دعا کے پیش نظر جو منبر پر اور مجمع میں کی گئی بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس کے بعد اس
 بدگمانی کی گنجائش نہیں رہتی کہ یزید کی ولی عہدی بر بنائے محبت تھی نہ کہ بر بنائے اہلیت^۳
 اور واقعہ یہ ہے کہ اس دعا کے ثبوت میں اگر کوئی کلام نہ ہو تو پھر بدگمانی واقعی بڑے
 دل گردے کا کام ہے۔

۱۔ البدایہ والنہایہ ص ۸۶۔ ایضاً۔ ۲۔ حضرت معاویہ اور تاریخی حقائق۔ از مولانا تقی عثمانی۔

الغرض ابن کثیر کے مذکورہ بالا بیان کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ حضرت امیر معاویہ کو یزید کی ولی عہدی پر اصرار اس لیے نہیں تھا کہ وہ ان کا بیٹا ہے بلکہ بنائے اصرار یہی تھا کہ وہ اسے کا خلافت کے لیے موزوں تر جان رہے تھے۔ گزشتہ باب (۱۵) میں بھی دو موقعوں پر ہم دیکھ آئے ہیں کہ حضرت معاویہ نے ایک تو فودکی طبعی میں دوسرے اہل طیبہ سے خطاب میں صاف طور پر یزید کی اہلیت اور انصافیت کا حوالہ دیا ہے جس کو بالکل نظر انداز کرنا تو بہر حال مناسب نہیں ہوگا۔

ابن خلدون کا کلام

ابن خلدون نے اپنے شہرہ آفاق ”مفتاح“ میں اس مسئلہ و عہدی پر بہت شرح و بسط سے کلام کیا ہے۔ آئیے دیکھیں اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

”امامت اور خلافت کے معنی اصل میں امت کی دینی و دنیاوی مصالح کی نگرانی اور حفاظت کے ہیں۔ پس امام لوگوں کی مصالح کا امین اور ان کی بہبود کا ذمہ دار ہے۔ اور جب وہ اپنی زندگی میں اس کا ذمہ دار ہے اور اسے مسلمانوں کی صلاح و بہبود عزیز ہے تو قدرتی طور پر اس کی خواہش بھی ہونی چاہیے اور اس کا اخلاقی فریضہ بھی ہے کہ اپنی موت کے بعد کے لیے بھی ان کی بھلائی کی فکر کرے اور کسی ایسے آدمی کو قائم مقام نہ کرے جو اسی کی طرح ان کے معاملات کی دیکھ بھال کرنے والا ہو اور لوگ اس سے اسی طرح مطمئن رہیں جیسے اس کے پیشرو سے مطمئن تھے (اسی کا نام ولایت عہد ہے) اور یہ شرطاً بالکل جائز ہے کیونکہ اسکے جواز پر اور اس طرح امامت کے انعقاد پر امت کا اجماع ہو چکا ہے۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کی موجودگی میں عمر کو اسی طرح قائم مقام بنا دیا تھا جس کو صحابہ نے جائز ٹھہرایا اور عمر کی اطاعت اپنے اوپر لازم کر لی۔ بعد ازاں جب

حضرت عمرؓ کی وفات کا وقت آیا تو آپؓ نے اپنا بار عشرہ مبشرہ میں کے باقی ماندہ
 بچھے اصحاب کو سونپ دیا کہ وہ مشورہ کر کے خلافت کسی ایک کے سپرد کر دیں۔
 پھر ان میں سے بعض بعض پر فیصلہ چھوڑتے چلے گئے یہاں تک کہ عبدالرحمن
 بن عوفؓ کو اختیار کلی دیدیا گیا۔ پس انھوں نے بہتر سے بہتر کوشش کی اور عام
 مسلمانوں کے خیالات کا جائزہ لیا تو عثمانؓ اور علیؓ پر سب کو متفق پایا۔ اب
 ان دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا تو انھوں نے عثمانؓ کی بیعت کو ترجیح
 دی کیونکہ وہ نہایت سختی کے ساتھ شیخینؓ (ابوبکرؓ و عمرؓ) کی اقتدا پسند کرتے تھے
 اور اس باب میں عبدالرحمنؓ کے ہم خیال تھے کہ ہر ایک موقع پر اپنی رائے کے
 بجائے شیخینؓ کی اقتدا کرنی چاہیے۔ چنانچہ عثمانؓ کی خلافت منعقد ہو گئی۔
 اور سب نے ان کی اطاعت اپنے اوپر لازم کر لی۔ ان دونوں موقعوں پر صحابہ کرامؓ
 کی کافی تعداد موجود تھی مگر کسی ایک نے بھی اس بات پر انکار و اعتراض نہیں کیا۔
 پس اس سے ثابت ہوا کہ تمام صحابہ کرامؓ ولی عہد کی جواز پر متفق تھے، اور
 اجماع جیسا کہ معلوم ہے حجت شرعی ہے پس امام اس معاملہ میں متہم نہیں ہو سکتا
 اگرچہ وہ یہ کاروائی اپنے باپ یا بیٹے ہی کے حق میں کیوں نہ کرے۔ اس لیے کہ
 جب اس کی خیر اندیشی پر اس کی زندگی میں اعتماد ہے تو موت کے بعد تو بدرجہ
 اولیٰ اسپر کوئی الزام نہیں آتا چاہے (کیونکہ جو زندگی بھر اپنے آپ کو خیر خواہ
 ثابت کرے کامرتے وقت وہ بدخواہی کا الزام اپنے سر لے کر جانا کبھی گوارا
 نہ کرے گا) بعض لوگوں کی رائے ہے کہ باپ اور بیٹے کو ولی عہد بنانے میں امام
 کی نیت پر شبہ کیا جا سکتا ہے اور بعض صرف بیٹے کے حق میں رائے رکھتے
 ہیں۔ مگر ہمیں ان دونوں سے اختلاف ہے۔ ہماری رائے میں کسی صورت
 میں بھی بدگمانی کی کوئی وجہ نہیں ہے اور خاص کر ایسے مواقع پر کہ جہاں ضرورت

اسی کی داعی ہو مثلاً کسی مصلحت کا تحفظ یا کسی مفسدہ کا ازالہ اس میں مضمحل ہو، تب تو کسی طرح کے سوچنے کی کوئی وجہ ہی نہیں! جیسے کہ معاویہؓ کا اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنانے کا واقعہ ہے؛ تو اولاً تو معاویہؓ کا لوگوں کے عمومی اتفاق کے ساتھ ایسا کرنا اس باب میں بجائے خود ایک حجت ہے اور پھر انہیں متہم یوں بھی نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے پیش نظر جس نہ اس کے کچھ نہیں تھا کہ امت میں اتفاق و اتحاد قائم رہے۔ اور اس کے لیے ضروری تھا کہ اہل حل و عقد میں اتفاق ہو۔ اور اہل حل و عقد صرف یزید ہی کو ولی عہد بنانے میں متفق ہو سکتے تھے کیونکہ وہ عموماً بنی امیہ میں سے تھے اور بنی امیہ اس وقت اپنے میں سے باہر کسی کی خلافت پر راضی نہیں ہو سکتے تھے، اور ان کی نارضا مندی سخت انتراق و اختلاف کا باعث ہوتی۔ کیونکہ وہ قریش بلکہ پوری ملت کا سب سے بڑا اثر اور طاقتور گروہ ان نراکتوں کے پیش نظر معاویہؓ نے یزید کو ولی عہدی کے لیے ان حضرات پر ترجیح دی جو اس کے زیادہ مستحق سمجھے جاتے تھے اور افضل کو چھوڑ کر مفضول کو اختیار کیا تاکہ مسلمانوں میں جمعیت اور اتفاق باقی رہے جس کی متاع کے نزدیک بیجا اہمیت ہے بلکہ

مزید لکھتے ہیں کہ:-

خلفائے اربعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے دور میں اور معاویہؓ کے دور میں ایک بہت بڑا فرق ہو گیا تھا اور وہ یہ تھا کہ خلفائے اربعہ کے دور میں (بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ شیخین کے دور میں) مسلمانوں کی طبیعتوں پر دین کی گرفت بہت سخت تھی، ان کی پسند و ناپسند اور رضا و عدم رضا کا معیار صرف دین تھا اور ان کا

لہ مقدمہ ابن خلدون، ولی عہدی کا بیان ۱۶۶-۱۷۵ مطبوعہ مصر۔

اس کلام پر ایک تنقیدی نظر

ابن خلدون کے کلام سے معلوم ہوا کہ ان کی نظر میں معاملہ کی نوعیت یہ تھی کہ ملت کے جس دور میں زبرد کے لیے ولی عہدی کا فیصلہ کیا جا رہا تھا اس دور میں ملت کے اتحاد اور اس کی اجتماعیت کے بقاؤ کے نقطہ نظر سے اس کے سوا کوئی دوسرا فیصلہ ممکن نہیں تھا کیونکہ اس دور میں دینی ضمیر اصل اجتماعی طاقت نہیں رہا تھا بلکہ قبائلی عصبیت نے پھر سے اصل اجتماعی طاقت کا مقام حاصل کر لیا تھا اور حالات کے اس نقشے میں بنی امیہ کی عصبیت سب سے بڑی عصبی طاقت تھی اور زبرد بنی امیہ کا وہ فرد جس کے بارے میں سب سے زیادہ اعتماد دیکھا جاسکتا تھا کہ یہ عصبی طاقت اس کی اطاعت گزار ہو کر ادارہ خلافت کی پشتی بان ثابت ہوگی۔

اجتماع و عمران کے معاملے میں ابن خلدون کے تجزیوں اور فیصلوں کو جو اہمیت حاصل ہے اس سے انکار کسی کے لیے ممکن نہیں۔ اس لیے ان کا یہ تجزیہ کسی خوش عقیدگی کی بنا پر نہیں بلکہ سنجیدگی کی بنا پر لائق اعتناء ہونا چاہیے کہ زبرد کی ولی عہدی کے پیچھے کوئی اور چیز نہیں بلکہ صرف اس اجتماعی مصلحت کا شعور کام کر رہا تھا کہ اس کے انتخاب کے ذریعہ خلافت کا ادارہ ٹوٹ پھوٹ سے بچ جائے گا۔ اور اس تجزیے کی روشنی میں ہمیں پورے اطمینان کے ساتھ یہ سمجھنے کی گنجائش ہے کہ حضرت معاویہ کو جو اپنی تجویز پر اصرار تھا اس کی اصل وجہ ملت کی مصلحت ہی تھی۔ لیکن یہ سمجھنا کہ یہ مصلحت اندیشی بالکل بجا بھی تھی، اور اس میں کوئی کلام نہیں کیا جاسکتا تھا، جیسا کہ بظاہر ابن خلدون کا نقطہ نظر ہے، سو یہ صرف اس وقت ممکن ہے جبکہ ہم ابن خلدون کا یہ بیان بھی تسلیم کر لیں کہ زبرد کی ولی عہدی سے اختلاف کرنے والی صرف ایک شخصیت عبداللہ بن زبیر کی تھی۔

۱۔ مقدمہ ابن خلدون بیان ولایت عہد ۱۶۷

بے شک اگر واقعہ میں ایک عبداللہ بن زبیر کے علاوہ کوئی قابل ذکر شخصیت نہ تھی جس کو زبید کی ولی عہدی کے مسئلے سے اختلاف ہو رہا ہو تو پھر ابن خلدون کی اس رائے سے اتفاق ہی کرنا پڑے گا کہ ”ایک آدھ آدمی“ کے اختلاف سے بھلا کہاں بچا جاسکتا ہے اور کیونکر اسے کوئی بڑی اہمیت دی جاسکتی ہے۔ مگر ابن خلدون کا یہ بیان تو بالکل ایک نادر بیان ہے۔ چار اہم شخصیتیں عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر، عبدالرحمن بن ابی بکر اور حسین بن علی رضی اللہ عنہم، تو ہر تاریخی بیان کے مطابق اس سلسلے میں مخالفت کرنے والی رہی ہیں۔ حتیٰ کہ ابن خلدون نے خود اپنی تاریخ میں ان چاروں کا نام دیا ہے، اور واقعہ کی اس صورت میں کہ یہ چار شخصیتیں بہت صاف اور نمایاں طور پر مخالفت تھیں، یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ حضرت معاویہ نے جو کچھ ازراہ مصلحت اندیشی کیا تھا، وہ واقعہ میں بھی پوری طرح مصلحت اندیشانہ بات تھی۔ کیونکہ ان چار آدمیوں کا اختلاف ہوتے ہوئے یہ بات ماننا مشکل ہے کہ زبید کی ولی عہدی کے ذریعہ ملت کو شقاق و انتشار سے بچانے کا اطمینان کیا جاسکتا تھا۔

یہ کیسے چار آدمی تھے؟ عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر تو اس مرتبے کے لوگ تھے کہ جب حضرت علی اور حضرت معاویہ کے درمیان ”تحکیم“ کا قصہ پیش آیا کہ دو حکم بیٹھ کر قرآن کی رو سے فیصلہ کریں کہ اس اختلاف کا حل کس طرح ہونا چاہیے؟ اور ان دو حکموں (حضرت ابو موسیٰ اشعری اور حضرت عمرو بن العاص) کا اجلاس اس فیصلے کے لیے منعقد ہوا تو اس کی غیر معمولی اہمیت کی بنا پر اور اس بنا پر کہ بظاہر اسباب اس کے نتیجہ خیز ہونے پر امت کی صلاح و بقا کا انحصار تھا، جن اہم لوگوں کو حکمیں نے اس موقع پر بلوانے کی اور ان سے درخواست کرنے کی ضرورت سمجھی کہ وہ ضرور اس موقع پر موجود ہوں تو ان میں یہی دو (عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ) تھے جن کا نام کے ساتھ تاریخ ذکر کرتی ہے۔

لہ ایضاً

فلما اجتمع الحكماء بأذرح
 وانا هم المغيرة بن شعبة
 فيمن حضر من الناس فارسل
 الحكماء الى عبد الله بن عمرو
 بن الخطاب وعبد الله بن
 الزبير في اقبالهم في رجال
 كثير

جب حکمین اذرح کے مقام پر جمع ہوئے
 تو بہت سے لوگ وہاں پہنچے جن میں
 مغیرہ بن شعبہ بھی تھے نیز ان حکمین نے
 بعد اللہ بن عمرو اور عبد اللہ بن زبیر کے
 پاس بلاوا بھیجا کہ وہ اس موقع
 پر ضرور آجائیں۔

طبری کی روایت کے یہ الفاظ ذرا الجھے ہوئے ہیں۔ مصنف عبد الرزاق میں عبارت
 بہت صاف ہے لہذا ہم اسے بھی نقل کرتے ہیں:-

فلما حکم الحكماء فاجتمعا
 بأذرح وانا هما المغيرة بن
 شعبة وارسل الحكماء الى
 عبد الله بن عمرو والى عبد
 بن زبير وادار رجالا كثير
 من قريش

پس جب دو آدمی حکم بنا دیئے گئے اور
 وہ اذرح میں جمع ہوئے تو مغیرہ بن شعبہ
 بھی وہاں پہنچ گئے اور ان حکمین نے
 بعد اللہ بن عمرو اور عبد اللہ بن زبیر کو
 (بطور خاص) بلاوا بھیجا اور ان کے
 علاوہ قریش کے بہت سے لوگ پہنچے۔

۱۔ یہ شام کے حدود میں ایک مقام کا نام ہے۔ ۲۔ طبری جلد ۶ ص ۳۲۔ ۳۔ یہ امام ابو بکر
 عبد الرزاق الصنعانی (م ۱۹۱ء) کا مرتب کردہ مجموعہ احادیث و آثار ہے۔ امام عبد الرزاق امام بخاری کے
 استاذ ہیں۔ اس کتاب کے نسخے اب تک قلمی تھے ۱۹۶۲ء میں پہلی بار یہ مطبوعہ شکل میں سامنے آئی ہے
 حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی رحمت اللہ علیہ نے اس کو ایڈٹ کیا ہے۔ گیارہ جلدوں میں تمام ہوئی ہے
 ۴۔ ج ۵ ص ۶۳۔ مزید راک صیح بخاری میں بھی ایک روایت ہے جس سے حضرت عبد اللہ بن عمر کا
 اس موقع پر بلایا جانا معلوم ہوتا ہے۔ یہ کتاب المغازی 'باب غزوة الخندق کی بارہویں حدیث
 (۸۰-۳۱) ہے۔ عن سالم عن ابن عمر، نیز عن عکرمہ عن ابن عمر۔ صاحب العواصم والقوام
 ابو بکر ابن العربي نے یہ حدیث ان واقعات کے سلسلے میں نقل کی ہے جن کا تعلق یزید کی (باقی صفحہ ۱۳۵ پر)

حضرت عبداللہ بن عمر کی مزید برآں ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اس موقع پر حکمین کے درمیان ایک متبادل شخصیت کی تلاش میں سب سے پہلا نام عبداللہ بن عمر ہی کا آیا کہ علیؑ اور معاویہؓ دونوں کو چھوڑ کر ان کو خلیفہ اسلام مان لیا جائے۔

قال عمرو یا ابا موسیٰ ا أنت	عمر بن العاص نے دوسرے حکم ابو موسیٰ
علی ان نسئی رجلاً یلی امر	اشعری سے جبکہ وہ دونوں تہنائی میں گفتگو
هذه الامّة نسئی فان	کو بیٹھے کہا کہ ابو موسیٰ کیا تم پسند کرتے
ان قد رعلی ان اتابعك فلك	ہو کہ ہم امت کی سربراہی کے لیے کسی ایک
علی ان اتابعك والافلی علیك	شخص کو نامزد کریں! اگر پسند کرتے
ان تتابعنی قال ابو موسیٰ	ہو تو نامزد کرو، میرے لیے اگر ممکن ہو کہ
اُسئی لك عبد الله بن عمر	تمہارا دیا نام قبول کر لوں تو میں قول دیتا
وكان ابن عمر فیمن اعتزل	ہوں کہ قبول کر لوں گا ورنہ پھر میں جو نام دل
	تم اسی پر راضی ہو جانا۔ ابو موسیٰ اشعری
	نے کہا میں عبداللہ بن عمر کا نام تجویز کرتا
	ہوں۔۔۔ اور ابن عمر ان لوگوں میں سے
	تھے جو اس دور کے اختلاف سے الگ تھے۔

الغرض جن افراد کا یہ مقام ہو کہ مسئلہ خلافت کی پیچیدہ گتھی سلجھائے جانے میں ان کی موجودگی بطور خاص ضروری سمجھی جا رہی ہو، دونوں طرف کے حکم ان کا انتظار کر لے رہے ہوں (بقیہ صفحہ ۱۳۴ کا) دل چاہیے کہ حضرت معاویہؓ کی کوششوں سے یہ لیکن یہ کوئی غلط فہمی ہے ورنہ اس حدیث کا تعلق ۳۷ھ میں حکمین کے اجلاس سے ہے جیسا کہ مصنف عبدالرزاق کی مذکورہ بالا عبارت کے اگلے حصے سے قطعی طور پر معلوم ہوتا ہے۔ دیکھیے مصنف ج ۵ ص ۲۶ اور فتح الباری ج ۴ ص ۲۰۳ (مطبوعہ سعودیہ) ۲ طبری ج ۳ ص ۲۶۔ مصنف ج ۵ ص ۲۶۵۔ ایک اہم قائلہ — اس نائدہ کے لیے ملاحظہ ہو ضمیمہ اس باب کے خاتمے پر۔

اور مزید برآں ان میں سے ایک کا یہ درجہ بھی ہو کہ اس کی ذات میں مسئلہ خلافت کی پیچیدگی کا حل دیکھا جا رہا ہو ایسے اشخاص کے اختلاف کے ساتھ کیسے قطعی امید کی جاسکتی تھی کہ یزید کے ماتحت نظم خلافت استوار رہ سکے گا؟ پھر یہ دو ہی نہیں، حضرت حسین بن علیؓ بھی اختلاف کے لیے حتمی طور پر موجود تھے۔ اور تنہا اپنی کا اختلاف اس بات کا اندیشہ رکھنے کے لیے کافی تھا کہ یزید کے لیے خلافت کا کاروبار آسان نہیں ہو سکے گا۔ اور اگر عبدالرحمن بن ابی بکرؓ بھی ولی عہدی کی کاروائی کے دنوں میں بقیہ حیات تھے تو وہ تو بالکل شمشیر بے نیام تھے۔ خود حضرت معاویہ کا جو وصیت نامہ یزید کے لیے نقل کیا گیا ہے وہ اگرچہ بعض وجوہ سے مشکوک ہے تاہم اس میں بھی یزید کو ان چار آدمیوں کے اختلاف سے آگاہی اور مناسب ہدایات دی گئی ہیں۔

بہر حال یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت کے حالات میں یزید کے ماتحت ادارہ خلافت کو کم سے کم خطرہ ہو سکتا تھا۔ لیکن وہ بات جو ابن خلدون نے کہی ہے کہ یزید کی ولعہدی کے ذریعہ ادارہ خلافت کو گویا خطرات سے تحفظ عطا کر دیا گیا، یہ کچھ زیادہ ہی بات ہے۔ بیشک عبداللہ بن عمر نے اپنی رائے کے اختلاف کو عملی شکل دینا پسند نہیں کیا جیسا کہ ان کا مزاج تھا اور جیسا کہ ان کے بارے میں حضرت معاویہ کا اندازہ تھا اور بے شک حضرت حسینؓ کے معاملے میں بھی حضرت معاویہ کا اندازہ صحیح ہوا کہ اگرچہ کوئی انھیں حرکت میں لائے بغیر نہ چھوڑینگے مگر وہی یزید کی طرف سے ان کے لیے کافی بھی ہو جائیں گے، جیسا کہ ان کی پرانی عادت رہی ہے۔ مگر عبداللہ بن زبیر کی سرگرم اور پر زور محاذ آرائی جس سے حضرت معاویہ کو سچ پچھڑا تھا حضرت حسینؓ کی شہادت کے اثرات سے مل کر بالآخر یزیدی خلافت کے لیے موت کا پیام بن ہی گئی۔ ایسی موت کہ پھر اس گھرانے میں سے خلافت نکل گئی۔ اس لیے اگرچہ یہ تسلیم کہ حضرت معاویہ کا یزید کو ولی عہد بنانا ملی مصلحت اندیشی ہی کے ماتحت تھا نہ کہ جذبہ پدیری کے ماتحت، مگر یہ تسلیم کرنا مشکل کہ ایسے اہم افراد کے اختلاف کے

ساتھ، یہ تجویز مصلحت اندیشی کا بہترین نمونہ بھی تھی۔

اہل اختلاف کے اختلاف کی بنیاد

یزید کی ولی عہدی سے جن حضرات نے نمایاں اختلاف کیا اور آخر تک اختلاف جاری رکھا، یعنی حضرت عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر، عبدالرحمن بن ابی بکر اور حضرت حسین بن علیؑ ان کے اختلاف کے سلسلے میں یہ بات بڑی طرح مشہور ہو گئی ہے کہ یزید ایک فاسق و فاجر انسان تھا اس لیے ان حضرات کو یہ بات قبول نہیں تھی کہ اُسے اسلامی خلافت جیسا مقدس اور محترم منصب دیا جائے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو حضرات حضرت معاویہ کی زندگی میں سرگرم اختلاف فرما رہے تھے ان کی زبان سے ہمیں کوئی لفظ ایسا نہیں ملتا جس سے اس شہرت عام کی تصدیق ہو سکتی ہو۔ ان حضرات کا صرف ایک اختلاف ریکارڈ پر ہے کہ یہ اسلام میں قیصریت و کسرویت کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے کہ باپ مرے تو بیٹا حکومت سنبھال لے، خلفائے راشدینؓ کے انتخاب کے طرز سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ بارے میں وہ گفتگوئیں طبری اور ابن اثیر وغیرہ کے حوالے سے گزر چکی ہیں جن میں ان اختلاف کرنے والے حضرات نے حضرت معاویہؓ اور ان کے نمائندوں مروان بن الحکم وغیرہ سے اپنے اختلاف کی بنیاد بیان کی ہے۔ ان گفتگوؤں اور بیانات میں اس بناءے اختلاف کے ماسوا کوئی دوسری بات نہیں۔ مگر جن لوگوں کے طفیل یہ بے بنیاد اور بے اصل بات پھیلی اور بالکل ایک تاریخی واقعہ بن گئی ہے کہ حضرت حسینؑ اور ابن زبیر وغیرہ کے اختلاف کی بنیاد یہ تھی کہ یزید ایک زبردست فاسق و فاجر تھا، ان کی جراتوں کا عالم تو یہ ہے کہ جو انسانہ چاہیں تراشیں اور پروپیگنڈے کے فن سے حقیقت بنا دیں کیونکہ صحابہ کرامؓ کو مطعون کرنا ان کا دین و ایمان ہے اور اس کام کا بہت آسان راستہ حضرت معاویہؓ کی ذات میں بایں طوٹتا ہے کہ یزید کو ابتداءً عمر ہی سے فاسق و فاجر بنا کر یہ خیال مسلمانوں کے دلوں میں ڈالا جائے کہ ایسی نالائق اولاد کو اس شخص نے جسکو

صحابی رسول کہا جاتا ہے تخت خلافت پر بٹھا یا اور اس وقت موجود کتنے ہی اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے بھی دو چار کے سوا کسی کو توفیق نہ ہوئی کہ اس کی مخالفت کرے۔ جناب علی نقی صاحب لکھنوی کی کتاب ”شہید انسانیت“ کا ذکر پہلے باب میں آچکا ہے۔ ایک افسوسناک غلط بیانی کی مثال وہاں دی گئی تھی اسی طرح کی ایک دوسری مثال اس باب کی یہاں ملاحظہ فرمائیے۔ باب ۵ میں ابن اثیر کے حوالے سے یہ روایت گزری ہے کہ گورنر مدینہ مروان بن الحکم نے حضرت معاویہ کی ہدایت پر اہل مدینہ کے سامنے یزید کی ولی عہدی کی تجویز منظور کی لیے رکھی جس کو حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ نے نہایت سختی سے رد کرتے ہوئے کہا کہ کیا یہ کسرویت و قیصریت کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے؟ اس تجویز میں ہرگز دین و ملت کا مفاد ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ اس سے زیادہ حضرت عبدالرحمن کا کوئی تبرہ نہیں تھا، یزید کے کسی فسق و فجور کا ذکر نہیں تھا۔ مگر جناب علی نقی صاحب نے اسی واقعہ کا حوالہ دیتے ہوئے حضرت عبدالرحمن کے منہ میں یہ الفاظ بھی ڈالے ہیں کہ:-

”ہم ہرگز اس شرابی اور زانی کی بیعت نہ کریں گے۔“ ص ۱۵۶۔

بھلا کون سی سمجھے گا کہ قبلہ اپنی طرف سے ایک جھوٹ کا اضافہ کر رہے؟ مگر واقعہ یہی ہے کہ بالکل خالص جھوٹ ہے جس کا کوئی سر پیر نہیں۔ حضرت ابن ابی بکر نے یہ الفاظ نہیں فرمائے۔ کچھ سنی سنائی باتوں پر اپنا خواہ مخواہ ایک گمان یہ تھا کہ قبلہ علی نقی صاحب ایک علمی شخصیت ہیں (اب یقیناً ماضی ہے، انتقال ہو چکا ہے) اس گمان میں مزید اضافہ لندن کے ”سٹریڈ خونی“ کے لائبریرین صاحب نے کیا جن کے پاس راقم السطور کچھ کتابوں کی تلاش میں پہنچا تھا۔ لائبریرین صاحب (جن کا میں ممنون ہوں کہ چند کتابیں انہوں نے مجھے چند ہفتے کے لیے مستعار دیں) نے مجھے کچھ زیادہ ہی اصرار سے یہ مشورہ بھی دیا کہ اس موضوع پر کچھ لکھنے سے پہلے میں مولانا سید علی نقی صاحب کی ”شہید انسانیت“ ضرور دیکھ لوں یہ مشورہ چونکہ موصوف کے اس خون و خطر کے پس منظر میں صادر ہوا تھا کہ پتہ نہیں یہ شخص (راقم)

کیا "ستم" ڈھانے کی تیاری کر رہا ہے۔ اس لیے مجھے قدرتی طور پر گمان ہوا کہ "شہیدانِ نبیت" ضرور شیعہ نقطہ نظر کے سلسلے میں کوئی علمی وزن کی کتاب ہوگی۔ اس لیے بطور خاص اس کو باہر سے منگوانے کا اہتمام کیا گیا۔ مگر اس کا جو حال نکلا وہ اس کتاب سے دی گئی، ان مثالوں سے ظاہر ہے۔

بہر حال پروپیگنڈے کے فن سے کام لے کر یہ بالکل بے اصل بات ایک "واقعی حقیقت" بنا دی گئی ہے کہ حضرت حسین وغیرہ کو زید کی ولی عہدی قبول کرنے سے انکار اس کے فسق و فجور کی وجہ سے تھا۔ حالانکہ تاریخ کے بیانات میں اس کا دور دورہ کہیں بھی پتہ نہیں ہے بلکہ جیسا کہ اپنے موقع پر آئے گا ولی عہدی کی بیعت کے چار سال بعد (سنہ ۶۱ھ) جب حضرت معاویہؓ کے انتقال پر زید نے خلافت سنبھالی اور حضرت حسینؓ نے اس کے خلاف کھڑے ہونے کا فیصلہ فرمایا تب بھی زید کے ذاتی فسق و فجور کی بات آپ کی زبان پر کبھی نہیں آئی، حتیٰ کہ کوفہ کا سفر اور شہادت ساری منزلیں گزر گئیں۔ کہیں یہ بات "زانی ہے، شرابی ہے" آپ کی زبان پر نہیں آئی۔ بات صرف اتنی ہی تھی کہ باپ کی طرف سے بیٹے کی ولی عہدی ان حضرات کے نزدیک اسلامی اصولِ خلافت کی رو سے صحیح نہیں تھی، یا مصلحت نہیں تھی۔ مزید برآں اگر کچھ کہا جاسکتا ہے تو وہ یہ ہے (جس کے واضح شواہد و قرائن موجود ہیں) کہ یہ سب حضرات وہ تھے جو دراصل حضرت معاویہ ہی کو اس منصب کا اہل نہیں سمجھتے تھے اور حالات کی پیدا کردہ ایک مجبوری کے طور پر انھیں گوارا کرتے رہے تھے بلکہ صاف کہا جائے تو ان میں سے شاید ہر ایک اپنے آپ کو ان (حضرت معاویہؓ) کے مقابلے میں نیما بنید و بین اللہ بہتر سمجھتا تھا۔ حدیث ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر جن کے ورع و تقویٰ اور کسی بھی منافست سے لے یہ بات کہ یہ حضرات حضرت معاویہ کی داد و دہش سے استفادہ کرتے اور ان کے ماتحت جہاد کرتے رہے ہمارے اس بیان کے خلاف نہیں جانی چاہیے جہاد تو امامناجر کے ماتحت بھی کیا جائے چہ جائیکہ ایک صحابی امام۔ اور داد و دہش ان کی ذاتی نہ تھی مملکت کے مال اور جہاد کے غنائم سے تھی۔

دوری کی بنا پر یہ سمجھنا مشکل ہو سکتا ہے کہ وہ بھی اس معاملے میں بہتری اور برتری کا احساس رکھتے ہوں ان کے بارے میں بھی خود ان کا اپنا بیان بخاری شریف کی اس روایت میں موجود ہے جس کا ذکر ابھی چند صفحات پہلے ایک حاشیہ میں الحواصم والقواصم کے حوالے سے گزر چکا ہے اس روایت کے مطابق حضرت عبداللہ بن عمر نے حضرت علی اور حضرت معاویہ کے درمیان "تہکیم" کے موقع پر حکمین کے اجلاس میں اپنے جانے کا قصہ بیان کرتے فرمایا۔

فلما تفرق الناس خطب معاویۃ	اور جب لوگ منتشر ہو گئے (یعنی تہکیم کا
قال من كان يريد ان يتكلم في	کا قصہ ختم ہو گیا اور خاص طور سے حضرت
هذا الامر ليطلع لنا قرتة	علیؑ کے لوگ چلے گئے (تو ایک وقت میں)
فلنحن احق بمرتبہ ومن ابیہ	معاویہؓ نے باقی لوگوں سے خطاب کیا
قال جیب بن مسلمۃ فہلّا اجبتہ	اور کہا کہ اگر کسی کو اس معاملہ خلافت میں
قال عبد اللہ فحللت جوبی	دعویٰ ہو تو اپنا دعویٰ سامنے لائے ہم
وہمت ان اقول احق لهذا	ہر دو عویدار سے اور اس کے باپ سے زیادہ
الامر منك من قالک و اباک	حق دار نکلیں گے۔ ابن عمر کا یہ بیان سن کر حضرت
علی الاسلام نخشیت ان اقول	معاویہ کے ایک طرفدار، حدیب بن سلمہ
کلّمۃ تفرق بین الجمع و سفک	بولے "تم نے کچھ جواب نہ دیا؟ میں نے
الدم و مجمل عنی غیر ذالک	کہا کہ، ہاں میں نے اپنی نشست بدلی
فذا کرت ما اعد اللہ فی	تھی اور چاہا تھا کہ بولوں کہ: "تم سے زیادہ جتنا
الجنان	وہ ہے جس نے تم سے اور تمہارے باپ سے اسلام کیلئے

جنگ کی، لیکن مجھے فوراً خیال ہوا کہ یہ بات

لہ مصنف عبدالرزاق میں "تفرق الحکمان" ہے اور یہی تعبیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر نے بھی بیان مفہوم میں مصنف کے الفاظ کا سہارا لیا ہے۔ لہ کتاب المغازی باب غزوة الخندق۔

اس وقت کی اجتماعیت میں تفرقہ ڈال سکتی ہے
 خوزیری کی آگ بھڑکا سکتی ہے اور خود میرے
 بارے میں غلط فہمی پھیلا سکتی ہے اور اسکے
 بعد میں نے اللہ کے وہ انعام و اکرام یاد کیے
 جن کا میں اتنے سگور و بخت میں ڈیٹے جانے کا وعدہ ہے

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جو جواب دینا چاہا تھا مگر پھر روک لیا اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا
 ہے کہ جن لوگوں کو بھی اسلام میں سابقیت اور اس کے لیے قربانیوں کا فخر حاصل ہے وہ منصب
 خلافت کے زیادہ حقدار ہیں جن میں خود حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی داخل ہوتے تھے۔ لیکن اسی
 واقعہ کی ایک دوسری روایت بجا الطبرانی کے بارے میں حافظ ابن حجر شراح بخاری بتاتے ہیں کہ
 اس میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے یہ الفاظ بھی پائے جاتے ہیں کہ:-

نصاحتی نفسی بالذنیہا یہ پلادن تھا کہ میرے دل میں ذنیہا بلبی کی بات
 قبل یومئذین (فتح الباری ج ۱ حدیث ۴۱۸) آئی یعنی حکومت کے حق کا دعویٰ پیدا ہوا)

ان الفاظ کی رو سے حضرت معاویہؓ کے مقابلے میں حضرت ابن عمرؓ کے دل میں آنے والی یہ بات
 (اس وقت) تنہا ان کی اپنی ہی ذات سے متعلق ہو جاتی ہے۔

ان کے علاوہ حضرت حسینؓ جیسے جلال حضرت معاویہؓ کے بارے میں رکھتے تھے وہ تو
 کوئی دھکی چھپی بات ہی نہیں ہے باب دوم میں ان کا ایک خط خود حضرت معاویہؓ ہی کے نام
 گزر چکا ہے جو صحت الفاظ میں بتاتا ہے کہ وہ ان کی حکومت کو کیا سمجھتے تھے۔

بہر حال یہ بات کوئی راز نہیں ہے کہ ان حضرات نے اگرچہ حضرت معاویہؓ سے بیعت
 کر لی تھی، مگر ایک مجبوری کے درجے میں کی تھی پوری طرح اہل سمجھ کر نہیں کی تھی۔ اور بنیادی وجہ

لے بہ بڑا اہم جملہ ہے۔ اس معلوم ہوتا ہے کہ حکیم کا معاملہ کسی ایسی صورت پر ختم ہوا تھا جس اجتماعیت کے بحال ہونے کی
 امید ہو گئی تھی۔ مگر افسوس کہ اس کی کوئی تفصیل کہیں نہیں ملتی۔ لہٰذا صحیح بخاری کتاب المغازی باب غزوہ الخندق

وہی تھی جس کا اظہار حضرت ابن عمرؓ کے مذکورہ بالا بیان سے ہوتا ہے کہ وہ سابقین اور سابقین اولین کے ہوتے ہوئے متاخرین کے لیے خلافتِ اسلامی کا حق نہیں مانتے تھے الا یہ کہ دوسرے مصالح کی وجہ سے ان کو مجبوراً قبول کر لیا جائے۔ پس کیا گنجائش تھی کہ وہ یزید کو اپنی اولیٰ اپنے جیسوں کی موجودگی میں خلیفہٴ اسلام ماننے کے لیے تیار ہو جاتے؟ لہذا علاوہ ان حضرات کے اس صریح موقف کے کہ باپ کی طرف سے بیٹے کی نامزدگی (اور گویا خلافت بطور وراثت) ایک غیر اسلامی طریقہ ہے۔ یہ بات بھی تقریباً یقینی ہے کہ وہ یزید کو اس بنا پر بھی منصبِ خلافت کیلئے ناقابلِ قبول سمجھتے تھے کہ وہ اپنے والد معاویہ سے بھی قطعی طور پر منھنول تھے۔ لیکن یہ بات قطعی جھوٹ اور افتراء ہے کہ یزید کے بارے میں کسی منقذ و فحور کا مسئلہ بھی اٹھایا جاتا تھا، یہ مسئلہ اگر اٹھا ہے تو حضرت حسینؓ کی شہادت کے تین سال بعد کچھ اہل مدینہ کی طرف سے اٹھا ہے اور اسے رد کرنے والے بھی اسی مدینہ میں حضرت حسنؓ و حسینؓ کے بھائی حضرت محمد بن حنفیہؓ بن سہر علیؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ ایسے حضرات بھی تھے جن کے رد کا وزن نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

یزید اپنے ایک خطبے کے آئینے میں

حضرت معاویہؓ کی وفات کے وقت تک یزید کے مزاج و کردار کا ایک اچھا آئینہ ہمارے خیال میں اُن کا وہ مخمّر سا خطبہ ہے جو اہل تاریخ کے بیان کے مطابق انھوں نے اپنے والد حضرت معاویہؓ کی وفات کے بعد دیا تھا۔ اس خطبے کے آئینے میں ان کی شخصیت ایک سنجیدہ باوقار اور ذی علم انسان کی نظر آتی ہے نہ کہ شراب و کباب، قہر و سرد اور لہو و لعب کے ایک رسیا کی۔ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ معاویہؓ کا انتقال ہوا تو یزید حواریں میں تھے ضحاک بن قیس کو قوتوال شہر نے اطلاع کرائی تب وہ آئے۔ ضحاکؓ نے شہر سے باہر اُن کا استقبال کیا، یزید نے ہاں سے اندرون شہر میں جانے کے بجائے قبرستان کا رخ کیا۔ والد کی قبر پر نماز جنازہ ادا کی یہاں لے یہ مقام شام کے علاقہ حلب میں ہے۔

سے فارغ ہو کر شہر میں آئے حکم دیا کہ "الصلوة جامعة" کی ندا کرائی جائے۔ پھر اپنی اقامت گاہ
خضرا میں داخل ہو کر غسل کیا۔ لباس بدلا۔

ثم خرج فخطب الناس اول خطبة
وهو امير المؤمنين فقال بعد
حمد الله والتناء عليه: ايها
الناس! ان معاوية كان عبدا
من عبدي الله العزيم الله عليه
ثم قبض اليه وهو خير ممن
بعدك وودون من قبلك ولا اذكبه
على الله عز وجل فانته اعلم
به ان عفي عنده نبر حمته وان
عاقبه نذر نبر وقد وليت الامر
من بعدك.....

پھر باہر آئے اور کھنڈیت امیر المؤمنین
لوگوں کے پہلا خطاب کرتے ہوئے محدثانہ
بند کہا کہ لوگو! معاویہ اللہ کے بندوں میں سے
ایک بندے تھے اللہ نے انکو اپنی نعمتوں سے
نوازا اور پھر اپنے حضور میں بلا لیا وہ اپنے بعد
والوں سے بہتر اور شہر یوں سے کمتر تھے۔
لیکن یہ میں اللہ کے سامنے انکا تذکرہ کرنے
(جہلان کی سند دینے) کیلئے نہیں کہہ رہا، ایسے
کہ وہ انکو زیادہ بہتر جانتا ہے اگر ان سے
درگزر فرمائے تو یہ اس کی رحمت ہوگا اور اگر
گرفت فرمائے تو یہ انکے گناہوں کی وجہ سے
ہوگا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ ان کے بعد
خلافت کی ذمہ داری مجھ پر ڈالی گئی ہے اے اللہ

ہمارا خیال ہے کہ اس خطبے کی عبارت اس کا مضمون اور اس کا لہجہ ہر چیز اس شخص (زیرید)
کے بارے میں اس عام خیال کی تردید کرتی ہے جو کسی واقعی بنیاد کے بغیر صرف اس لیے پھیلنے
میں کامیاب ہو گیا ہے کہ اس شخص کی حکومت کے زمانے میں اسی کے حکام اور لشکریوں کے ہاتھوں
ریحانہ رسول، جگر گوشہ نبول حضرت حسینؑ کی شہادت کا المناک واقعہ پیش آیا۔ اور اس نے اپنے
حکام سے اس پر باز پرس نہ کی، اس لیے ایسے آدمی سے متعلق جو بھی برائی کسی نے سنادی وہ

قابل یقین ہو گئی۔ مگر یہ ہے واقعی اسلامی انصاف کے خلاف بات کہ کسی کے ایک جرم کی سزا میں اس جرم سے پہلے کی اس کی زندگی کو بھی خواہ مخواہ بدنام کیا جائے، ہاں جن لوگوں کے نزدیک جھوٹ سچ ہر طریقے سے صحابہ کرامؓ کو بدنام کرنا ایک کارِ ثواب ہے ان کے لیے بالکل ٹھیک ہے کہ وہ پروپیگنڈے کا یہ تیر بھی جو بہت موفع کا ہے صحابہ کرامؓ ہی کو نشانہ بنانے کی نیت سے چلائیں۔

یزید کا معاملہ اتنا نازک ہے کہ ان کے حق میں بالکل سیدھی اور معقول بات کہتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے، اس لیے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی جائے کہ مذکورہ بالا خطبے سے ہم صرف یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وہ بندروں، بچھوں کے ساتھ کھیلنے والا، شراب و کباب میں غرق، لہو و لعب میں مست اور زنا و قمار کا رسیا انسان نہیں نظر آتا جیسا کہ بتایا جاتا ہے۔ کیونکہ اس قماش کے لوگ ایسی محتاط و انشورانہ اور دین و دنیا کی نزاکتوں پر حاوی زبان نہیں بولا کرتے رہا یہ کہ وہ کوئی بڑا متقی و پرہیزگار ہو یہ اس خطبے سے نہیں نکالا جاسکتا۔ ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا۔ اور بظاہر ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ جس نسل اور جس طبقے سے تعلق رکھتا تھا اس کے بارے میں قرن اول کی نسل اور صحابہ کرام کے طبقے والے اتفاقاً و پرہیزگاری کی توقع تو بہر حال مشکل ہی سے کی جاسکتی ہے۔

ابن کثیر نے لکھا ہے کہ:-

وقد كان يزيدي في خصال محمودة	یزید میں بعض بڑی عمدہ خصلیں تھیں مثلاً
من الكرم والحلم والفصاحة و	علم و کرم، شہر و فصاحت، شجاعت اور
الشعر والشجاعة وحسن الرأي	امور سلطنت میں حسن رائے۔ اسی کے ساتھ
في الملك وكان فيه ايضا اقبال علي	اس میں خواہشات نفس کی طرف ایک گونہ
الشهوات وترك بعض الصلوات	بیلان اور بعض اوقات ترک صلوات کا عیب
في بعض الاوقات داماتھا	بھی تھا اور نمازوں کے بارے میں

فغالب الاوقات لہ

بے اہتہامی تو اس سے عموماً صادر ہوتی تھی۔

اس عبارت میں آخری دو باتیں رکبھی کبھی ترک نماز اور اکثر نمازوں کے سلسلے میں بے اہتہامی کے سوا اور جو کمزوریاں بیان کی گئی ہیں وہ ہمارے نزدیک بالکل بعید نہیں۔ فلسفہ تاریخ کے مطابق ان کمزوریوں کا دور شروع ہو چکا تھا۔ اور ایسی روایتیں ملتی ہیں جو ذمہ دارانہ جرح و تنقید کے عمل سے گزرنے کے بعد اس طرح کی کمزوری کا بڑید کے بارے میں گمان قابل قبول بنا دیتی ہیں، البتہ آخری دونوں باتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں ثبوت کی ضرورت ہے۔ جو ان کثیر نے فراہم نہیں کیا۔ علاوہ ازیں یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ دو اتنے سنگین عیب بڑید میں پائے جاتے اور اس کی ولی عہدی سے شدید اختلاف کرنے والے حضرات ان کی طرف اشارہ نہ کرتے جبکہ یہ چھپے رہنے والے عیب نہیں تھے۔ اور نہ ہی حقیقت میں یہ ہو سکتا تھا کہ حضرت معاویہ ایسے فرزند کو جو ترک نماز اور امت مسلمہ کا عادی ہو اس امت پر خلیفہ بنا کر مسلط کریں جس کی سب سے بڑی پہچان "اقامت صلوٰۃ" ہے۔ بہر حال وہ بڑا متقی نہ ہی لیکن ان عیبوں کی نسبت اس کی طرف بڑی زیادتی ہے جو مشہور کر دیئے گئے ہیں اور خاص کر یہ تو بالکل ہی بے بنیاد بات ہے کہ اختلاف کرنے والے حضرات اس کے کچھ عیبوں کو بھی اختلاف کی وجہ بتاتے تھے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی خدمت میں سوال بھیجا گیا کہ "حضرت معاویہؓ نے اپنے روئے بڑید پلید کو ولی عہد کیا ہے یا نہیں؟" آپ نے جواب تحریر فرمایا :
 "حضرت معاویہؓ نے بڑید کو خلیفہ کیا تھا اس وقت بڑید اچھی صلاحیت میں تھا۔"
 (فتاویٰ رشیدیہ (اصح) ایم سعید کینی کراچی) ۸۱-۲۸
 ایک اور سوال اسی مضمون کا آیا جس پر جواب تحریر فرمایا گیا :
 "بڑید اول صالح تھا بعد خلافت کے خراب ہوا۔" (فتاویٰ ص ۲۸۱)

لہ البلاء والنہایہ ج ۸ ص ۲۳۔

ضمیمہ

متعلقہ ۱۳۵

ایک اہم فائدہ

ہم نے تو یہ روایت صرف یہ دکھانے کے لیے نقل کی ہے کہ حضرت علیؑ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان کشمکش کی صورت ختم کرنے کے لیے حکمین نے جب یہ طے کیا کہ خلافت کے لیے کسی اور آدمی کا انتخاب کر لیا جائے تو اس کے لیے سب سے پہلا نام حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہی کا لیا گیا۔ لیکن یہ روایت اس لحاظ سے بھی بہت اہم ہے کہ ”تحکیم“ کے سلسلے میں واقعہ کی شکل اب تک یہ بتائی جاتی رہی ہے کہ حکمین (حضرت ابو موسیٰؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ) کے درمیان یہ بات طے ہوئی تھی کہ نہ علیؑ کی خلافت نہ معاویہؓ کی۔ بلکہ مسلمان کسی تیسرے آدمی کا انتخاب کر لیں، چنانچہ ان دونوں نے اپنی تنہائی کی اس قرارداد کے مطابق یہ طے کیا کہ مجمع کے سامنے آکر علیؑ اور معاویہؓ کی معزولی کا اعلان کر دیا جائے اور یہ اعلان پہلے ابو موسیٰؓ نے کیا اس کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ کھڑے ہوئے تو انہوں نے کہا کہ علیؑ کی حد تک میں بھی ابو موسیٰؓ کے اعلان سے متفق ہوں لیکن معاویہؓ کو معزول نہیں کرتا ہوں جس پر دونوں میں بڑی تلخ کلامی ہوئی اور جھگڑا بنا رہ گیا۔ یہ روایت بھی طبری ہی میں ہے (ج ۶ ص ۳۰-۳۹) لیکن جو روایت اوپر نقل کی گئی اس کی رو سے واقعہ کی شکل بالکل مختلف ہو جاتی ہے اور وہ اس لحاظ سے زیادہ قابل قبول بھی ہے کہ اول تو اس میں حضرت معاویہؓ کو ”معزول کرنے“ کی بے نیگ بات نہیں پائی جاتی۔ حضرت معاویہؓ کو خلافت کا دعویٰ نہیں تھا کہ ان کو ”معزول“ کیا جاتا۔ خلافت کا دعویٰ حضرت علیؑ کو تھا، حضرت معاویہؓ کو ان کی خلافت اس وقت تک تسلیم کرنے سے انکار تھا۔ جب تک کہ وہ خون عثمانؓ کا قصاص نہ دلوادیں۔ اس لیے معزولی صرف حضرت علیؑ کی

ہو سکتی تھی نہ کہ حضرت معاویہؓ کی۔ دوسرے، واقعہ کی یہ شکل، جو طبری ج ۶ ص ۳۲ والی روایت کی رو سے سامنے آتی ہے، اس میں اسلامی تاریخ کے ایک ہیرو اور صحابی رسول ﷺ (حضرت عمرو بن العاصؓ) کے دامن پر دھوکہ دہی کا وہ دھبہ بھی نہیں آتا جو نہایت شرمناک اور کسی طرح بھی آسانی سے قابل قبول نہیں کہ ایک بات تنہائی کی مجلس میں طے کی اور مجمع عام میں اس کے خلاف کیا۔

یہاں جو واقعہ کی شکل بیان ہوئی ہے اس کی رو سے حضرت ابو موسیٰؓ نے خلافت کے لیے متبادل نام کے طور پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا نام پیش کیا۔ اس کے آگے کا حصہ روایت میں یوں ہے کہ قال عمرو انی اسمی لك معاویة بن ابی سفیان۔ عمرو بن العاصؓ نے (ابو موسیٰؓ کا پیش کردہ نام نہ قبول کرتے ہوئے) کہا کہ میں معاویہ بن ابی سفیانؓ کا نام تجویز کرتا ہوں۔ اور اس کے بعد جیسا کہ واقعہ کی دوسری روایت میں، جو کہ مشہور ہے، آتا ہے دونوں حضرات میں تلخ کلامی ہوئی اور حضرت ابو موسیٰؓ اپنی مغلوبیت کے احساس سے بو جھل ہو کر بجائے حضرت علیؓ کے پاس جانے کے مکے واپس چلے گئے۔

اس روایت کی رو سے حضرت عمرو بن العاصؓ نے کوئی ایسی بات نہیں کی جس کی بنا پر انہیں بد عہدی اور دھوکہ بازی کا وہ الزام دیا جاسکے جو مشہور روایت کی بنا پر عائد ہوتا ہے، انہوں نے حضرت ابو موسیٰؓ سے کہا تھا کہ آپ نام پیش کریں اگر میرے لیے قابل قبول ہو تو لازماً قبول کر لوں گا ورنہ میرا دیا ہوا نام آپ قبول کریں گے۔ اس قرارداد کے بعد حضرت عمرو پر ذمہ داری نہیں آتی تھی کہ وہ حضرت ابو موسیٰؓ کا دیا ہوا نام قبول ہی کر لیں۔ البتہ حضرت ابو موسیٰؓ کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ روایت کے ظاہری الفاظ کے لحاظ سے ان پر ذمہ داری آتی تھی کہ حضرت عمروؓ کا دیا نام قبول کر لیں گے کیونکہ انہوں نے حضرت عمرو بن العاصؓ سے پلٹ کر یہ نہیں کہا کہ میں بھی تمہارے دیئے ہوئے نام کو قبول کرنے کا پابند نہیں بلکہ ان کی یہ بات سن کر کہ ”ورنہ پھر میں جو نام دوں گا آپ اسے قبول کریں گے“ فوراً ایک نام پیش کر دیا۔ البتہ الفاظ کے اس ظاہری مطلب کے برخلاف ہم حضرت ابو موسیٰؓ کی صفائی میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ”تحکیم“ کے خاص ماحول میں انہیں یہ گمان نہیں تھا کہ عمرو بن العاصؓ ”معاویہ بن ابی سفیان“ کا نام بھی پیش کر سکتے ہیں۔ ان کے خیال میں شاید یہ مناسب نہیں تھا..... اس لئے انہوں نے باوجود قول دینے کے اپنے آپ کو اس نام کے قبول کرنے کا پابند نہیں جانا۔ مگر صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ عبارت کا بالکل لفظی مطلب نہ لیا جائے اور سمجھا جائے کہ حضرت

ابو موسیٰ بھی حضرت عمرو کی طرح آزاد تھے کہ حضرت عمرو کی تجویز مانیں یا نہ مانیں۔ رہا یہ خیال، جیسا کہ شاید حضرت ابو موسیٰ کا تھا کہ عمرو بن العاص نے ایک ایسی بات کی جس کی قول و قرار کے الفاظ کی رو سے اگرچہ پوری گنجائش تھی مگر معاملات کے جس خاص ماحول میں حکامین کو اپنی ذمہ داری ادا کرنی تھی اس ماحول کے اعتبار سے یہ بات مناسب نہ تھی تو یہ ایک نقطہ نظر ہو سکتا ہے، جبکہ دوسرا نقطہ نظر یہ ہو سکتا ہے اور بظاہر وہی حضرت عمرو بن العاص کا تھا کہ عملی اعتبار سے امت کے مفاد میں اس وقت اس سے بہتر کوئی دوسری شکل دستیاب نہ تھی کہ خلافت — یا کہیے اسلامی اجتماعیت کی ذمہ داری — معاویہ بن ابی سفیان کے ہاتھ میں دیدی جائے۔ نظریت کی ترازو میں یہ بات سخت ناروا نظر آنے والی ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ کی موجودگی میں معاویہ بن ابی سفیان کو امت کی باگ ڈور سونپ دینے میں امت کی بھلائی سمجھی جائے۔ مگر جب ان حقائق پر نظر ڈالی جائے جو حضرت عمرو بن العاص کے سامنے پھیلے ہوئے تھے کہ مثلاً علی مرتضیٰ کو اپنی خلافت میں اتنا اختیار بھی حاصل نہیں تھا کہ وہ اپنی طرف سے حکم بھی اپنی مرضی کے مطابق مقرر کر سکیں۔ ابو موسیٰ اشعری کے تقرر کے حق میں وہ ایک منٹ کے لیے نہیں تھے۔ ہر ممکن کوشش کی کہ ایسا نہ ہو ان کے بجائے حضرت عبداللہ بن عباس کو مقرر کیا جائے۔ کیونکہ ابو موسیٰ اس ڈپلومیٹک کام کے لیے، اول تو، موزوں نہیں تھے، دوسرے حضرت علی کے کیمپ میں ہوتے ہوئے وہ حضرت علی کی جنگ پالیسی کے قطعی خلاف تھے اور لوگوں کو جنگ میں شرکت سے روکتے تھے۔ جس کا ذکر اس مضمون کے شروع میں بھی آچکا ہے۔ مگر بغاوت پر آمادہ ساتھیوں نے مجبور کیا کہ ابو موسیٰ ہی جائیں گے۔ اور وہ مجبور ہو گئے۔

حضرت علی کی طرف سے حضرت ابو موسیٰ کے تقرر پر اس سے بہتر تبصرہ نہیں ہو سکتا جو ابن اشیر کے محقق حاشیہ نگار نے کیا ہے کہ ”علیٰ اگر اپنے معاملہ کی نمائندگی کو معاویہ کے ہاتھ میں دے دیتے تو انہیں اتنا نقصان شاید نہ پہنچتا جتنا ابو موسیٰ کے ہاتھ میں معاملہ جانے سے پہنچا۔“ (ج ۳ ص ۱۶۹) بہر حال حضرت علیٰ اپنی ان تمام عظمتوں کے باوجود جن کے آگے سر نیاز جھکے بغیر نہیں رہ سکتا اپنے دائرہ اختیار میں روز بروز زیادہ بے اختیار اور عاجز و دربانہ ہوتے جا رہے تھے۔ ان کے ساتھی ان کی کوئی بات چلنے نہیں دیتے تھے حتیٰ کہ وہ تحکیم میں اپنی مرضی کا نمائندہ تک نہیں رکھ سکے تھے۔ اس کے برعکس معاویہ بن ابی سفیان نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ نہ صرف اپنی ذات سے معاملات پر پورا قابو رکھتے ہیں بلکہ انہیں جو قوم اور اعموان و انصار ملے ہیں وہ سب اس معاملہ میں ان کی دل و جان سے مدد کرتے ہیں۔ ایسی

حالت میں حضرت عمرو بن العاصؓ کو یہ بات سوچنے کا پورا حق تھا کہ کم سے کم فلاح و بہبود جو خون میں نہائی ہوئی اور عافیت کے لیے سرگرداں، اس امت کے لیے حاصل کی جاسکتی ہے وہ اب صرف اس صورت میں حاصل کی جاسکتی ہے کہ معاملات کی باگ ڈور پوری طرح معاویہ کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ جو واحد آدمی ہے کہ حالات کو قابو میں کر سکے.....

جیسا کہ ثابت بھی ہوا۔ دوسرا نام حضرت عبداللہ بن عمر کا سامنے آیا تھا۔ ہر واقف کار جانتا ہے کہ اپنی تمام بزرگیوں کے باوجود وہ اس میدان کے سرے سے آدمی ہی نہ تھے۔ اس وقت تو ایک زبردست انتظامی اور قائدانہ صلاحیت رکھنے والے آدمی کی ضرورت تھی، نہ کہ صرف نیک نفس کی۔ یعنی ٹھیک وہی بات جس کا فیصلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے آخری دور میں کیا (اور اوپر باب سوم میں اس کا ذکر آچکا ہے) کہ اجتماعی ذمہ داری اور نظم و نسق کے لیے ایک کم معیاری مگر مضبوط (اور بقول حضرت عمرو بن العاصؓ ڈاڑھ دانت والے) مسلمان کو ترجیح دی جانی چاہیے، اعلیٰ درجہ کے مگر کمزور اور کم موزوں مسلمان کو نہیں۔

طبری کی اس روایت میں جو تحکیم کے قصے میں عام طور پر مشہور ہے اور اس روایت میں جو ہم نے اوپر (طبری جلد ۶ ص ۳۹) سے نقل کی ہے، سند کے وزن کے اعتبار سے بھی بڑا فرق ہے۔ مشہور روایت کی سند ایک منقطع اور نامکمل سند ہے اور جو محل دوراوی "ابو مخنف" اور ابو جناب الکلبی "امام ابن جریر طبری نے اپنے سے اوپر ذکر کیے ہیں۔ ان دونوں میں ناقدین فن کو کلام ہے (ملاحظہ ہو لسان المیزان ج ۳ ص ۷۲ طبع بیروت اور تقریب التہذیب ج ۲ ص ۳۶۶) اس کے برعکس جو روایت ہم نے اوپر طبری ج ۶ ص ۳۲ کے حوالے سے نیز مصنف عبدالرزاق کے حوالے سے درج کی ہے اس کی سند نہایت صاف اور مکمل ہے۔

حدثنی عبد الله بن احمد (ابن حنبل) قال حدثنی ابی قال حدثنی سلیمان بن یونس بن یزید عن الزہری۔

ایسی روایت کے مقابلے میں ایک غلط قسم کی روایت مشہور ہو جانے کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ مشہور روایت "اجتماع حکمین" کے عنوان کے ماتحت آئی ہے اور غیر مشہور روایت "رفع مصاحف" کے زیر عنوان درج ہو گئی ہے۔ یعنی بے جگہ ہے۔

واللہ اعلم۔



باب ہفتم

حضرت امیر معاویہؓ کی وفات۔ عہد یزید کا آغاز حضرت حسینؓ کی ہجرت

۵۶ھ میں یزید کی ولی عہدی کے مسئلے سے فارغ ہونے کے بعد حضرت معاویہؓ چار سال زندہ رہے۔ رجب ۵۶ھ میں آپؓ نے اس حال میں وفات پائی کہ جن حضرات نے ۵۶ھ میں یزید کی ولی عہدی قبول کرنے سے انکار کیا تھا ان میں سے جو زندہ تھے وہ اپنے اسی انکار پر قائم تھے۔

یزید کو معاویہؓ کی وصیت

بیان کیا گیا ہے کہ آپؓ نے موت کے وقت اس سلسلے میں کچھ وصیت بھی یزید کو کی تھی اس وصیت کی روایتیں مختلف ہیں اور وصیت کی روایتوں کے اختلاف سے پہلے اس معاملے میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے کہ یہ وصیت بالمشافہ تھی۔ یعنی یزید اس وقت آپؓ کے پاس موجود تھے یا اس وقت وہ موجود نہ تھے بلکہ وصیت قلباً ذکر کے ان کے لیے چھوڑی گئی۔ ابن اثیر نے صراحت کے ساتھ عدم موجودگی کی روایت کو ترجیح دی ہے اور ابن کثیر کا بھی رجحان یہی معلوم

لے الکامل ج ۳ ص ۲۶۰

ہوتا ہے، اگرچہ صریح الفاظ میں یہ بات انہوں نے نہیں کہی ہے۔ موقوف کی تفصیلات پر نظر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہی فیصلہ اور رجحان صحیح ہے۔ وصیت کی روایتوں میں جو اختلاف پایا جاتا ہے، اس میں کچھ اختلاف ایسا بھی ہے جو جھوٹ اور سبج کی نوعیت کا حامل ہے۔ مثلاً سب سے پہلی روایت جو زید کو موجود اور بالمشافہ مخاطب بتاتی ہے اس کے مطابق حضرت معاویہؓ نے کہا کہ:-

”میں نے تمہاری طرف سے پوری دوڑ بھاگ کر لی ہے۔ ہر چیز ہو ار کر دی ہے دشمنوں کو زیر کر دیا ہے، کل عرب کی گردنیں تیرے لیے جھکا دی ہیں۔ اور اب سوائے قریش کے چار آدمیوں کے مجھے کسی کی طرف سے اندیشہ نہیں ہے کہ امر خلافت میں تجھ سے نزاع کرے۔ یہ چار ہیں حسین بن علی، عبداللہ بن عمر عبداللہ بن زبیر، عبدالرحمن بن ابی بکر۔ پس عبداللہ بن عمر کی بات تو یہ ہے کہ کثرت عبادت نے اب انہیں کسی کام کا نہیں رکھا ہے جب یہ دیکھیں گے کہ اور سب نے بیعت کر لی تو وہ بھی کر لیں گے، رہے حسین بن علی تو عراق والے انہیں تیرے مقابلے پر نکالنے بغیر چھوڑیں گے نہیں اگر ایسا ہی ہو اور وہ خروج کر بیٹھیں اور تم ان پر قابو پاؤ تو درگزر کرنا اس لیے کہ بہت قریبی رشتہ ہے اور بڑا حق ہے۔ تیسرے ابن ابی بکر ہیں وہ بس اپنے ساتھیوں کے نقش قدم پر چلیں گے۔ ان کی حوصلہ مندیلوں کا میدان تو بس عورتیں اور ایسی ہی دوسری لذتیں ہیں۔ ہاں وہ شخص جو تجھ پر شہر کی طرح گھاتا لگائے گا اور لوٹنی والی وہ چالیں چلے گا کہ ذرا تو اسے موقع دے تو وہ تجھ پر حبت لگائے وہ عبداللہ بن زبیر ہے۔ اگر وہ ایسا کرے اور تجھے اس پر قابو مل جائے تو ٹکڑے ہی کر ڈالتا۔“

اس وصیت میں جھوٹ کی آمیزش کا کھلا نشان حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ کا تذکرہ

ہے، ان کے بارے میں بہت تفصیل سے بحث گزر چکی ہے جس کی رو سے ان کی زیادہ سے زیادہ زندگی ۵۸ھ تک مانی جاسکتی ہے۔ حضرت معاویہؓ ۶۰ھ میں ان کی بابت کوئی وصیت نہیں کریں، یہ صرف ایک جھوٹ اور جعل ہو سکتا ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔ اور یہ بعد کے زمانے کے کسی ایسے آدمی کی جعل سازی ہے جو اس تاریخی حقیقت سے بے خبر تھا، نیز اس حقیقت سے بھی بے خبر تھا کہ حضرت معاویہؓ کی وفات کے وقت یزید کی موجودگی ثابت کرنا مشکل ہے۔ اس کے مقابلے میں طبری ہی نے اگلی سطروں میں جو وصیت نامہ درج کیا ہے جو یزید کی غیر موجودگی میں دو اہم اشخاص کے سپرد کیا گیا تھا کہ یزید کو دیا جائے اور جو عبدالرحمن بن ابی بکر کے بے محل اور بے حقیقت تذکرے سے بھی پاک ہے اس کا مزاج مذکورہ بالا وصیت سے بہت مختلف اور حضرت معاویہؓ کے دور اندیشانہ، فراعذلانہ، صلہ رحمانہ اور رعایا پر درانہ مزاج سے پوری طرح جوڑ کھاتا ہے۔ اس لیے اس کے بارے میں یقین کیا جاسکتا ہے کہ وہ فی الواقع حضرت معاویہؓ ہی کا ہوگا۔ اس وصیت نامہ کی روایت کے مطابق:-

”جب معاویہؓ کا وقت ۶۰ھ میں پورا ہوا اور یزید اس وقت موجود نہ تھے تو انھوں نے صحابہؓ بن قیس فہری کو جو ان کے پولیس افسر تھے اور سلم بن عقبہ المڑی کو بلا لیا اور ان سے کہا کہ میری وصیت یزید کو پہنچا دینا کہ اہل حجاز کا خیال رکھو جو تمہاری اصل ہیں۔ ان میں سے جو کوئی تمہارے پاس آوے اس کا اکرام کرو اور جو نہیں آتا ہو اس کی خبر رکھو اور عراق والوں کا بھی خیال رہے کہ وہ اگر تم سے روز ایک عامل (حاکم) معزول کرنے کا مطالبہ کریں تو ان کا مطالبہ پورا کر دو۔ اس لیے کہ ایک عامل کی معزولی اس سے کہیں بہتر ہے کہ ایک لاکھ لو اڑیں تمہارے خلاف حرکت میں آویں۔ اور اہل شام کا بھی خیال رہے کہ انھیں کو تمہارے رازداروں کا مرتبہ ملنا چاہیے۔ کبھی دشمن کی طرف سے کوئی چیلنج آئے تو ان کی مدد حاصل کرو۔ اور جب ہم تمام ہو جائے تو انھیں ان کے ملک کو واپس کر دو۔ اگر وہ غیر ملک میں زیادہ ٹھہرے تو وہاں کی

نصحتیں اختیار کر لیں گے اور (آخری بات یہ ہے کہ) مجھے قریش میں بس تین آدمیوں کی طرف سے (تھاری مزاحمت کا) اندیشہ ہے حسین بن علی، عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر۔ عبداللہ بن عمر کا جہاں تک سوال ہے تو دین (کی شدت) نے انہیں بالکل توڑ ڈالا ہے وہ اپنی ذات سے تمہارے مقابل کسی شئی کے خواہاں نہ ہوں گے۔

یہ ہے حسین بن علی تو وہ ذرا ہلکے آدمی ہیں اور میرا خیال ہے کہ جن لوگوں نے ان کے باپ کو قتل کیا اور ان کے بھائی کو بے سہارا چھوڑا انہیں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ان کو کافی ہو جائے گا۔ اور یہ یاد رکھنا کہ ان کا بہت قریبی رشتہ ہے، بہت بڑا سنی ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اہل عراق انہیں میدان میں لائے بغیر چھوڑ دیں گے۔ اگر ایسا ہوا تو تم ان پر قدرت پاؤ تو درگزر کرنا کیونکہ اگر میرے اور ان کے درمیان ایسی صورت پیش آتی تو میں درگزر ہی کرتا اور ہاں وہ جو ابن زبیر ہے وہ زبردست داؤں بان ہے۔ وہ سامنے آجائے تو کسر نہ چھوڑو، ہاں اگر صلح چاہے تو ضرور صلح کر لینا اور اپنی قوم (قریش) کا خون جہاں تک تم سے ہو سکے اس کو بہنے سے بچانا۔

بہر حال ان اختلاف کرنے والے تین حضرات کے بارے میں جو حضرت معاویہ کی وفات تک زندہ تھے تاریخی روایات کے مطابق حضرت معاویہ نے یہ سب کچھ وصیت کی تھی اور یہ تو بہن قیاس بھی ہے۔

۱۸۶ھ ۶ مئی ۱۸۶ھ خلافت معاویہ ویزید کے مصنف جناب محمود احمد جہاں مرحوم نے ایسی کسی وصیت سے انکار کرتے ہوئے ایک دوسرا وصیت نامہ اس میں درج کیا ہے جس میں یزید کی خلافت سے کسی کے اختلاف یا اختلاف کرنے والے حضرات کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک یہ مرحوم کے اس خلو کا نتیجہ ہے جو ان کی تصنیف پر چھایا ہوا ہے اور جس کے نتیجے میں وہ بعض قطعی طور پر ناقابل انکار باتوں سے بھی انکار کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں ماننا چاہتے کہ یزید کی وصی ہدی کے مسئلے میں جو حضرات اختلاف کر رہے تھے اس کی کچھ اہمیت تھی اس اختلاف سے متعلق جو بیادلت بدیہی طور سے ناقابل قبول تھے اور ہم نے بھی ان کو رد کیا، ان کی (بقیہ زندہ مضمون پر)

مخالفین سے بیعت کا مطالبہ

والد کے انتقال کی خبر پا کر زید کے دمشق پہنچنے کا ذکر گزشتہ باب میں آچکا ہے، اس خطبے سے فراغت کے بعد جو بطور امیر المؤمنین انہوں نے دمشق پہنچ کر دیا، موصیٰن کے بیان کے مطابق ان کا پہلا کام یہ معلوم ہوتا ہے کہ مدینے کے گورنر ولید بن عقبہ بن ابی سفیان (یعنی اپنے چچا زاد بھائی کو) حضرت معاویہ کی وفات کی اطلاع بھیجی اور ساتھ ہی یہ حکم بھی کہ عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر، اور حسین بن علی سے بیعت لی جائے۔ لیکن دو مختلف قسم کی روایتیں اس بارے میں ہیں، ایک روایت کہتی ہے:-

کہنا یہ ہے کہ حسین عبداللہ بن عمر اور	اما بعد فخذ حسينا وعبد الله
عبداللہ بن زبیر کو بیعت کیلئے پکڑو اس	بن عمرو وعبد الله بن الزبير
سنجی کے ساتھ کہ اس میں کوئی نرمی	بالبيعة اخذوا اشد يد اليست في
نہیں حتیٰ کہ بیعت کریں۔	رخصة حتى يبايعوا. والسلام

لیکن اس سخت ہدایت کے برخلاف ولید کا برتاؤ اس روایت میں اس قدر نرم دکھایا گیا ہے کہ وہ اپنے سے پیشتر کے اور جہاندیدہ گورنروں وان بن الحکم کو اس حکم کی تعمیل میں مشورے کے لیے بلاتا ہے کیونکہ اس پر اس حکم کی تعمیل بھاری ہو رہی ہے۔ اور یہ مشورہ پاتا ہے کہ

(مفہوم گزشتہ کاغذ پر) تردید مرحوم نے اس انداز سے کی کہ اختلاف کی مکمل کہانی ہی اس تردید میں لپیٹ جائے اور پھر جہاں حضرت معاویہ کی وصیت نے اختلاف کی کہانی میں از سر نو جان ڈالی وہاں انہوں نے اس طرح اسکی تردید کر دی کہ وصیت کے اس مضمون کو بغیر کسی ثبوت اور قرینے کے جعلی بنا کر ایک دوسرا وصیت نامہ الہدایہ الیہا کے حوالے سے درج کر دیا اس وصیت نامہ میں مضمون کے اعتبار سے کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ اس اختلاف کوئی ضرورت سمجھی جا سکے کہ جس وصیت کا جوکہ طبری کی روایت ہے اور الہدایہ الیہا میں بھی منقول ہے (جہاں صفا انکار کرنا چاہتے ہیں اس کے انکار کی کوئی معقول وجہ جب تک نہ ہو اس وقت تک انکار کا کوئی وزن تو نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا یہ بھی گزشتہ نامہ میں نقل ہو چکا، لہٰذا زید کا چچا زاد بھائی۔

لہٰذا خلافت معاویہ و زید طبع چہارم۔ کراچی۔ جون ۱۹۶۲ء۔ | بلکہ طبری ج ۶ ص ۱۸۵۔

عبداللہ بن عمر کی بات تو کچھ ایسی نہیں ہے، البتہ باقی دو کو اسی وقت بلاؤ اور بیعت نہ کریں تو گردن اڑا دو۔ اور جب تک بیعت نہ کریں یہ بھی مت بتاؤ کہ معاویہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ ورنہ ان کا حوصلہ بڑھ جائے گا۔ ینرید کے سخت حکم اور مروان کے سخت تر مشورے کے باوجود روایت یہ کہتی ہے کہ ولید نے کوئی سختی نہیں کی۔ حضرت ابن عمر کو تو بالکل ہی چھوڑ دیا البتہ حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت حسین کو بلانے کے لیے آدمی بھیجا۔ عبداللہ بن زبیر تو اس وقت آئے نہیں مگر حضرت حسین آگئے۔ اور حضرت معاویہ کی وفات پر تقریبی کلمات کہہ کر مطابقت بیعت کے سلسلے میں یہ عذر پیش کیا کہ:-

فان مثلنا لایطی بیعتہ سراً ولا
میرا جیسا آدمی تو خفیہ بیعت نہیں کیا
اراک تجتزیء بھامتی سراً
کرتا اور نہ میں سمجھتا ہوں کہ مجھ جیسے سے
ددن ان تظہرہا علی سادس
سری بیعت کو تم کافی سمجھو گے۔ جہود سے
التاس علانیۃ فاذا خرجت
کہ یہ علانیہ سب لوگوں کے سامنے ہو پس
الی الناس فادعوتہم الی
جب تم سب لوگوں کے واسطے بیعت کو
البیعت دعوتنا مع الناس
باہر نکل کر بیٹھو گے ہم کو بلوالینا۔ اس طرح
فکان امراً واحداً۔
سب کام ساتھ ہو جائے گا۔

اور یہ عذر ولید نے بلا حیل و حجت قبول کر لیا۔

فقال لہ الولید وکان یحیی
پس ولید جو عافیت پسند تھا اس نے کہا
العافیۃ فانصرت علی اسم اللہ
ٹھیک ہے اللہ کے نام پر آپ چلیے۔
حتی تا ینامع جماعۃ الناس۔
اور پھر لوگوں کے ساتھ آجائیے گا۔

اسی واقعہ کی دوسری روایت

طبری کی اس روایت کے برعکس ابن کثیر نے محمد بن سعد کے حوالے سے یہ روایت درج

لہ طبری ج ۶ ۱۸۹۔ ایضاً ۱۸۹۔ ۱۸۹۔ ایضاً۔

کی ہے کہ ۱۔

”۵ ارجب ۱۰ھ کی شب میں معاویہ کا انتقال ہوا اور لوگوں نے یزید سے بیعت کی۔ اس کے بعد یزید نے عبداللہ بن اویس حامری کے ذلیعہ ولید بن عقبہ بن ابی سفیان گوزر مدینہ کو مراسلہ بھیجا کہ اپنے وہاں کے لوگوں سے بیعت لیں اور تبدالہ عمائدین قریش سے کریں ان میں بھی خاص کر حسین ابن علی کو مقدم رکھیں کہ مرحوم امیر المؤمنین نے مجھے ان کے بارے میں خصوصی طور پر نرمی اور صلح جوئی کی وصیت کی ہے۔ پس ولید نے اسی رات ہی میں جب کہ یہ پیغام اسے ملا حسین اور عبداللہ بن زبیر کے پاس دیا بھیجا اور یہ بتاتے ہوئے کہ معاویہ کی وفات ہو گئی ہے ان سے کہا کہ امیر المؤمنین یزید کے لیے آپ سے بیعت بھی مطلوب ہے۔ ان حضرات نے کہا کہ اس کو صحیح پر رکھیے تاکہ اور تمام اہل مدینہ کا ولید بھی ہمارے سامنے آجائے اور یہ کہہ کر حسین اٹھ پڑے اور ان زبیر بھی ان کے ساتھ نکلے اور کہا ”اس یزید کو ہم جانتے ہیں نہ اس میں عزم ہے نہ موت“

وقد کان الولید اغلظ للحسین اور یہ بات یوں ہوئی کہ ولید نے حسین کے
فشتمہ الحسین واخذن بعمامته ساتھ سخت کلامی کی تھی پس حسین بھلی اسکو
فلزعها من رأسه فقال الولید سخت ست کہا اور اس کے سر سے عمامہ
ان هجنا بابي عبد الله الا شراً کھینچ لیا۔۔۔۔۔ اس پر مردان یا کوئی
فقال له مردان۔ او بعض جلساً مصاحب بولا کہ گردن مار دینی چاہیے۔
اقتلته فقال ان ذاك لدم ولید نے کہا کہ نہیں، بنی عبدمنات کا یہ
مصنون به مصون في بنی خون بڑا قیمتی اور قطعی محفوظ
عبد مناف ہے۔

۱۔ اس روایت کے مطابق دونوں حضرات ولید کے پاس آگئے تھے۔ مگر طبری کی روایت کے مطابق صرف حضرت حسین آئے اور یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ۲۔ البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۶۳۔

اس روایت میں معاملہ برعکس نظر آتا ہے کہ زید کی طرف سے نرمی کی خصوصی ہدایت ہو رہی ہے، مگر ولید ترش کلامی سے پیش آتا ہے۔ لیکن آخر میں یہ بھی ہے کہ اس کی پگڑی کھینچ لیے جانے کا واقعہ بھی حضرت حسین کے ہاتھوں پیش آگیا اور جس پر مروان یا کسی ہم جلسے تلوار اٹھانے کو کہا بھی تو اس نے بالکل وہ جواب دیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے نہ صرف زید کی ہدایت کا لحاظ تھا بلکہ وہ خود بھی حضرت حسین کے لیے کافی احترام دل میں رکھتا تھا اور یہی بات بعد کے واقعات بھی اس کے لیے ثابت کرتے ہیں جو آگے آئے ہیں۔

۱۔ طبری کی جس روایت کا اور جو الہ دیا گیا اس میں یہ ہے کہ مدینے نے اموی گورنر ادیر زید کے عمر زاد ولید بن عتبہ بن ابی سفیان حضرت حسین کے لیے نہایت گہرا احترام دل میں رکھتے تھے اور زیادہ کھل کر آئی ہے اس میں ہے کہ ولید نے جب حضرت حسین کے قدر پر کہا کہ درست ہے، آپ تشریف نے جاؤں کل ہی کو سب لوگوں کے ساتھ زحمت دی جائے گی تب مروان نے فوراً ہی کہا کہ "کیا غضب کرنے ہو یہ اگر اس وقت نکل گئے تو بہت بڑے کشت و خون کے بغیر بیعت کا سوال نہیں پیدا ہوتا"۔ اسپر بھی جب ولید نے اپنا رویہ بدلا اور حضرت حسین کو جانے ہی دیا تب مروان نے پھر ولید سے اپنی بات دہرائی کہ تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے، اب یہ قابو میں آنے والے نہیں۔ تب بھی ولید کے الفاظ طبری نے جواب میں یہ نقل کیے ہیں:-

و جمع غیرك يا مروان انك قد	تیرا بھلا ہو مروان تو نے میرے لیے وہ پابندی
اخذت لی التي نینها هلاك دینی	جس میں میری زندگی کی بربادی ہے۔ بخدا پوری
والله ما احب ان لی ما طلعت علیہ	دینا جس پر سورج طلوع و غروب ہوتا ہے اسکا
الشمس وغربت عنہ من مال	ملک مال بھی مجھے ملتا ہو تو قتال حسین کے بدلے
الدینا و ملکہا و اتی ثلاث حسیناً	میں مجھے پسند نہ ہوگا۔ سبحان اللہ میں حسین کو
سبحان الله اقل حسیناً ان قال	بس اس بات پر قتل کروں کہ وہ بیعت نہیں
لا ابا یع وال الله اتی لاطن ان امرأ	کرے ہے میں۔ واللہ میرا خیال ہے کہ جس شخص
یحاسب بدم حسین لطفیف المیزان	کو خون حسین کا حساب دینا پڑا وہ قیامت میں
عند الله یوم القیامت۔ (طبری ج ۶ ص ۱۹۰-۱۸۹)	ہلکی میزان والا ثابت ہوگا۔

نتیجہ بحث

پس حضرت معاویہ کی وصیت کی روشنی میں، ابن سعد کی روایت کی روشنی میں۔ جو زید کی طرف سے نرمی کی ہدایت دکھاتی ہے۔ اور ولید کے اس رویہ کی روشنی میں جس کی گواہی طبری کی پوری روایت دیتی ہے اور ابن سعد کی روایت کا آخری حصہ ہے۔ ہمارے لیے انصاف پسندی کی رو سے مناسب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ طبری کی روایت میں زید کی طرف سے جو سختی کی ہدایت پائی جاتی ہے اور ابن سعد کی روایت میں ولید کی طرف جو سختی کلامی منسوب کی گئی ہے، ان دونوں باتوں کو احکاماتی کاروائی سمجھا جائے۔ جب ۳۱ھ سے لیکر ۳۶ھ تک جبکہ حضرت حسین کا سانحہ شہادت پیش آیا، ہمیں طبری کی اس ایک موقع کی روایت کے سوا کوئی دوسری روایت نہیں ملتی جو حضرت حسین کے بارے میں زید کے سخت رویہ کی شہادت دیتی ہو، حالانکہ وہ اس دوران میں زید کی بیعت سے کج کر مدینے سے مکے چلے گئے، پھر مکے میں چار پانچ شہینے مقیم رہے جس میں کوفہ جانے کی تیاری ہوتی رہی، حتیٰ کہ پھر کوفہ کا سفر بھی شروع ہو گیا۔ مگر سمجھانے سمجھانے کی کوشش کا ذکر تو زید اور اس کے حکام کے بارے میں ملتا ہے، سختی یا داروگیر کا قطعاً نہیں ملتا، جبکہ اس کے برعکس حضرت عبداللہ بن زبیر کے ساتھ اسی دن سے جس دن سے وہ حضرت حسین کی طرح مدینے سے مکے کے لیے نکلے، ہر طرح کی سختی کی ہدایتیں زید کی طرف سے چلتی رہیں۔ اور اس کے حکام کی طرف سے داروگیر کی کوششیں مسلسل ہوتی رہیں۔ جیسا کہ آگے آئیگا۔

امام باقرؑ کی روایت

اور کسی کی نہیں خود حضرت امام باقرؑ کی روایت بھی اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ زید کی بیعت کے سلسلے میں حضرت حسین پر کوئی سختی روا نہیں رکھی گئی۔ ابن جریر طبری

اپنی سند بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :-

قال حدثنا عمار الدّھنی قال
قلت لابی جعفر حدّثنی
بمقتل الحسين کاتی حضرت
قال مات معاویة والولید بن
عنبه بن ابی سفیان علی المذنبه
فارس الی الحسين بن علی
لیأخذ بیعتہ فقال لہ اخرجنی
واسرفق فاخرکة فخرج الی
مكة لہ

ہم سے عمار دہنی نے بیان کیا کہ میں
نے ابو جعفر (امام باقر) سے عرض کی کہ
مجھے قتل حسین کا قصہ اس طرح سنائیے
کہ جیسے میں وہاں موجود تھا، اسپر آپ نے
فرمایا معاویہ کا انتقال ہو اور ولید بن
عنبہ بن ابی سفیان اس وقت حاکم مدینہ
تھے پس انہوں نے زید کی بیعت کیلئے
حسین کو بلاوا بھیجا۔ آپ نے کہا اذرا
مؤخر کرو اور نرمی برتو، اس نے مؤخر
کر دیا تب آپ مکے کے لیے نکل گئے

مکہ کو روانگی

بہر حال حضرت حسین کی فرمائش پر کہ بیعت کا معاملہ مؤخر کر دیا جائے (کیونکہ ان کا
جیسا آدمی تنہائی میں بیعت کرے یہ کوئی مناسب بات نہیں بلکہ جب تمامی اہل مدینہ
بیعت کے لیے بلائے جائیں اسی وقت وہ بھی آجائیں گے اور سب کا ساتھ ہی ہو جائیگا)
ولید نے آپ کو رخصت کی اجازت دیدی اور آپ نے جیسا کہ ابھی حضرت امام باقر کی
روایت سے گزرنا مکہ کی راہ لے لی۔ مکہ کو آپ کی یہ روانگی ۲۷ یا ۲۸ رجب سنہ ۶۰ ھ کیشنبہ
کی رات میں ہوئی۔

اوپر طبری کے حوالے سے گزر چکا ہے کہ ولید نے حضرت عبداللہ بن عمر کو توجہ چھوڑ دیا

لہ طبری ج ۶ ص ۱۹۴ لہ ایضاً ص ۱۹

تھا۔ مگر حضرت حسین اور حضرت عبداللہ بن زبیر کے پاس بیک وقت آدمی بھیجا تھا، جس پر حضرت حسین نے تو اسی وقت ولید سے ملنے کا فیصلہ کر لیا اور تشریف لے گئے مگر حضرت زبیر نے اس کو مصلحت نہ جانا اور پھر بار بار تقاضوں کو ٹالتے ہوئے رات ہی میں مکہ کے لیے نکل گئے اور پھر اگلی رات میں حضرت حسین نے بھی مکے کی راہ لی۔ طبری میں ہے کہ ابن زبیر کے نکل جانے کی وجہ سے حکومت کی تمام تر توجہ چونکہ ابن زبیر کی تلاش پر مرکوز رہی اس لیے اس صبح کو وہ حضرت حسین کی طرف توجہ ہی نہ کر سکے اور شام کو جب توجہ کی تو آپ نے فرمایا کہ اب تو رات ہو رہی ہے صبح کو دیکھیں گے اور پھر اسی رات آپ بھی مکے کیلئے نکل گئے۔

پورے کنبے کے ساتھ

بتایا گیا ہے کہ حضرت حسین نے اپنے پورے گھرانے کو ساتھ لیا۔

خرج ببنيه و اخوته و بنی آپ نکلے اپنے بیٹوں اور بھائیوں اور بھتیجوں
 اخيه و حبل اهل بيته کے ساتھ اور گویا تمام کنبدہ ہی ساتھ تھا
 الامحمد بن الحنفية۔ ؑ سوائے بھائی محمد بن حنفیہ کے۔

جبکہ حضرت عبداللہ بن زبیر نے (غالباً وقت کی تنگی اور اندیشوں کی زیادتی کی وجہ سے) حضرت ایک بھائی جعفر بن زبیر کو ساتھ لے کر سفر کیا۔ ان کے بارے میں یہ بھی تصریح کی گئی ہے کہ

سہ طبری ج ۶ ص ۱۹۰، ابن اثیر ج ۳ ص ۲۶۲، ابن اثیر نے طبری کی مذکورہ روایت کو جن الفاظ میں درج کیا ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بلائے کا واقفوں میں پیش آیا تھا اور ابن زبیر اسی رات کے آخری حصہ میں مکے کیلئے نکل گئے۔ ابن کثیر کی روایت جو اوپر درج کی گئی اس کی رو سے بلاو آدمی رات کو ہوا تھا اور پھر اگلی رات کو ابن زبیر مدینے سے نکلے۔ اور چونکہ یہ مسلم ہے کہ حضرت حسین ان سے ایک رات بعد نکلے ہیں اس لیے گویا حضرت بلاوے کے بعد دو دن اور ایک رات مدینے میں گزاری۔ طبری کے الفاظ صاف نہیں ہیں اس لیے ہماری نظر میں ترجیح ابن اثیر کے بیان کو ہے۔

سہ ایضاً۔ ؑ ایضاً۔

”طریق اعظم“ (شاہراہ) سے بچ کر ایک ذیلی راستے (طریق الفرج) سے سفر کیا تھا اور یہ کہ جیسے ہی پتہ چلا کہ وہ مدینے سے نکل گئے ہیں اور اندازہ کیا گیا کہ سواکے مکہ کے اور کہیں نہیں جاسکتے تو تقریباً اسی سواروں کے ایک دستے کے ذریعہ ان کی تلاش اور تعاقب کیا گیا مگر چونکہ وہ عام راستے سے نہیں بلکہ غیر معروف راستے سے گئے تھے اس لیے تعاقب ناکام رہا۔

شاہراہ سے سفر

حضرت عبداللہ بن زبیر کے بارے میں متقابل انداز سے کی گئی اس تصریح کے کہ انہوں نے مکہ اور مدینہ کی شاہراہ (طریق اعظم) سے بچ کر کسی ذیلی اور ضمنی راہ کو اپنایا اور خود بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت حسینؑ نے بچ بچا کر جانے کے بجائے عام راستے سے سفر کیا، مزید برآں چند صفحات کے بعد طبری کی ایک روایت میں اس کی تصریح بھی آتی ہے کہ آپ کے اہل بیت نے مشورہ دیا تھا کہ شاہراہ سے بچ کر سفر کیا جائے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن زبیر نے کیا مگر آپ نے اسے منظور نہ فرمایا اور کھلی شاہراہ سے ہی سفر کیا۔ آپ کے سفر کے سلسلے میں کسی تعاقب کا ذکر نہیں ہے۔ ۳ شعبان ۶۰ھ شب جمعہ میں آپ نجیر و عافیت پورے قافلے کے ساتھ مکہ معظمہ پہنچ گئے۔

نجیر خواہوں اور عقیدتمندوں کے مشورے

۱۔ اوپر ذکر آیا کہ حضرت حسین کے قافلے میں آپ کے بھائی محمد بن حنفیہؑ ساتھ نہیں ہوئے، اس روایت میں وہیں ان کی زبان سے یہ بھی کہلوا یا گیا ہے کہ:-

۱۔ طبری ج ۶ ص ۱۹ ۲۔ طبری ج ۶ ص ۱۹۶ ۳۔ البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۵۸۔ ۴۔ حضرت حسین کے یہ بھائی حضرت فاطمہؑ سے نہیں بلکہ حضرت علیؑ کی ایک دوسری اہلیہ سے تھے۔

بیمدرجبت اور خلوص رکھتے تھے۔ جنگ جبل اور جنگ صفین میں جہاں تینوں بھائی حضرت علی کے دوش ببدوش ہوتے تھے وہاں حضرت علی خود جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں پھولوں (دیجائنتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی حفاظت پر نظر رکھتے تھے وہاں محمد بن حنفیہ کو بھی ہدایت فرماتے کہ ان کو اپنے سے جدا اور آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دینا۔ حالانکہ وہ عمر میں چھوٹے تھے مگر جسمانی طاقت اور قد و قامت میں غیر معمولی جس کے بعض باؤگا تھتے ہیں، مذکورہ بالا عبارات میں حسن ادب اور لطافت بیان کے پردے میں صاف جھلب رہا ہے کہ وہ حضرت حسینؑ کے اندر خیالات کے طوفان کو سمجھ رہے ہیں اس طوفان کے اندر کون کی سمت سفر بھی انھیں نظر آ رہی ہے، جبکہ وہ دونوں باتوں کے حق میں نہیں ہیں۔ مگر اس انداز سے حق خلوص اور امانت مشورہ ادا کرتے ہیں کہ ادب اور لطافت بلائیں لیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت محمد بن حنفیہؑ حضرت حسنؑ کے ہمراہ تھے اور جنگی کے ساتھ رائے قائم کر چکے تھے کہ ان کے والد کی شہادت حالات کے جس دھاڑے میں ہوئی ہے اسکو سلنے سے روکنے اور موڑنے کی کوشش میں نقصانات ہیں فائدہ کوئی نہیں ہے۔ چنانچہ آپ نہ صرف یہ کہ حضرت حسینؑ کے ساتھ نہیں نکلے بلکہ اپنی اولاد میں سے بھی کسی کا نکلنا پسند نہیں کیا۔ اور اس سے بھی آگے کی بات یہ ہے کہ جب شہادت حسینؑ کے تین سال بعد تقریباً پورا

حضرت عائشہؓ صدیقہ کو مجربین عدی کے قتل کی خبر پہنچائی گئی (جو حضرت معاویہؓ پر کیے جانے والے اعتراضات میں سے ایک بہت نمایاں اعتراض ہے) آپ کو اس خبر سے بہت صدمہ ہوا مگر ساتھ ہی یہ فرمایا کہ اگر یہ بات نہ ہوتی کہ ہم نے جس برائی کو بھی روکنے اور بدلنے کی کوشش کی تہمید میں اس سے بھی بڑی برائی پیدا ہوگئی تو مجربین کے قتل پر بھی ہم کچھ کیے بغیر نہ رہتے۔ "لولا انما لم نغیر شیئاً الا صارت بنا الامور الی ما ہوا شد منہ لغیرنا قتل جحر"۔ (ابن اثیر ۳/۲۴۲) بظاہر یہی نقطہ نظر حضرت حسنؑ اور حضرت محمد بن حنفیہؑ کا تھا۔ مجربین عدی کے قتل پر حضرت عائشہؓ کا مذکورہ تاثر ذکر میں آجانے کے بعد یہ بات بھی ذکر کر دینا مناسب ہے کہ اس قتل کے سلسلے میں حضرت عائشہؓ نے حضرت معاویہؓ کا یہ عذر قبول کر لیا تھا کہ "مجربین زندگی سے جس فتنہ و فساد کا اندیشہ تھا اسکا سد بابا کسی ایک جان کے مقابلے میں زیادہ قابل لحاظ تھا۔ (حوالہ سابق) سہ البدایہ والنہایہ ج ۸/۱۶۵

مدینہ حضرت عبداللہ زبیر کے زیر اثر زید کے خلاف بغاوت کا علم اٹھا کے کھڑا ہو گیا تب بھی حضرت محمد بن حنفیہ ہی اہل مدینہ میں سے وہ میسرے بزرگ تھے جن کا نام حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ آتا ہے کہ وہ صاف طور پر اس بغاوت کے مخالف رہے۔ میسرانام حضرت زین العابدین بن علی بن الحسینؑ کا بھی اسی فہرست میں ہے۔

ایک اور روایت

البدایہ والنہایہ میں مزید برآں ایک روایت اور ہے کہ مکے پہنچنے کے بعد حضرت حسینؑ نے کسی کو مدینے بھیجا تاکہ بنی عبدالمطلب میں سے جو افراد ان کے ساتھ آنے سے رہ گئے ہیں وہ بھی آجائیں۔ چنانچہ جن کو آتا تھا وہ آئے اور بعد ازاں حضرت محمد بن حنفیہ بھی (غالباً حج کے موقع پر) مکہ تشریف لے آئے۔

فادرك حسيناً بمكة فاعلمه ان	اور وہاں حسینؑ کو موجود پایا تو ان سے کہا
الخروج ليس لذي برأى يومه	کہ ان کی رائے میں اس وقت خروج کا نیکل
هنا فابى الحسين ان يقبل	بالکل مناسب نہیں ہے (یعنی زید کے خلاف
فحبس محمد بن حنفية ولداً	اقدام کے خیال سے کوئے کا ارادہ حسین
فلم يبعث احداً منهم حتى	نے رائے قبول نہیں کی۔ اور محمد بن حنفیہ نے
وجد الحسين في نفسه على محمد	اپنی اولاد میں سے کسی کو ان کے ساتھ
وقال ترغب بولدك عن	نہیں بھیجا جس پر حسین کو ان سے رنج
موضع اصاب فيد؛ فقال دما	ہوا اور کہا کہ تم اپنی اولاد کو میری جان سے
حاجتي الى ان تصاب ويصابوك	زیادہ عزیز رکھ رہے ہو؟ اپنے جواب
معلك وان كانت مصيبتك	دیا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں تو آپ

لہ دیکھیے صفحہ ۶۳ کے واقعات کا بیان۔ البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۲۱۸۔

اعظم عندنا منهم لہ
 اور کیوں وہ آپ کے ساتھ مصیبت
 میں پڑیں۔ اگرچہ یہ اپنی جگہ واقعہ ہے
 کہ آپ کی مصیبت میرے لیے انکی
 مصیبت سے بڑھ کر ہے۔

دونوں روایتوں کے لہجے کا فرق

طبری کی روایت میں جو لطافتِ اظہار اور حسنِ ادب ہم نے محسوس کیا تھا البدایہ و النہایہ کی اس روایت کا لہجہ اس سے بالکل مختلف ہے، ہو سکتا ہے اس میں کچھ دخل کسی راوی کی بے احتیاطی کا ہو لیکن فی نفسہ لہجے کے فرق کی وجہ سمجھنا کچھ ایسا مشکل بھی نہیں ہے، پہلی روایت کا لہجہ اس وقت کا ہے جب حضرت حسینؑ کا مدینہ چھوڑنا ان کی سلامتی کیلئے ضروری یا کم از کم مناسب سمجھا جاسکتا تھا اور مکہ سے بہتر کوئی جگہ اس کے لیے نہیں ہو سکتی تھی چنانچہ حضرت محمد بن حنفیہ نے مکہ ہی کا مشورہ دیا تھا۔ کوفے کے ارادہ کی بات حضرت محمد بن حنفیہ کے لیے اس وقت بس ایک اندیشے اور امکان کے درجہ کی تھی۔ چنانچہ آپ نے کافی سمجھا کہ اشاروں کنیوں کے لطیف انداز میں اس کے خلاف رائے دیدی جائے۔ مگر اس دوسری روایت والی گفتگو کا وقت وہ ہے جب حضرت محمد بن حنفیہ دیکھتے ہیں کہ حضرت حسینؑ ان کے بیچد مخلصانہ، محتانہ اور دور اندیشانہ مشورے کو نظر انداز کر کے نہ صرف خود کوفے کا عزم کر رہے ہیں بلکہ خاندان کے چھوٹے بڑے اور عورت مرد ہر فرد کو ساتھ لے جا رہے ہیں۔ جو ان کے نزدیک موت کے منہ میں جانے والی بات تھی۔ تو ان کی شدتِ خلوص کا تقاضا اب یہ ہوا کہ لہجے کی ادنیٰ لطافتیں ہٹا کر بے لوجج صراحت سے کام لیا جائے جو شاید کام کرنا محبت کرنے والا چھوٹا اگر بڑے کو موت کے منہ میں جاتا ہوا دیکھے گا تو ذرا البعید نہیں کہ وہ

سہ البدایہ و النہایہ ج ۸ ص ۱۶۵

اس انجام کو روکنے کے لیے بے ادب صاف گوئی کی جرأت بھی کر جائے۔ بعض روایتیں بتاتی ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ بڑے ہونے کے باوجود حضرت جنؓ حسینؓ کے نسبی احترام میں چھوٹے بن جایا کرتے تھے مگر آگے آئیگا کہ جب دیکھا کہ حضرت حسینؓ ان کی سنتے ہی نہیں ہیں، خاص کر یہ کہ عورتوں بچوں کو چھوڑنے کے مشورہ پر بھی توجہ نہیں کرتے تو حضرت ابن عباسؓ کے فطوٰص اور غمخواری کا لہجہ بھی ایسا ہی تیز اور تیکھا ہو گیا تھا۔ بہر حال یہ تو قطعی واقعہ ہے کہ حضرت ابن حنیفہ کی اولاد میں سے کوئی فرد حضرت حسینؓ کے قافلے میں شامل نہیں تھا۔ اور یہ خود ایک سخت موقف کی دلیل ہے۔

۲۔ طبری کے سلسلہ روایات میں دوسرا نام حضرت عبداللہ بن مطیع کا آتا ہے۔ یہ ان کم عمر صحابہ میں ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں سن تیز کو نہیں پہنچ پائے تھے۔ یعنی حضرت حسینؓ سے کچھ چھوٹے تھے۔ واقعہ کربلا (۶۱ھ) کے بعد ۶۳ھ میں جو واقعہ حسہ پیش آیا ہے۔ جو یزید کے خلاف اہل مدینہ کی بغاوت اور معرکہ آرائی کا نام ہے اس کے دو نمایاں قائدوں میں سے ایک یہی عبداللہ بن مطیع تھے اس معرکہ کی ناکامی کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیر کے پاس مکے چلے گئے اور وہاں آپؐ ہی کے ساتھ حجاج سے مقابلہ میں شہید ہوئے۔ ان عبداللہ بن مطیع کے بارے میں آتا ہے کہ جب سینی قافلہ مدینے سے مکے جا رہا تھا تو یہ بھی کہیں سے (شاید مکے ہی سے) آتے ہوئے ملے اور سفر کا قصہ جاننے کے بعد لہجہ ادب و احاح گزارش کی کہ کونہ کا قصد ہرگز نہ فرمائیے گا۔ ان لوگوں کے کردار کو بھول نہ جائیے گا۔

۳۔ ابن سعد کی روایت یہ ہے کہ حضرت حسینؓ اور حضرت ابن زبیرؓ ایک ہی رات میں مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ کیلئے نکلے تھے۔ اس روایت کے حوالے سے ابن کثیر نقل کرتے ہیں کہ اتنا ہی راہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی عمرہ سے واپس آتے ہوئے ملے اور ان دونوں صاحبان سے کہا کہ:-

لے الاصابہ فی تمیز الصحابہ ج ۵ ص ۶۶-۶۵ طبری ج ۶ ص ۱۹۶

اذکو كما الله الامر جعنا مذ خلتما
 فی صالح ما یدخل فیہ
 الناس وینظلم فان اجتمع
 الناس علیہ نلعم لشداد ان
 افترقوا علیہ کان الذی
 تریدان یلہ
 میں اللہ کا واسطہ دیکر تم دونوں سے
 کہتا ہوں کہ لوٹ چلو تاکہ جو مناسب بات
 اور لوگ اختیار کریں تم بھی اس کو اختیار
 کر لو اور دیکھو۔ پھر اگر لوگ پوری طرح
 ایک بات پر متفق ہو گئے تو تم آخر ان
 کو نہ والوں میں سے نہیں ہو گے اور اگر اختلاف
 ہوا تو تمھاری مراد پوری ہو جائیگی۔

نیز خاص طور سے حضرت حسینؑ سے کہا کہ:-

”اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار دیا تھا کہ ذریعہ اور آخرت میں
 جس ایک چاہیں پسند کر لیں آپ نے آخرت پسند فرمائی اور تم آپ ہی کا مکر اور آپ کی ذات
 کا حصہ ہوا سلیے تمہیں دینا نہ مل سکے گی پس یہ ارادہ خرچ چھوڑ دو۔“ یہ کہہ کر آپ نے حضرت
 حسین کو گلے سے لگایا اور رو پڑے۔“

اس سلسلہ بیان میں آگے بتایا گیا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ درخ و قلیق کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ:-

”غلبننا حسین بن علی بالخروج“ حسین بن علیؑ نے کوفہ کے قصد کے معاملے میں ہماری بات
 مان کر نہ دی حالانکہ انہوں نے اپنے باپ اور بھائی کا عبرت انگیز حال دیکھا تھا کہ کیسے فتنے
 اٹھائے گئے تھے اور بیچ میدان میں لگا ساتھ دینے سے انکار کر دیا گیا تھا انہیں عمر عمرؓ کسی خرچ
 کا نام نہ لینا تھا اور لوگوں کے عمومی فیصلے میں شامل ہو جانا تھا اس لیے کہ جماعت میں خیر ہے۔“

لہ البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۶۲۔ س ۱۶۳۔ بطبری میں یہ واقعہ اس وقت کا بتایا گیا ہے جب حضرت حسینؑ کوفہ
 سے کوفہ کیلئے روانہ ہو گئے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ پر آئے تھے انھیں بعد فراغت حج یہ اطلاع ملی تو آپ نے فرمایا
 ان کے پیچھے روانہ ہوئے اور راہ میں لکھنویہ کی طبری ج ۶ ص ۱۶۲۔ س ۱۶۳۔ حضرت حسینؑ نے کربلا کے میدان میں جب اپنے بلائیوں والوں
 ہی کو اپنے مقابل صف آرا پایا کہ انھیں مخاطب کیا تو ان میں یہ دو نام بھی لیے تھے شہیدیت ابن ربیع اور یس ابن
 اشعث۔ ان میں سے شہیدیت تو خود ان افراد میں تھا جن کی طرف حضرت ابن عمرؓ کا اشارہ ہے۔ اور یس کے والد اشعث صحیفین
 میں ایسے سب لوگوں کے سربراہ تھے۔ حضرت حسینؑ کا خطاب آگے اپنی جگہ پر آیا گیا۔ س ۱۶۳۔ لہ البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۶۳۔

باب ہشتم

مکہ میں ورود۔ اہل کوفہ کے خطوط۔ اور وفود مسلم بن عقیل کا مشن

بہر حال حضرت حسینؑ شہبان سنہ ۶ کی ہم تاریخ کو مکے پہنچ گئے اور دارِ عباس میں تیار کیا۔ جیسا کہ ہونا ہی چاہیے تھا آپ کے پاس لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ ان میں اہل مکہ بھی تھے اور عمرہ وغیرہ کے لیے آنے والے بیرونی لوگ بھی۔ خبر کوفہ سے بھی پہنچ گئی۔ اور رمضان میں وہاں سے شیعانِ علیؑ کے خطوط لیکران کے قاصد بھیجا شروع ہو گئے۔ ایک کے بعد ایک چار پانچ کھپوں میں کم سے کم کوئی ڈیڑھ سو خطوط پہنچے جو نمایاں لوگوں کے تھے، یہ خطوط دعوتی تھے کہ آپ یہاں تشریف لے آئیے جانتار ان چشم براہ ہیں۔ پہلے خط کا مضمون جو طبری نے دیا ہے اس طرح ہے :-

”سلمان بن صرد، میثب بن بجز، رفاعہ بن شداد، حبیب بن مظاہر اور جملہ شیعان کوفہ کی طرف سے حسین بن علیؑ کے نام۔ بعد از سلام! خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے آپ کے دشمن جابر کا قصد پاک کیا جس نے ناحق حکومت پر قبضہ کر رکھا تھا۔ اب اس وقت ہمارا کوئی امام نہیں ہے۔ آپ تشریف لے آئیے کہ شاید اللہ

تلہ البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۶۲۔ تلہ بظاہر حضرت معاویہؓ کے انتقال کی طرف اشارہ ہے۔

آپ کے ذریعہ ہم لوگوں کو حق پر جمع کر دے۔ یہاں جو اموی گورنر نعمان بن بشیر ہیں ہم ان کے پیچھے جمعہ اور عید تک نہیں پڑھتے اور اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ آپ ادھر کے لیے روانہ ہو گئے ہیں تو ہم انشاء اللہ ان کا بستر باندھ کر انہیں شام بھیج دیں گے۔

اس طرح کے خطوط کی جو بارش ہوئی اور طبری کے بیان کے مطابق ہر دو دن کے فاصلے سے ایک کھیپ روانہ ہوئی۔ تو حضرت محمد بن حنفیہ کا ڈھکا ہوا اور عبد اللہ بن مطیع کا کھلا ہوا نہایت اخلاص اور اسحاق کے ساتھ مشورہ کہ کونے کا رخ ہرگز نہ کیجئے گا، بے اثر ہو گیا اور ان حضرات نے جس قدر زور دیکر یہ بات کہی تھی اس سے لگتا ہے کہ ان کو خطرہ بہت تھا کہ کونے والے بلائیں گے اور حسینؑ اپنے آپ کو روک نہ پائیں گے۔ بہر حال ان بلاؤں کا اثر ہوا اور تاریخ کے بیان کے مطابق آپ نے طے کیا کہ اپنا ایک آدمی کو ذمہ بھیج کر اطمینان کریں کہ کیا واقعی یہ لوگ جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ قابل اعتماد ہے؟

مسلم بن عقیلؓ کو فئے کو

اس مقصد کے لیے آپ نے اپنے چچیرے بھائی مسلم بن عقیلؓ کا نام طے کیا اور کونے کے جو لوگ خطوط لیکر آئے ہوئے تھے انکو اس مضمون کا جواب لکھ کر روانہ کر دیا کہ ”میں اپنے چچیرے بھائی مسلم بن عقیلؓ کو آپ لوگوں کے پاس بھیج رہا ہوں کہ یہ میرے قائم مقام بن کر حالات کو دیکھیں اور مجھے اطلاع دیں۔ پس اگر انہوں نے اطمینان ظاہر کیا اور لکھا کہ آپ لوگ جو کچھ مجھے لکھ رہے ہیں اس پر آپ کے تمام معززین اور اہل رسوخ و اہل راکے کا اتفاق ہے تو میں بلا تاخیر چلا آؤں گا۔ اس لیے کہ قسم میری جان کی ام تو وہی ہے جو کتاب اللہ پر حال، انسان کا خوگر، حق کا تابع اور اپنے آپ کو ذات حق سے وابستہ رکھنے والا ہو۔

والسلام! اور فوراً ہی پھر مسلم بن عقیل کو دو کوفیوں کے ساتھ ان کے مشن پر روانہ کر دیا۔

والی کوفہ حضرت نعمان بن بشیرؓ کا ابتلاء

مسلم بن عقیل کوفہ پہنچے تو ان کی آمد زیادہ دن مخفی نہیں رہ سکی، ان کی سرگرمیاں محفی رہیں جو وہ حضرت حسینؓ کے واسطے لوگوں سے بیعتِ امامت لینے کے سلسلے میں کر رہے تھے۔ حضرت نعمان بن بشیرؓ جو انصارِ مدینہ میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی تھے، وہ حضرت معاویہؓ کے وقت سے کوفہ کے گورنر سے چلے آ رہے تھے۔ ان کو اطلاع ملی تو مسجد میں لوگوں کو جمع کرایا اور تقریر کی کہ:-

”اے لوگو! آرائی اور تفرقہ انگیزی میں مت پڑو۔ اس میں ناحق جانیں جاتی ہیں خون بہتا ہے اور مال چھنتے ہیں۔ میری پالیسی اس معاملہ میں سن لو کہ جب تک مجھ پر حملہ نہیں ہو گا میں کسی پر حملہ نہیں کروں گا، نہ تمہیں برا بھلا کہوں گا، نہ شہبے اور تہمت میں پکڑوں گا۔ لیکن تم نے اگر اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنایا، بیعت توڑی اور امام (زید) کے خلاف کھڑے ہوئے تو قسم ہے خدا کے پاک کی میں تم پر تلوار چلاؤں گا جب تک بھی میرا ہاتھ اس کے قبضہ پر رہے گا، چاہے تم میں سے کوئی بھی میرا ساتھ دینے والا نہ ہو۔ ویسے مجھے امید یہ ہے کہ تم میں وہ لوگ زیادہ ہونگے جو حق کا حق پہچانتے ہیں، یہ نسبت ان لوگوں کے جو باطل کیلئے حق کا نام لیتے ہیں۔“

امیر بزرگ و شکر کا بیت

عبداللہ بن مسلم حضری نامی ایک صاحب جو بنی اُمیہ کے حلیفوں میں سے تھے انھوں نے گورنر کی یہ تقریر سن کر کہا یہ تو مناسب پالیسی نہیں، نہایت کمزور پالیسی ہے جو فتنہ انگیزوں کو

شیر کر دے گی۔ حضرت نعمان بن بشیرؓ اس کے باوجود بھی اپنی پالیسی میں تبدیلی کرنے کو تیار نہ ہوئے۔ نبی امیت کے خیر خواہ نے یہ صورت حال امیر زید کو لکھ کر بھیجی اور لکھا کہ اگر تمہیں کوئی پر حکومت رکھنے کی ضرورت ہے تو فوراً کسی مضبوط آدمی کو یہاں بھیجو، نعمان کمزور آدمی ہیں یاد آتے کمزوری دکھائے ہیں۔ اور بھی چند لوگوں نے اسی مضمون کے خط زید کو لکھے۔

عبید اللہ بن زیاد کا تقرر

یزید نے ان اطلاعات کے بعد اپنے اہل مشورہ کی رائے کے مطابق حضرت نعمان بن بشیرؓ کی جگہ عبید اللہ بن زیاد کا تقرر کیا۔ اس سے پہلے وہ بصرہ کا حاکم تھا۔ اب بصرے کے ساتھ کوفے کی حکومت بھی اس کے سپرد کی گئی اور ہدایت دی گئی کہ فوراً پہنچ کر مسلم بن عقیلؓ کی گرفتاری کا بندوبست کرے۔ وہ ایک جوان اور اپنے باپ کی طرح سخت گیر منتظم تھا۔ بصرے والوں کو دھمکا کر کہ کوئی شخص کسی مخالفانہ حرکت کا مرتکب نہ ہو، وہ سیدھا کوفے پہنچا اور وہاں کے لوگوں کو جمع کر کے تقریر کی کہ:-

کوفے میں تقریر

"امیر المؤمنین نے تمہارے شہر اور اس کے تعلقات کا انتظام میرے سپرد کیا ہے۔ مجھے حکم دیا ہے کہ مظلوم کے ساتھ انصاف کروں، محروم کو اس کا حق دوں، اطاعت کروں کے ساتھ بھلائی کروں اور فتنہ پردازوں کے ساتھ سختی۔ اور سن لو کہ میں ٹھیک ٹھیک ان کے حکم کے مطابق کروں گا۔ نیکو کاروں کیلئے میں ہر بان باپ کی طرح رہوں گا اور فرما بندگان کیلئے ہمدرد بھائی۔ میری تلوار اور میرا کوڑا صرف اس کے لیے ہے جو میرے حکم کی خلاف ورزی کرے گا۔ پس ہر آدمی اپنا برا بھلا سمجھ لے۔"

۱۔ حوالہ سابق ۲۵۰ الکامل فی التایخ (از ابن اثیر) ج ۳ ص ۲۴۴ مطبوعہ دار صادر بیروت ۱۹۶۹ء۔

عملی کاروائی

اس تقریر کے بعد اس نے تمام لوگوں اور بالخصوص قبائل کے ذمہ داروں (چودھریوں) کو حکم دیا کہ کسی کے یہاں کوئی پرہیزی ٹھہرا ہوا ہو، امیر المؤمنین کا اہتہناری مجرم ہو یا کوئی خارجی اور مخالف حکومت خیالات پھیلانے والا، تو لازم ہے کہ ایسے لوگوں کے ناموں سے تحریری طور پر مطلع کیا جائے، جو کوئی ایسا کر دے گا وہ ان لوگوں کے اعمال کی ذمہ داری سے بری ہوگا۔ جو ایسا نہ کرے وہ اس بات کی تحریری ذمہ داری دے کہ اُس کے حلقے اور اس کی عہدت سے حکومت کے خلاف کسی طرح کی کوئی شورش نہیں ہوگی جو کوئی ایسا نہیں کرے گا اس سے ہم بری الذمہ ہوں گے، اس کا مال اور اس کی جان حلال ہوگی۔ جس عریف (چودھری) کے حلقے میں امیر المؤمنین کی حکومت کا کوئی ایسا قانونی مجرم پایا گیا جس کی رپورٹ نہیں کی تھی تو اُس عریف کے دروازے پر ہی اُسے پھانسی دی جائیگی، اس کے حلقے کا وظیفہ بند کر دیا جائے گا، اور عریف کو شہر بلدی کی سزا دی جائے گی۔

مسلم کی تبدیلی مکان

مسلم کو فہ پہنچے تھے تو مختار بن ابی عبید کے گھر پر اترے تھے۔ جب ابن زیاد کو فہ پہنچا اور اس کی یہ سخت آگاہی حضرت مسلم کے کان تک پہنچی تو آپ نے جائے قیام تبدیل کر دی اور ہانی بن عروہ نامی شخص کے مکان میں آ گئے۔

ایک معرہ

ہماری جو تاریخ کی کتابیں ہیں وہ صرف روایات اور بیانات کا مجموعہ ہیں۔ ان

لے تاریخ طبری ج ۶ ص ۲۰۶ لے ایضاً ص ۱۹۹ لے ایضاً ص ۲۰۳

روایات میں بہت سے پہلو ایسے آجاتے ہیں جن پر کچھ گفتگو یا توضیح و توجیہ کی ضرورت ہوتی ہے، یہ چیز ان کتابوں میں کہیں مشکل ہی سے اور وہ بھی بس نام کو ملتی ہے۔ مختار بن ابی عبید ہماری تاریخ کے اُس دور کا جس میں واقعہ کربلا پیش آیا بڑا معروف نام اور ایک پُر اسرار کردار ہے۔ یہ شخص واقعہ کربلا کے پانچ سال بعد ایک بجلی کے کڑکے کی طرح مسلم خانہ جنگی کے میدان میں آیا اور بس سال بھر میں ایک قیامت مچا کے گزر گیا۔ یہ خون حسین کے انتقام کے نام پر اٹھاتا تھا اور واقعی کشتوں کے پُشتے لگا دیئے۔ ابن زیاد اور عمرو بن سعد وغیرہ تمام تاملان حسین اسی کے حصے میں آئے۔ اور اس کا تعلق بھی کونے ہی سے تھا۔ اس لیے قدرتی طور پر خیال ہوتا ہے کہ یہ مختار بن ابی عبید جس کے گھر پر مسلم بن عقیل ٹھہرے تھے یہ وہی مختار تو نہیں ہے؟۔ لیکن پھر خیال ہوتا ہے کہ یہ وہی مختار کیسے ہو سکتا ہے؟ اس نے تو حضرات حسینؑ کے ساتھ بڑے ہی خراب کردار کا ثبوت دیا تھا جبکہ حضرت علیؑ کے بعد حضرت حسنؑ جانشین ہوئے تھے، حضرت علیؑ کی شہادت ایسے وقت پیش آئی جبکہ آپ نے حضرت امیر معاویہ سے ایک فیصلہ کن جنگ کی تیاری کی ہوئی تھی۔ اُس چالیس ہزار کی فوج کو لے کر جو حضرت علیؑ نے تیاری کی تھی حضرت حسنؑ روانہ ہوئے تو مدائن کے قریب پڑاؤ تھا کہ لشکر کے کچھ مفسد ایک افواہ کا بہانہ بنا کر حضرت حسنؑ کے خیمہ ہی پر ٹوٹ پڑے، لوٹ مار مچائی، زخمی کر دیا۔ مدائن میں حضرت علیؑ کی طرف سے حاکم اس مختار کے چچا سعد بن مسعود تھے۔ یہ واقعہ پیش آنے کے بعد حضرت حسنؑ مدائن میں اُن کی قیام گاہ پر آگئے تو جیسا کہ تاریخ کا بیان ہے، مختار نے خالص "کوفی" روایت کے مطابق "چچا سے کہا کہ" چچا اگر دولت اور عزت کی ضرورت ہو تو انھیں باندھو اور معاویہ کے پاس پہنچا دو۔" چچا شریف تھے، انھوں نے کہا کہ تجھ پر خدا کی لعنت۔ ابن بنت رسول اللہ کے ساتھ میں یہ حرکت کروں گا۔"۔

۱۔ طبری ج ۶ ص ۹۲ اس شخص کا کہیے واقعہ یہی تھا یعنی دولت و عزت کیلئے سب کچھ روا ہے۔ چنانچہ اولاً اس بعد اللہ بن زبیر کے ساتھ اقتدار میں حصہ بٹانے کی کوشش کی جبکہ وہ اموی حکومت بزدل آ رہا تھا (باقی اُتارہ صفحہ پر)

ایک اور معترض

اس قصے کے علاوہ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ جن لوگوں نے حضرت حسینؑ کو خطوط بھیجے تھے جن کے نتیجے میں مسلم بن عقیلؓ کو کوثر بھیجا گیا تھا، ان کے ناموں میں کوئی نام مختار بن ابی حبیب نہیں ہے۔ قاعدے سے تو مسلم کا قیام انہی لوگوں میں سے کسی کے گھر ہونا چاہیے تھا! اور پھر اسی طرح ہانی بن عروہ کا نام بھی ان ناموں میں نہیں ہے۔ تو مختار کے گھر سے منتقل ہونے تب بھی اسی جیسے ایک کے گھر پہنچے! یہ آخر قصہ کیا ہے؟ ان آٹھ دس آدمیوں میں سے کسی کے گھر میں کیوں جگہ نہیں تھی جنہوں نے دعوتی خطوط لکھے تھے؟

مزید برآں

اور پھر بات اتنی ہی نہیں ہانی بن عروہ کے گھر بالکل تنہا اور ایک قطعی ناخوادہ مہمان کی طرح پہنچتے ہیں۔ ابن جریر (طبری) ہول یا ابن اثیر یا ابن خلدون سبھی لکھتے ہیں کہ:-
 ”مسلم کے کان تک جب ابن زیاد کی تقریر پہنچی تو وہ مختار کے مکان سے نکل کر ہانی بن عروہ کے مکان تک پہنچے، ہانی نکل کر آئے اور مسلم کو دروازے پر دیکھا تو بڑا بُرا مسخہ بنایا۔ مسلم نے کہا بھائی میرے تمہارے پاس پناہ کے لیے آیا ہوں، تمہارا جہان ہونا چاہتا ہوں۔ ہانی نے جواب دیا ”تم نے تو مجھے بڑی مصیبت میں ڈال دیا ہے، اگر میرے احاطے کے اندر نہ آگئے ہوتے تو میں کہتا کہ مجھے معاف کرو۔ لیکن اب تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آج اوٹو۔“

(بقیہ صفحہ گذشتہ) وہاں دال نہیں گئی تو حضرت حسینؑ کے ہم پر خود ایک محاذ کھول دیا اور وہ وہ سوانگ بھرے اور جھوٹا بولے کہ اللہ کی پناہ۔ تفصیل کے لیے تاریخ دیکھیے۔
 لے ایک دوسری روایت یہ بھی ملی ہے کہ ان کا قیام مسلم بن حو سجہ کے یہاں ہوا تھا۔ طبری ج ۶ ص ۱۹۴ مگر روایت مختار یہی ہے کہ قیام مختار کے یہاں فرمایا۔ شہید انسانیٹ کے مصنف جناب علی نقی صاحب نے بھی اسی روایت کو اختیار فرمایا ہے۔ لے طبری ج ۶ ص ۲۰۳ ابن اثیر ج ۳ ص ۲۶۹ دار الفکر بیروت۔

کیا ہونا چاہیے تھا؟

مسلم بن عقیلؓ جیسا معزز مہمان جو حضرت حسینؑ کا قاصد ہی نہیں ان کا بھائی بھی ہے جس کے آتے ہی شیعان علیؑ و حسینؑ کی سرگرم آمد و رفت اس کے پاس شروع ہو گئی تھی۔ اٹھارہ ہزار آدمی اس کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے وہ ابن زیاد کی دھمکی سن کر احتیاطاً اپنی جائے قیام بدلنے کا فیصلہ کرتا ہے تو اس فیصلے میں کوئی مقامی آدمی شریک تک نظر نہیں آتا، ایک غریب الدیار بے یار و مددگار کی طرح خود ہی منہ اٹھا کر کہیں کو چل دیتا ہے اور ایسے ناروا سلوک سے دوچار ہوتا ہے!

بچند درجہ سوالات ہیں جن کا کوئی جواب ہمیں اپنی ان تاریخی کتابوں میں نہیں ملتا لیکن ان روایتوں کا تعلق کسی ایسی بات سے نہیں ہے جس کی وجہ سے کسی راوی کے متعلق جھوٹ کا گمان کیا جائے۔ البتہ یہ خیال ہوتا ہے کہ مختار کے گھر سے ان کا بے یار و مددگار حال میں ہانی کے گھر پہنچا اور ہانی کے یہاں ایک "آفت و مصیبت" کہہ کر ان کا استقبال کیا جانا، ان میں سے کوئی ایک بات بھی اس کے لیے کافی تھی کہ کو فیوں کے بارے میں یہ فیصلہ کیا جاتا کہ یہ ہرگز ہرگز قابل اعتبار نہیں ہیں۔ اور اسی وقت کوفے سے نکل جانے کی کوئی تدبیر سوچی جاتی۔ یا کم از کم حضرت حسینؑ کو یہ صورت حال بتا دینے کی سعی کی جاتی جن کو اس سے پہلے بالکل مختلف صورت حال کی اطلاع کی جا چکی تھی۔

لیکن قضا و قدر کے فیصلے کون بدل سکتا ہے؟ جناب مسلم نے ان حالات میں بھی ہانی بن عروہ کے گھر میں پناہ گیری ہی قبول نہیں کر لی بلکہ بظاہر اپنے مشن کے بارے میں بھی ان کی رائے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہ حضرت حسینؑ کو خط بھیج چکے تھے کہ فوراً آجائے۔ یہاں حالاً بالکل سازگار ہیں، بس آپ کے آنے کی دیر ہے۔ اپنی اس رائے میں تبدیلی انہوں نے اس وقت کی جب کہ وہ دشمن کے پنجے میں گرفتار ہو گئے، اور یہ ٹھیک وہ دن تھا جس دن حضرت

حسین ان کے خط پر مکے سے روانہ ہو رہے تھے۔ یعنی ۸ رزی الحجہ ۶۱۰ء جو تاریخی روایتوں میں مکہ سے حضرت حسین کی کوفہ کو روانگی کا دن بتایا گیا ہے۔

جناب مسلم کا انجام

کوفہ کے ایسے نافرمان اور طوطا چشم ماحول میں عبید اللہ بن زیاد جیسا چست چالاک اور سخت گیر منتظم پہنچ جائے تو مسلم بن عقیل جیسے ایک سادہ مزاج پروردی اور جنبی کی کہاں خیر۔ اس ان کا پتہ نکال لیا کہ ہانی بن عروہ کے گھر پر مقیم ہیں۔ ہانی کے والد عروہ پر عبید اللہ کے والد زیاد کا بڑا احسان تھا۔ زیاد نے ۵۰ھ میں حضرت مغیرہ بن شعبہ کے بعد کوفہ کی گورنری سنبھالی تھی تو حضرت علیؑ کے حامی سرداروں کو سختی سے دبا دیا تھا لیکن عروہ کو جانے کیوں اس نے اپنے احسان و کرم کا نشاہ بنایا۔ عروہ کے بیٹے ہانی کے ساتھ بھی اس نے یہی معاملہ رکھا اور اسی کے مطابق اپنے باپ کے بعد ابن زیاد نے معاملات رکھے۔ اس لیے اُس کو اس انکشاف سے بڑی چوٹ لگی کہ مسلم جو اس کے آقا زید بن معاویہ کا تختہ اُلٹنے کی مہم پر آئے ہیں، ہانی کے گھر میں مقیم ہیں۔ اور وہی گھران کی خفیہ سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ اس نے ہانی کو بلوایا جو بڑی مشکل سے آنے کو تیار ہوئے۔ ان کو دراصل ابن زیاد کے کوفہ پہنچنے پر اور بحیثیت گورنر پہنچنے پر از خود ہی اس کے پاس آنا چاہئے تھا لیکن جناب مسلم کے قیام کی شرم ہی بظاہر دامن گیر تھی جو وہ ملتے نہیں آئے۔ اس چیز سے ابن زیاد کو اس اطلاع پر اور زیادہ بھروسہ ہوا ہو گا کہ مسلم بن عقیل ہانی کے گھر پر مقیم ہیں اور وہیں سے حضرت حسین کی حمایت کے لیے جمعیت کا سلسلہ چلایا جا رہا ہے اور اسی سے اس روایت کو تقویت ملتی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ جناب مسلم جب مختار کے گھر سے نکل کر ہانی کے گھر پہنچے تو ہانی ان کو دیکھ کر اتنے پریشان ہوئے کہ اپنی پریشانی بے حجابانہ ظاہر کر ڈالی اور

۱۰ طبری ج ۶ ص ۲۱۱ ۱۱ اسی سلوک کے لیے ایک دوسرا نام مجربن عدی کا بھی عروہ کے ساتھ لیا گیا ہے جن کا قصہ بعد میں کچھ اور ہوا۔

عربوں کی روایت مہال نوازی بھی بھلا بیٹھے۔

بہر حال ہانی کسی طرح آئے تو ابن زیاد نے بہت ہی آڑے ہاتھوں لیا۔ اور اپنے اور اپنے باپ کے احسانات یاد دلا کر کہا کہ تمہارے گھر میں امیر المؤمنین کی حکومت اور عاتقہ السلیمن کے امن و امان کے خلاف فتنہ و فساد کی یہ کھچڑی پک رہی ہے؟ ہانی نے انکار کرنا چاہا مگر یہ نہ چلا تو ایک بار پھر انہوں نے دہی کمزوری دکھانی جو جناب مسلم کو اپنے دروازے پر پا کر دکھائی تھی۔ کہا کہ واللہ میرا یقین کرو، میں انکو اپنے گھر نہیں لایا تھا ہاں وہ میرے دروازے پر آ کر کھڑے ہوئے تو میں انہیں دھتکار نہ سکا۔ تم مجھے موقع دو، میں ابھی جا کر انہیں رخصت کرتا ہوں کہ وہ جہاں چاہیں چلے جائیں۔ ابن زیاد نے کہا، یہ نہیں ہو سکتا۔ ہاں تم اس کام کے لیے جا سکتے ہو کہ انہیں میرے پاس لے کر آؤ۔

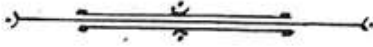
شکر ہے کہ ہانی کو اس مرحلے پر اپنے ہمان اور سپناہ گیر کا حتی یاد آ گیا اور وہ ابن زیاد کی یہ فرمائش پوری کرنے کو تیار نہیں ہوئے۔ نتیجہً ان کے ساتھ سختی کا معاملہ ہوا اور اس کی خبر کچھ مبلغے کے ساتھ جیسا کہ ایسے موقعوں پر ہوتا ہے، ہانی کے گھر پہنچی تو عورتوں کی آہ و فغاں نے مسلم بن عقیل کو مجبور کیا کہ وہ اپنے محسن کو ابن زیاد کے تیغ سے نکلنے کی تدبیر کریں۔ انکی سمجھ میں جو تدبیر آئی وہ یہ تھی کہ جن لوگوں سے انہوں نے حضرت حسینؑ کے لیے جانشاری کی بیعت لی تھی جن کی تعداد عام طور سے اٹھارہ ہزار بتائی گئی ہے، ان کی طلبی کیلئے مقررہ نعرہ بلند کر لیں اور انہیں لے کر دارالامارۃ گورنر ہاؤس پر حملہ کر دیں۔ اس نعرہ پر عام روایتوں کے مطابق چپتر ہزار آدمی اسی وقت جمع ہو گئے۔ اور جناب مسلم کی سرکردگی میں دارالامارۃ پر چاہنچے۔

حملے کی پسپائی اور مسلم بن عقیلؑ کی بے کسی

مگر یہ چار ہزار بہر حال کوئی ہی تھے، ابن زیاد نے صرف جن تدبیر سے یہ ساری

جمیت آنا مانا منتشر کر دی۔ سرداران قبائل جو خواستہ یا ناخواستہ گوزر کے دباؤ میں رہتے تھے، کچھ اس فوج کے سامنے آگئے کہ خود سمجھائیں، کچھ اپنے قبیلوں میں چلے گئے کہ ان لوگوں کی ماؤں بہنوں کو باہر بھیج دیں جو انہیں سمجھا کر لے جائیں۔ بہر حال تھوڑی دیر میں پھینچ پٹ گئی اور جو کچھ رہ گئے تھے وہ بھی رات کے اندھیرے میں اصفیہ کے ساتھ کم ہوتے ہوتے جناب مسلم کو بالکل اکیلا چھوڑ گئے کہ وہ خود ہی اپنے لیے جو کچھ کر سکتے ہوں کریں۔

رات کو تو، روایت کے مطابق کہیں پناہ مل گئی مگر دن کا اُجالا ہونے پر ان کا پتہ نشان ابن زیاد تک پہنچ گیا اور اُس نے انہیں ایک فتنہ جو اور مفسد تر اور دیکر سز قلم کر دیا اور پھر یہی انجم ہانی بن عردہ کا بھی کرایا۔ یہ واقعہ ۹ ذی الحجہ کا بتایا گیا ہے!



۱۔ جناب مسلم اور ہانی کا یہ پورا قصہ کچھ اور زیادہ تفصیلات کے ساتھ طبری ج ۶ میں ۲۰۵ سے ۲۱۱ تک بیان ہوا ہے۔

باب نہم

قافلہ حسینؑ اپنی آخری منزل کی طرف

مسلم بن عقیل جب ۸ رذی الحجہ ۶۰ھ کی صبح گرفتار کیے گئے تو جو صاحب ان کی گرفتاری کے لیے فورس (FORCE) لے کر آئے تھے، یہ محمد بن اشعث کہلاتے تھے اور یہ جناب مسلم کے گھرانے کے لیے اذی نہ تھے۔ ان کے والد اشعث بن قیس حضرت علیؑ کے بہت نمایاں ساتھیوں میں تھے۔ لیکن جنگ صفین کی خوزیریزی دیکھ کر حضرت علیؑ کے بہت سے ساتھیوں میں جو ایک برکتی آئی یہ اس میں بہت نمایاں ہوئے اور تحکیم کے لیے حضرت علیؑ کی طرف سے بادل ناخوار حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی نزدیکی زیادہ تر انہی کے دباؤ کا نتیجہ تھی۔ کیونکہ حضرت ابو موسیٰ کا جو رویہ اس خانہ جنگی کے بارے میں شروع ہی سے رہا تھا اُس کی بنا پر ان کے بارے میں یقینی تھا کہ وہ ہر قیمت پر آئندہ جنگ کا سدباب ہی کریں گے۔ یہ محمد بن اشعث اُس مجلس خواص کے شرکاء میں بتائے گئے ہیں جو مسلم بن عقیلؑ کی کوفے میں آمد پر دارِ مختار میں پہلے دن ہوئی۔ لیکن ان کے بارے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جبکہ اور شرکاء تن من دھن سے جناب مسلم کے مشن میں تعاون کی پُر جوش یقین دہانی کر رہے تھے، یہ بالکل خاموش رہے تھے۔ اور پوچھے جانے پر کہا تھا کہ میں دل سے آپ لوگوں کی تمناؤں میں شریک ہوں، مگر قتل

لے مشہور روایات کے مطابق اس گرفتاری کے لیے بڑی فورس بھیجی گئی تھی اور بڑا امر کر رہا رہا، مگر طبری کی ۲۲۱ کی ایک روایت کے مطابق ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔

مہزوری تباری کی اور ٹھیک حج سے ایک دن پہلے یعنی ۸ رذی الحجہ کو جو کہ "یوم الترویہ" کہلاتا ہے اور حجاج کے قافلے اس دن مکے سے منیٰ کو روانہ ہوتے ہیں۔ آپ اپنے قافلے کے ساتھ کوفہ کی سمت روانہ ہو گئے اور جیسا کہ ابھی گزرا یہ وہی دن تھا جب کوفہ میں مسلم بن عقیل اہل کوفہ کی روایتی خداری کا شکار ہو کر زیاد کے ہاتھوں گرفتار ہو رہے تھے۔

خیر خواہ ایک بار پھر روکتے ہیں

حضرت محمد بن حنفیہ، عبد اللہ بن مطیع اور عبد اللہ بن عمر کی کوشش کا ذکر پہلے آچکا ہے کہ ہر ایک نے کوفہ کے ارادے سے باز رہنے کی ہر ممکن فہمائش اور درخواست کی مگر جیسے کتقدیر الہی میں ایک بات طے ہو چکی ہو، کسی کی بات مؤثر نہ ہوئی۔ آپ نے اہل کوفہ کی دعوت کو مشروط طور سے قبول کر کے مسلم بن عقیل کو حالات کی تصدیق کے لیے وہاں بھیجا۔ اور ان کی تصدیق آتے ہی روانگی کا عزم کر لیا۔ اس عزم کی اطلاع دوسرے لوگوں کو کس طرح ہوئی اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ شاید سفر کی تیاریاں اور کچھ دوسری عملیات قرینہ بن گئیں۔ بہر حال اس آخری موقع پر کچھ اور لوگ بھی روکنے کے لیے سامنے آئے۔

۱۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ

حضرت عبد اللہ بن عباس بزرگ خاندان تھے۔ انھیں کے آبائی مکان میں آپ ٹھہرے ہوئے بھی تھے۔ انھیں ارادہ سفر کی اطلاع نہ ہونے کا سوال ہی کیا۔ علاوہ ازیں ایک روایت یہ بھی ہے کہ یزید نے حضرت حسینؓ کے مکہ آجانے پر حضرت ابن عباسؓ کو بزرگ خاندان کی

(ما شیخہ فخر کذا) ۲۷ دن پہلے پہنچنے کی بات کہی جا رہی ہے اور بظاہر عجارت قتل سے قتل حسین مفہوم ہوتا ہے۔ اور یہاں آج تک تو گویا ۱۳ رذی الحجہ کو خط ملا۔ حالانکہ روانگی کی روایت ۸ رذی الحجہ کی ہے اور اس میں یہ بھی ہے کہ خط ملنے کے بعد ہی روانگی ہوئی تھی۔ البتہ قتل سے قتل مسلم مراد لے لیں تو کسی درجہ میں بات بن جائے گی۔

حیثیت سے لکھا بھی تھا کہ آپ انہیں سمجھائیں کہ وہ جو کچھ سوچ رہے ہیں وہ مناسب نہیں ہے۔ البدایہ والنہایہ ج ۸ میں ص ۱۶۴ پر اس خط کا اور اس کے جواب کا تذکرہ خلاصہ مضمنوں کے ساتھ ہے۔ جواب کا خلاصہ یہ دیا گیا ہے کہ :-

انی لأرجو ان لا یكون خروج	مجھے امید ہے کہ حسین کا (مدینے سے)
الحسین لا یرتکوهه دلست	نکلنا کسی ایسی بات کے قصد سے نہیں ہوا
أدع النصیحة لئنی کل ما یجتمه	ہوگا جو تمہارے لیے باعث تکلیف ہو اور
به الالفه ونظفی به الثائرة	اور میں (پھر بھی) کوئی ذقیقہ نہیں اس بات
	کے سمجھانے میں نہیں چھوڑوں گا جس سے
	ہم لوگوں کی الفت باہمی برقرار رہے اور
	فتنہ دہے۔

اس خلاصہ جواب کے بعد بتایا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت حسینؓ کے پاس آئے اور بڑی دیر تک گفتگو کی جس میں آپ نے کہا کہ ”خدا کے لیے عراق کا ارادہ نہ کرو اور اپنی جان کھونے کو وہاں نہ جاؤ اور نہیں تو کم از کم اتنی بات مانو کہ موسم حج گزر جانے دو حج میں آنے والے لوگوں سے مل کر وہاں کے حالات کا اندازہ کرو اور پھر طے کر دو جو کچھ طے کرنا ہو۔ اس کے آگے کا جملہ ہے کہ ”یہ واقعہ عشرہ ذی الحجہ کا ہے۔“ یعنی بالکل اس وقت کا جبکہ روانگی ہونے والی تھی۔ حضرت ابن عباسؓ کی مذکورہ گفتگو کو اگر ہم یزید کی اور آپ کی خط و کتابت کا نتیجہ سمجھیں، جیسا کہ البدایہ کی طرز تحریر سے ظاہر ہوتا ہے، تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ یزید نے حضرت ابن عباسؓ کو بالکل آخری مرحلہ میں لکھا جبکہ ذی الحجہ کا مہینہ شروع ہو چکا تھا اور حضرت حسینؓ روانگی کی تیاری کر رہے تھے۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ یہ گفتگو اگرچہ البدایہ والنہایہ میں اس

لہ دونوں کا تفصیلی متن ”جاء الامام حسین بن علیؓ ازبا تشریف القرشی جلد ثانی میں ہمارے سامنے ہے۔

۱۔ اس جواب ہی سے یزید کے خط اور اسکی اسپرٹ کا اندازہ ہو جاتا ہے یعنی اسی اسپرٹ کا خط اسکا بھی تھا۔ البدایہ ج ۸ ص ۱۶۴

طرح درج کی گئی ہے جیسے کہ اوپر کی خط و کتابت کا نتیجہ ہو لیکن واقعہ میں یہ گفتگو اس سے الگ بالکل آخری مرحلے کی ہو۔ جبکہ یزید کا خط بظاہر اُس مرحلے میں آیا ہوگا جب حضرت حسین کے مکے آنے کے بعد وہاں کوفیوں کی آمد شروع ہوئی اور مسلم بن عقیل کو فے پہنچ گئے۔ ہمارے نزدیک قرین قیاس یہی بات ہے۔ یعنی یہ مذکورہ بالا گفتگو دوسری بار کی ہے ورنہ اصل گفتگو آپ نے خط آنے کے فوراً بعد ہی کی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ اس وقت جو گفتگو حضرت ابن عباس اور حضرت حسین کے درمیان ہوئی وہ ریکارڈ میں نہ آئی ہو۔ البتہ جب حضرت حسین کو فے کے قصد پر مُصر رہ کر پارہ رکابی کے مرحلے میں داخل ہو گئے ہوں تب حضرت ابن عباس نے ایک بار پھر انھیں سمجھانے کی کوشش کی ہو اور وہ روایت ہو کر ابن کثیر تک پہنچی ہو۔ بہر حال آگے روایت کا بیان یہ ہے کہ حضرت حسین نے حضرت ابن عباس کا مشورہ قبول نہیں فرمایا فابی الحسین الا ان یمضی الی العواتر حسین عراق جانے کے ارادے پر مُصر ہی رہے (فقالت لہ ابن عباس اس پر حضرت ابن عباس نے ان سے فرمایا:-

واللہ مجھے لگتا ہے کہ تم کل اپنی بیویوں	واللہ ائی لاظنک ستقتل
اور بیٹیوں کے درمیان اسی طرح قتل	غداً بین نساءک وبناتک
کیے جاؤ جیسے عثمان اپنی بیویوں اور	کما قتل عثمان بین نساءہ
بیٹیوں کے درمیان قتل ہوئے تھے	و بناتہ واللہ ائی لاحناؤ
واللہ مجھے تو یہ بھی خوف ہے کہ تم قصاں	ان تکون انت الذی یقاد بہ
عثمان میں قتل کیے جانے والے بنو۔ پس	عثمان فاتا للہ وانا الیہ
درم نہیں مانتے تو) اناللہ وانا الیہ راجعون	راجعون

لیکن حضرت حسین کے لیے یہ مکرر تفہیم بھی کچھ مؤثر نہ ہو سکی بلکہ جیسا کہ آگے روایت میں ہے

اے طبری کی روایت میں یہ آخری جملہ نہیں ہے اور حضرت ابن عباس کی زبان کے ساتھ اس جملے کا جوڑ قابل یقین بھی نہیں ہے۔ یزید کے بائیس اکتے اس طرح کے خیالات ہونے کا کہیں ثبوت نہیں ملتا۔ اے البدایہ والہنایہ ج ۸ ص ۱۲۴

آپ نے اس انداز تفہیم پر ایک گونہ ناگواری کا اظہار فرمایا۔
 ۲۔ ابو بکر بن عبد الرحمن: یہ مدینے کے مشہور فقہائے سبعہ میں سے تھے، ان کے والد عبد الرحمن بن اسحاق بن الہشام بن المیغرہ الخزومی القرشی خود بڑے صاحبِ نصال تھے۔ غالباً حج کو آئے ہوئے تھے کہ حضرت حسین کے قصدِ کوفہ کا چرچا سنا تو ازراہِ خلوص و محبت حاضر خدمت ہوئے۔ اور حسب روایت طبریؑ عرض کیا کہ:-

”آپ ایک ایسے ملک کا ارادہ فرما رہے ہیں جو خالی نہیں پڑا ہوا ہے بلکہ وہاں اس کے امراء و حکام موجود ہیں جن کے ہاتھ میں خزانے ہیں اور لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ روپے پیسے کے بندے ہیں۔ پس وہی لوگ جنہوں نے آپ کی مدد کا وعدہ کیا ہے وہ آپ کے خلاف لڑنے کو آجائیں گے۔“ الخ

مسعودی کی روایت میں ان کا پیرایہ بیان کچھ اور زیادہ موثر ہے۔ فرمایا کہ:-

”دیکھیے آپ کے والد ماجد آپ سے زیادہ حوصلہ اور طاقت رکھتے تھے۔ لوگ ان کی بات سنتے بھی زیادہ تھے۔ اہل تمام کو چھوڑ کر باقی سب ان کی شخصیت پر جمع ہو گئے تھے۔ وہ ان کو لیکر معاویہ کے مقابلے پر چلے۔ معاویہ کی ان کے مقابلے میں کچھ حیثیت نہ تھی۔ مگر پھر بھی لوگ دنیا اور دنیوی زندگی کی محبت میں ان کا حق قبول کئے۔ انھیں خون رُلا یا حتیٰ کہ اسی حالت میں وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ پھر جو کچھ ان لوگوں نے آپ کے بھائی کے ساتھ کیا وہ سب بھی آپ جانتے ہیں۔ اور پھر اپنی غداروں کا بھروسہ کر کے آپ ان لوگوں سے لڑنے جا رہے ہیں جو آپ کے مقابلے میں زیادہ قوی اور تیار ہیں لوگ ان سے امیدیں بھی زیادہ کر سکتے ہیں اور ڈرتے بھی زیادہ ہیں۔“

۱۔ ان کا نام مورخ مسعودی کے ماسوا اور لوگوں نے عمر بن عبد الرحمن لکھا ہے مگر صحیح نام ابو بکر ہی معلوم ہوتا ہے۔ اصابت سے سبھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ بلاخطہ ہو الاما یہ لابن حجر ج ۵ ص ۶۶۔ ۲۔ جزو ۶ ص ۲۱۶۔ ۳۔ مروج الذهب (دار اندلس، بیروت ج ۳ ص ۵۶)

۳۔ کئی اور مخلصین۔۔ اسی طرح اور کئی نام آتے ہیں جن کا تعلق مخلصین کے گھر سے تھا کہ انہوں نے یا اس عنوان سے کوفے کے قصد کی مخالفت کی کہ کوئی بالکل ناقابل اعتبار ہیں، اور حالات ناسازگاریاں اس عنوان سے کی کہ اس اقدام خروج کا کوئی جواز نہیں ہے۔ ابن کثیر نے ایک ہی جگہ یہ نام اور ان کے اقوال جمع کر دیئے ہیں۔ حضرت ابوسعید خدری، جابر بن عبد اللہ، وائلہ بن واقد اللثمی اور مسور بن مخزوم جو صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اور یہ سب مخلصین حضرت علی ہی سے تھے۔ حضرت ابوسعید خدری کے متعلق بتایا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا:-

”اپنی جان کے بارے میں اللہ سے ڈریئے، اپنے گھر ہی میں رہیے اور اپنے ام چرخہ سے مت کیجئے۔“

حضرت جابر بن عبد اللہ نے فرمایا:-

”اللہ سے ڈریئے اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے مت مکرائیے۔“

وائلہ بن واقد اللثمی نے فرمایا کہ:-

”آپ کا خروج بجا نہیں ہے آپ صرف اپنی جان دینے جا رہے ہیں اس کا باز رہیے“

مسور بن مخزوم نے لکھا کہ

”اہل عراق کے خطوط سے دھوکہ میں نہ آئیے اور نہ ابن زبیر کے اس قول سے کہ وہ

لوگ آپ کی مدد کریں گے۔“

لیکن سب ہی کی خواہشیں، منتیں اور دلیلیں ناکام ہو گئیں اور حضرت حسین ۸ رذی الحجہ کو دو پہر کے وقت جبکہ حجاج منیٰ کے لیے روانہ ہوئے عمرہ کے ارکان ادا کر کے کوفے کی سمت روانہ ہو گئے۔ گویا اپنے احرام باندھا ہوا تھا مگر وہ احرام حج کا نہیں عمرے کا تھا۔

سہ البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۴۳-

سہ طبری ج ۶ ص ۲۱۴۔ اپنے عزم و ارادے پر حضرت حسین کی اس درجہ پختگی بھی ایک حل طلب سوال ہے دم تحریر سلسلے میں لیکن یاد آتا ہے کہیں یہ روایت نظر سے گزری ہے کہ آپ نے کوئی (یقیناً صفحہ آئندہ پر)

عبداللہ بن جعفر کی سعی

حضرت کے عم زاد عبداللہ بن جعفر حجاز کی بڑی اہم شخصیت تھے۔ عم زاد ہونے کے علاوہ حضرت کی ہمیشہ حضرت زینب کبریٰ کے شوہر بھی تھے۔ قیام مدینے میں رہتا تھا عن ابنا حج کے لیے آئے ہوں گے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ حضرت حسین کی روانگی سے پہلے ان کی کسی مداخلت کا ذکر کیوں نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے حضرت حسین کے اس رُخ سے جو وہ یزید کے سلسلے میں اختیار کر رہے تھے، ناخوش ہوں، کیونکہ وہ حضرت معاویہ کے زمانے سے اس خاندان کے ساتھ بہتر تعلقات رکھتے آئے تھے۔ جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ کا بھی معاملہ تھا۔ اور عمر میں حضرت حسین سے بڑے بھی تھے، بہر حال جو بھی وجہ ہو۔ روایت ہے کہ ان کو اطلاع ملی کہ حسین روانہ ہو گئے تو وہ اپنے دو بیٹوں کو حضرت حسین کے تعاقب میں روانہ کر کے کذرا آگے بڑھ کر ان سے کہو کہ اول تو لوٹ آئیں ورنہ کم از کم ذرا سا ٹھہریں میں آ رہا ہوں اور یہ کہہ کر وہ خود سیدھے

(بیضی حاشیہ میں) خواب دیکھا تھا جس میں اس ارادے کے لیے تائیدی اشارہ پایا جاتا تھا پس گویا یہ اس خواب کا اثر تھا کہ آپ اس ارادے پر نظر ثانی کے لیے تیار نہ تھے۔ مگر جب ہم آگے چل کر دیکھتے ہیں کہ آپ اس ارادے کو فریضہ کر کے درمیان راہ سے واپسی پر بھی تیار ہو گئے تھے مگر تقدیر الہی معاون نہ ہوئی اور واپسی ممکن نہ ہوئی۔ تو یہ روایت کچھ معتبر نہیں رہتی اور اس کے بعد جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ تاریخی بیانات کی روشنی میں جن میں سے کچھ اس کتاب کے پچھلے ابواب میں مذکور بھی ہوئے ہیں، آپ کے خیالات کے مطابق حضرت معاویہ کا دور بھی محض حالات کی مجبوری سے قبول کیا جانے والا دور تھا نہ کہ خوشی سے۔ اور پھر جب آخر میں یزید کی ولیمہ کی کا مسئلہ سامنے آ گیا تب تو روایات کی رو سے یہ سوال بھی اچھے سامنے آنے لگا تھا کہ میں معاویہ کے خلاف جہاد نہ کر کے اللہ کو کیا جواب دے سکوں گا؟ پس گمان یہ ہوتا ہے بلکہ اس کا بھی روایتوں سے تقریباً ثبوت ہی ملتا ہے کہ یزید کی ولیمہ کی عمل میں آجانے کے بعد گویا اپنے طے کر لیا تھا کہ ان کی اگر خلافت کی نوبت بھی آتی ہے تو بشرط حالات آپ اس خلافت کو الٹ دینے کی کوشش میں کوئی ذبیقہ فرو گزارنا نہ کریں گے۔ بظاہر یہی تہیہ تھا جسے آپ ایک دینی تقاضا سمجھتے تھے اور اس لیے اس وقت تک اس میں کسی تبدیلی کے روادار نہ ہوئے جب تک ایسے حالات سامنے نہ آ گئے کہ ان میں اپنے اپنے لیے عند اللہ عذر سمجھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

والی حرمین عمرو بن سعید کے پاس گئے کہ دیکھو حسین چلے گئے ہیں تم مجھے ایک خط اُن کیلئے لکھ کر دو کہ وہ لوٹ آئیں اور یہ کہ تم ان کے ساتھ حسن سلوک اور صلہ رحمی سے پیش آؤ گے، کسی طرح کی کاروائی اُن کے خلاف نہیں ہوگی۔ روایت کہتی ہے کہ عمرو نے عبداللہ بن جعفر سے کہا کہ تم خود خط لکھ لو اور مجھ سے دستخط کرو۔ چنانچہ یہی ہوا۔ پھر ابن جعفر نے کہا کہ مزید اطمینان کے لیے اپنے بھائی یحییٰ کو میرے ساتھ کرو اور یہ خط تمہاری طرف سے وہی حسین کو دیں۔ چنانچہ یہ بھی ہوا۔ یہ دونوں صاحبان حضرت حسین کے پاس پہنچے۔ مگر دوسرے تمام لوگوں کی طرح ناکام ہی رہے۔

والی حرمین کی طرف سے بکبر روکے جانے کی روایت

حضرت عبداللہ بن جعفر اور والی حرمین عمرو بن سعید کے بارے میں جو روایت ابھی مذکور ہوئی اس کی روشنی میں طبری ہی کی یہ دوسری روایت کسی طرح قابل اعتبار نظر نہیں آتی کہ ”جیسے ہی قافلہ مکے سے نکلا حاکم مکہ عمرو بن سعید کے فرستادے ان کے بھائی یحییٰ بن سعید کی قیادت میں ان کا راستہ روکنے اور بکبر ملنے واپس لانے کے لیے پہنچے۔ مگر یہ لوگ کامیاب نہیں ہو سکے تھوڑی سی زور آزمائی اور مار پیٹ کے بعد یہ فرستادے نامراد لوٹنے پر مجبور ہوئے۔ دونوں روایتوں میں اتنا تضاد ہے کہ کوئی ایک ہی ٹھیک ہو سکتی ہے۔ دونوں بیک وقت نہیں ہو سکتیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ دوسری والی روایت پہلی والی روایت میں مذکور واقعہ ہی کی تکرار ہوئی شکل ہے اور کچھ نہیں۔ ویسے بھی کیا تک تھا کہ جس حاکم نے سواچار نہیں حضرت حسین سے پلٹ کر نہیں پوچھا کہ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ جبکہ اُسے معلوم تھا کہ آپ نے مدینہ کیوں چھوڑا ہے۔ رمضان تک تو وہ خالی حاکم مکہ ہی تھا رمضان میں مدینہ کی حکومت بھی اس کے سپرد کر دی گئی تھی۔ اور اس سپردگی کے ساتھ ہی اس نے عبداللہ بن زبیر کے

خلات — جو حضرت حسین ہی کے ساتھ مکے میں آئے تھے۔ گرفتاری کے لیے کاروائی بھی شروع کر دی تھی۔ اس کے برخلاف کوئی ایک بھی روایت نہیں ملتی کہ اُس نے حضرت حسین کو پھینکا ہو، ان کے معاملات میں کسی طرح کا دخل دیا ہو۔ حالانکہ اہل کوفہ کے وفود ان کے پاس آئے تھے، ان کے فرستادے کو فے جا رہے تھے، وہ سفر کی تیاریاں کر رہے تھے۔ تقریباً اسی نوے آدمیوں کا قافلہ جانے کو تھا اس کی تیاریاں دو چار دن پہلے سے تو بالکل صاف نظر آنے ہی لگی ہوں گی۔ اب اس تمام مدت میں تو حاکم مکہ ان سے تعرض نہیں کرتا۔ مگر جب وہ مکہ سے نکل جاتے ہیں تو ان کی پکڑ کو آدمی دوڑاتا ہے۔ کوئی تنگ کی بات تو نہیں۔ نیز خود اس روایت کا ایک دوسرا جزو بجائے خود اس بات کی دلیل بن سکتا ہے کہ حاکم مکہ کی طرف سے تعاقب کی کہانی درست نہیں ہے۔ وہ دوسرا جزو یہ ہے کہ قافلہ حاکم مکہ کے فرستادوں کو پسپا کر کے آگے بڑھا تو ایک قافلہ ملا جو مین سے (سالانہ معمول کے مطابق) دلراختہ دمشق کے لیے بہت سے قیمتی سامان لیے جا رہا تھا، حضرت حسین نے اس پر قبضہ کر لیا اور تتر بانوں سے کہا کہ تم میں سے جو چاہے یہاں سے لوٹ جائے اور جو چاہے ہمارے ساتھ کوفہ تک چلے ہم دونوں کو معاوضہ دیں گے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ روایت کے دونوں جزوں میں سے کوئی ایک ہی ٹھیک ہو سکتا ہے، ورنہ کیسے یہ بات قابل تصور ہے کہ ابھی حاکم مکہ کے آدمیوں سے ٹکراؤ ہوا تھا (جس کے بعد پورا اندیشہ ہونا چاہیے تھا کہ شاید وہ مزید مکہ لے کے آتے ہوں) اور ابھی ایک ایسا کام کیا جانے لگا (یعنی سرکاری قافلے کے اموال پر قبضہ کرنا) کہ پسپا شدہ لوگ کسی ملک کے ساتھ دوبارہ نہ بھی آتے ہوں تو اس نئے واقعہ کے بعد حاکم پر بالکل فرض ہو جائے کہ وہ سرکاری مال کی بازیابی اور تتر بانوں کی امداد کے لیے کوئی موثر کاروائی کرے۔ اور جب روایت میں یہ بھی ہے کہ جن تتر بانوں نے آگے جانا قبول نہیں کیا ان کا وہیں حساب کر دیا گیا۔ تب تو حاکم مکہ کو واقعہ کی فوری اطلاع ہونے کا بھی سامان ہو گیا تھا اور

کسی کاروائی کا اندیشہ نہ ہونے کا سوال ہی نہ تھا۔ بہر حال روایت کے دونوں اجزاء میں سے ایک منہور غلط ہے اور اس صورت حال کے نتیجہ میں یہ بھی سوچا جاسکتا ہے کہ دونوں ہی غلط ہوں گے۔

نوٹ کرنے کی بات

بہر حال نہ صرف یہ کہ جبر و اکراہ والی یہ روایت کسی طرح قابل قبول نظر نہیں آتی۔ بلکہ یہ بات بھی نوٹ کی جانی چاہیے کہ جس طرح حاکم مدینہ ولید بن عقبہ بن ابی سفیان نے حضرت حسین کے ساتھ قاعدہ و قانون کے بجائے لحاظ و احترام کا معاملہ کیا۔ اور حضرت عبداللہ بن زبیر کے بڑھلاں آپ کو بالکل آپ کے حال پر چھوڑ دیا۔ اسی طرح حاکم مکہ — اور بعد میں حاکم حریم — عمرو بن سعید بن العاص — المعروف اشّدق — نے آپ کے ساتھ یہی معاملہ رکھا، کوئی تعرض آپ سے نہیں کیا اور کیا تو وہ بھلائی کا معاملہ کیا جو عبداللہ بن جعفر نے ان سے چاہا تھا۔ ہمارے خیال میں زبیر کے بارے میں حضرت حسین کے سخت مخالفانہ رویے کی روشنی میں یہ بات نہیں سوچی جاسکتی کہ مقامی حکام احترامِ نرہی اور چشم پوشی کا یہ معاملہ مرکزی حکومت اور دار الخلافہ دمشق کی مرضی کے بغیر کر رہے ہوں۔ لازماً یہ رویہ وہیں کے ایما پر ہونا چاہیے اور حضرت عبداللہ بن عباس کے نام کے خط سے بھی جس کا اوپر تذکرہ ہوا، یہی ظاہر ہوتا ہے کہ زبیر کی طرف سے حضرت حسین اور حضرت عبداللہ بن زبیر کے معاملہ میں وہی فرق تھا جس فرق کی حضرت معاویہ نے اُسے وصیت کی تھی۔

۱۰ "تہذیب انسانیت" کے مصنف جناب علی نقی صاحب نے اسی اشکال یا کسی دوسرے اشکال سے بچنے کی راہ یہ اختیار فرمائی ہے کہ قافلہ کو محض ایک قافلہ بتایا ہے، میں کا سرکاری قافلہ نہیں بتایا۔

۱۱ شیعہ مصنفین نے مدینہ سے حضرت حسین کے حنفیہ کوچ کا بدیہی جواز ثابت کرنے کے لیے اور اسی طرح مکہ سے قبل حج کو حج کے لیے عجیب عجیب الزامات، حکام مکہ و مدینہ اور حکومت دمشق پر لگائے ہیں مگر سب بے بنیاد اور محض افتراء ہیں۔ چنانچہ ان کے لیے کوئی حوالہ نہیں دیا گیا ہے (باقی حاشیہ صفحہ ۱۹۰ پر)

ذی الحجہ کی ۸ یا ۱۰

محمود احمد عباسی مرحوم نے اپنی کتاب (خلافت معاویہ و یزید) میں ایک خاص بحث یہ کی ہے کہ حضرت حسینؑ کے قافلے کا سفر ۸ ذی الحجہ کو حج سے پہلے شروع ہوا تھا یا ۱۰ کو؟ وہ کہتے ہیں کہ ۸ کی جو روایت عام طور پر مؤرخین کے یہاں پائی جاتی ہے وہ صحیح نہیں ہے صحیح ۱۰ ذی الحجہ ہے۔ یعنی آپ حج کر کے روانہ ہوئے تھے۔ اس کے انہوں نے بہت سے دلائل جمع کیے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ دمشق کو جانے والے یعنی قافلے کو پکڑنے کی جو روایت آئی ہے اس میں اس واقعہ کا مقام تنعیم کو بتایا گیا ہے۔ جو مکہ مکرمہ سے شمال مغرب کی جانب ۴۴ میل کے فاصلے پر مشہور جگہ ہے۔ اس کو چھوٹا عمرہ بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ عمرہ کا احرام باندھنے کے لیے حدود حرم سے باہر جانا پڑتا ہے تو اس کام کے لیے یہ قریب ترین جگہ ہے۔ عباسی صاحب کہتے ہیں کہ تنعیم کا محل وقوع اس سمت جنوب مشرق سے، جس سمت میں آدمی مکے سے کوفہ کو جاتا ہے، بالکل مخالف سمت شمال مغرب میں راہ دمشق پر ہے۔ تو مکے سے کوفہ کو جاتے ہوئے تنعیم کا یہ واقعہ کیسے پیش آگیا؟ اور کیسے یہ قافلہ حج کے ایام میں مکہ سے گزر رہا تھا بغیر حج کیے ہوئے مکہ سے آگے بڑھ کر تنعیم پہنچ گیا ہوگا؟ عباسی صاحب کا یہ سوال تو بالکل صحیح ہے مگر اس کے ذریعہ جو وہ یہ ثابت کرتا چاہتے ہیں کہ ہاں حج کے بعد ۱۰ ذی الحجہ میں حضرت حسینؑ کا سفر مانا جائے تو یہ

راہی ماضیہ مع گذشتہ کا) مثلاً شہداء انسانیت“ ۲۲۵ پر ہے کہ ولید حاکم مدینہ نے یزید کو حضرت حسینؑ کے بیعت سے انکار کی خبر دی تو اس نے حکم بھیجا کہ بیعت کرنے اور نہ کرنے والوں کی فہرست بھیجو جس کے ساتھ حسینؑ کا سر بھی ہونا چاہیے۔“

یہ اگر واقعہ ہوتا تو آخر مکہ بھی تو یزید کی تسلیم میں شامل تھا پھر کیوں اس نے مکے کے حاکم کو فرمان بھیجا کہ حسینؑ مدینہ سے نکل کر مکہ پہنچ گئے ہیں تم ان کو گرفتار کرو۔ حالانکہ وہاں آپ کا تین بیٹے سے اوپر قیام رہا تھا۔۔۔؟

واقعہ ممکن ہو سکتا ہے، یہ بالکل بھی قابل قبول بات نظر نہیں آتی۔ کیونکہ حج کرنے کی صورت میں حضرت حسین اور ان کا قافلہ تنعم سے، اسی مخالف سمت میں جس سمت میں راہ کو فہ ہے اس وقت کے مقابلے میں اور زیادہ دور ہو جاتا تھا جس وقت آپ ۸ ذی الحجہ کو مکہ مکرمہ میں تھے حج کے ارکان منیٰ، مزدلفہ اور عرفات میں ادا ہوتے ہیں اور یہ مقامات مکہ سے بجانب مشرق (یا جنوب مشرق) ۲۱ میل سے لیکر ۱۳ میل تک کے فاصلے پر ہیں۔ جبکہ تنعم مکہ سے خود عباسی صاحب کے قول کے مطابق بھی۔ بجانب شمال مغرب ۲-۴ میل کے فاصلے پر ہے۔ پس مکہ سے ۳-۴ میل مخالف سمت میں اگر اس واقعہ کا تصور مشکل ہے تو اسی مخالف سمت میں ۱۵-۱۶ میل کا فاصلہ ہو جائے پر اور بھی زیادہ مشکل ہو جانا چاہیے۔ دوسری دلیل عباسی صاحب نے البدایہ والنہایہ کے الفاظ "ذالک فی عشر ذی الحجۃ" کو بنایا ہے جس کا مطلب ان کے خیال میں یہ ہوتا ہے کہ حضرت حسینؑ ۱۰ ذی الحجہ کو روانہ ہوئے۔ مگر اسی البدایہ والنہایہ میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ:

فاتق خروجه من مکتہ ایام	پس آپ کا مکہ سے خروج ایام ترویہ
الترویہ قبل مقتل مسلم ہیوم	میں قتل مسلم سے ایک دن پہلے ہوا
واحد۔ فان مسلماً قتل یوم	مسلم کا قتل یوم عرفہ میں ہوا
عزۃ۔	بھتا۔

پس اس کی روشنی میں "عشر ذی الحجۃ" کا مطلب۔ از ذی الحجہ نہیں بلکہ "عشر ذی الحجہ" لیا جائے گا۔

علاوہ ازیں معاملہ کا یہ پہلو بھی عباسی صاحب سے نظر انداز ہو گیا کہ اگر حضرت حسینؑ نے سفر کا آغاز حج کے بعد کیا ہوتا تب وہ ۱۲ تاریخ سے پہلے سفر نہیں کر سکتے تھے، حاجی کو کم از کم ۱۲ تنگ کو منیٰ میں رک کر رمی جمرات کرنا ہوتی ہے۔ اور اس صورت میں عباسی

صاحب کے دیئے ہوئے پیمانہ رفتار سفر کے مطابق: ار محرم کو کربلا میں نہیں پہنچ سکتے تھے جو وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

ہمیں بذاتِ خود ۸ یا ۱۰ ار ذی الحجہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ لیکن عباسی صاحب کے قارئین میں سے کسی کی نظر سے ہمارے یہ صفحات گزرے تو اُسے خیال ہو سکتا ہے کہ ایک سوال جو حضرت حسین کی تاریخِ روانگی کے سلسلے میں اتنی اہمیت سے ایک مصنف نے اٹھایا تھا بعد والے دوسرے مصنف نے اس سے بالکل اعتنا ہی نہیں کیا۔ اس لیے اپنا نقطہ نظر اس بارے میں عرض کرنا مناسب سمجھا گیا۔

کربلا تک کی رودادِ سفر اور یوم شہادت کی روایتیں

آغاز سفر کے ساتھ جس طرح کی روایتیں ابھی آپ کے سامنے آئیں کہ ایک کا مضمون دوسرے کی نفی کر رہا ہے۔ بلکہ خود ایک ہی کے اندر کے دو حصے ایک دوسرے سے تضاد رکھتے ہیں۔ ان کے بعد جو اور روایتیں کربلا تک کے سفر اور یوم شہادت کی روداد بیان کرتی ہیں، وہ بعینہ اس کیفیت کی حامل اگرچہ نہ ہوں مگر دوسرے متعدد اسباب سے ان کا بیشتر حصہ مشکوک اور ناقابل اعتبار ہے اور کوئی خاص اہمیت بھی اس پوری روداد کے بیان کی ہے نہیں، مثلاً آپ رستے میں کہاں کہاں ٹھہرے؟ کیونکہ اکثر یہ جگہیں وہ ہیں جو قاری کے لیے ایک جائے مجہول کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کا علم اُسے ہو یا نہ ہو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یا کتنی دیر تک دو منزلوں کے بیچ میں چلے اور کتنی دیر اور کون سے وقت آپ کس منزل پر ٹھہرے، اور کتنا پانی کہاں سے بھر کے لیا تھا لیا۔ اور کس منزل کی کیفیت کیا تھی؟ یہ سب باتیں وہ ہیں جو اس واقعہ کے بارے میں اُس خاص نقطہ نظر کے ساتھ جو شیعہ حضرات کا ہے اور جو اعتقادات حضرت حسین اور ان کے اہل بیت کے بارے میں شیعہ حضرات رکھتے ہیں ان اعتقادات کے ساتھ تو ان تفصیلات میں جانے کے

کوئی معنی ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان اعتقادات اور اس نقطہ نظر کے بغیر ان تفصیلات میں جانا کوئی بامعنی کام نہیں ہوگا اس لیے ہم تفصیل برائے تفصیل کے بجائے اس روداد کی صرف وہی باتیں یہاں بیان کریں گے جن میں ہر اعتقاد اور ہر نقطہ نظر کے لیے کوئی افادیت کا پہلو ہے۔

فرزدق سے ملاقات

فرزدق عربی شاعری کا مشہور نام ہے۔ حضرت علی اور آپ کے اہل بیت کے حامیوں میں سے تھا۔ عراق ہی وطن تھا۔ طبری نے دورانِ سفر حضرت حسین سے اسکی ملاقات بتانے والی دو روایتیں دی ہیں۔ ایک بتاتی ہے کہ مقام صفاح پر اس کی ملاقات ہوئی (جو کہ حدودِ حرم سے باہر تقریباً دس میل کی مسافت پر ہے) اور اس ملاقات کے راوی ایسے دو کوئی ہیں جو یومِ ترویہ میں مکہ مکرمہ پہنچے جو کہ حضرت حسین کی روانگی کا دن تھا۔ اور آپ کو رخصت کر کے حج کے قافلوں میں شامل ہو گئے۔ اس سفر کی بہت سی روایتیں انہی دو کے حوالے سے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم حج سے فارغ ہو کر نیشاپور سے حضرت حسین کے تعاقب میں نکلے۔ شریک سفر ہونے کے لیے ہمیں بلا تماشہ دیکھنے کے لیے کہ کیا ہوتا ہے۔ ہم "صفاح" پہنچے تو دیکھا کہ فرزدق ہے جو حضرت حسین سے مل رہا ہے۔ اور ان دونوں کی بات چیت ختم ہوئی تو حضرت حسین نے اپنی سواری کو حرکت دی اور السلام علیکم کہہ کر دونوں الگ ہو گئے۔ ان الفاظ سے صاف طور پر یہی مفہوم ہوتا ہے کہ فرزدق عراق کی طرف سے آ رہا تھا جدھر کو حضرت حسین تشریف لے جا رہے تھے۔

عراق کی سمت سے آنے کا یہ کون سا وقت تھا۔ جبکہ حج ہو چکا ہے؟ اور حضرت کو صفاح پہنچتے پہنچتے جو کہ مشکل دش میل پر ہے ایسے کتنے دن لگ گئے کہ وہ دو کوئی

ر عبد اللہ بن سلیم اور المذری بن مشعل جو واقعہ کے راوی ہیں) حج کرنے کے بعد حضرت حسین کے پیچھے نکلے تو اُس وقت تک حضرت حسین کا قافلہ صفح تک ہی پہنچا تھا؟ جبکہ یہ دونوں حج کے ارکان ادا کرنے کے بعد ۱۲ رزی سے پہلے نہیں روانہ ہو سکے ہوں گے۔ یعنی حضرت حسین کی روانگی کے چار دن بعد ان کی روانگی ہوئی ہوگی!

دوسری روایت ہے جس کا راوی خود فرزدق کو بتایا گیا ہے، وہ بتاتی ہے کہ فرزدق ۶۰ھ کے ایام حج میں (اپنی والدہ کو حج کرانے کے واسطے لیے ہوئے) حرم (یعنی حدود حرم) میں داخل ہوا تو اسے ایک قافلہ مکے سے نکلتا ہوا ملا جو تلواروں اور ڈھالوں کے ساتھ تھا۔ معلوم کرنے پر کہ یہ کس کا قافلہ ہے پتہ چلا کہ حضرت حسین بن علی کا۔ فرزدق نے لپکتے دعا سلام اور کچھ بات چیت کی۔ جس میں یہ سوال بھی تھا کہ اے ابن رسول اللہ آپ حج چھوڑ کے کہاں جا رہے ہیں؟

پس پہلی روایت کے رو سے حج (یوم عرفہ) ہوئے بھی قریب چار پانچ دن ضرور ہو چکے تھے جب فرزدق عراق سے آتے ہوئے (صفح کے مقام پر) حضرت حسین سے ملا۔ اور دوسری روایت کی رو سے فرزدق ۸ رزی الحج کو حرم شریف پہنچ گیا تھا اور حضرت حسین سے ملاقات مکے سے آپ کے نکلنے وقت ہوئی۔

اور ایک تیسری روایت بھی ہے جو بعض شیعہ مصنفین نے اپنے ماخذ سے لی ہے۔ وہ اس ملاقات کے واقعہ کی ایک تیسری شکل بتاتی ہے کہ فرزدق حج کر کے لوٹ رہا تھا۔ تب ایک پڑاؤ پر ملاقات ہوئی۔ غرض "شد پریشال خواب من از کثرت تعبیر با" کا مضمون ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ یا کہہ لیجئے اندھول کی نیل شناسی، کہ جس اندھے نے ہاتھی کے جس حصے کو چھوا اسی کی شکل و صورت اور سائز کو پورے ہاتھی کی شکل اور سائز بتا دیا۔

روداد سفر کی روایتوں کا یہی وہ حال ہے جس کی بنا پر عرض کیا گیا کہ بالکل قابل اعتبار

۱۔ ایضاً۔ ۲۔ عبدالرزاق الموسوی المقرّم نے "مقل حسین" میں ۱۵۷ پر۔

نہیں ہیں۔ فرزدق کی ملاقات کے سلسلے میں طبری کی دونوں روایتیں یہ بتاتی ہیں کہ حضرت حسین نے فرزدق سے پوچھا کہ ”اپنے پیچھے (یعنی عراق میں) کیا حال چھوڑ کر آئے ہو؟“ فرزدق نے جواب دیا کہ:

”دل آپ کے ساتھ ہیں اور تلواریں بنی امیہ کے ساتھ اور تھنات در اللہ کے ہاتھ میں۔ جس پر آپ نے فرمایا ”سح کہتے ہو“ اور رخصت ہو گئے۔“

یہاں قدرتی طور پر حیرت ہوتی ہے کہ حضرت حسین نے تو یہ سفر پوری طرح اس طہیمان پر شروع کیا تھا کہ گونے کے لوگ آپ کی حمایت پر مستعد اور آپ کی آمد کے لیے چشم براہ ہیں پھر فرزدق کی اس سے بالکل مختلف بات پر اظہارِ تعجب کے بجائے آپ نے تصدیق و تصویب فرمائی! بعد میں آنے والی کچھ اور روایات بھی ایسی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ فرزدق والی گفتگو کی شاید کوئی اصلیت نہیں ہے۔ یہ روایات آگے آرہی ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ فرزدق سے ملاقات سے کافی دنوں بعد تک حضرت حسین کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ اب کوفہ ان کے ساتھ نہیں ہے

انجامِ حضرتِ مسلم کی خبر

حضرت حسین کا قافلہ کوفہ کی طرف سرگرم سفر تھا۔ مسلم بن عقیل کا خط ملنے کے بعد سے وہاں کے حالات میں جو تبدیلی ہوئی تھی مثلاً خود جنابِ مسلم اور ہانی بن عروہ کو دی جانے والی سزا کے موت، اس کا کوئی علم کسی ذریعہ سے نہ ہوا تھا۔ راہ میں ایک منزل رُبالا آتی ہے جہاں سے کوفہ زیادہ دور نہیں رہتا۔ اس منزل پر آپ کو وہ قاصد ملا جسے کوفہ سے محمد بن اشعث نے مسلم بن عقیل کی وصیت کے مطابق ان کا یہ پیغام دے کر بھیجا تھا:

۱۷ طبری ج ۶ ص ۲۱۸ ۱۷ طبری ج ۶ ص ۲۲۶ -

”میں یہاں گرفتار کیا جا چکا ہوں۔ آپ شاید چل بھی نہ پائیں کہ میرا قتل ہو جائے۔
پس آپ جہاں بھی یہ پیغام پائیں لوٹ جائیں۔ کوثر والوں کا بھروسہ نہ کریں، ان
لوگوں نے آپ سے بھی جھوٹ بولا تھا اور مجھ سے بھی جھوٹ ہی بولا۔ اور یہ
تو آپ کے والد کے وہ ساتھی ہیں کہ جن کی وجہ سے وہ موت یا قتل کی تمنا کرنے
لگے تھے۔“

ایک روایت کے مطابق آپ نے درمیان سفر میں مقام حاجر سے اپنے رضاعی بھائی
عبداللہ بن یقظ کے ہاتھ (یا حسب اختلاف روایت ایک دوسرے شخص کے ہاتھ) اہل کوثر
کے نام اپنی روانگی کی اطلاع بھی روانہ کی تھی۔ اسی منزل زبالہ پر ان کے بارے میں بھی خبر
ملی کہ وہ کوفہ سے پہلے قلاسیہ کے مقام پر گرفتار کر لیے گئے اور پھر مقتول ہوئے۔

ساتھیوں کو آگاہی

کہا گیا ہے اور بالکل قرین قیاس ہے کہ زبالہ کی منزل پر یہ پوری صورت حال کو
بدل دینے والی جو اطلاعات حضرت حسینؑ کو موصول ہوئیں تو آپ نے ضروری سمجھا کہ ساتھیوں
کو آگاہ کریں اور اجازت دیں کہ اس نئی صورت حال میں جو شخص قافلے سے علاحدہ ہو یا چاہے
وہ علاحدہ ہو جائے۔ یہ بات روایات کے مطابق آپ نے خاص طور پر ان ساتھیوں کے
پیش نظر رکھی تھی جو راستے کی منزلوں پر آپ کے بارے میں یہ سمجھ کر ساتھ ہو گئے تھے کہ کوفہ
آپ کے تابع ہے اور آپ وہاں حکومت کرنے جا رہے ہیں۔ اور یہ زیادہ تر بدوی لوگ تھے
جو منفعت کی امید میں ساتھ لگ گئے تھے۔ چنانچہ ایسے سب ہی لوگ یہ خبر سن کر منتشر
ہو گئے اور آپ کے ساتھ شریک سفر صرف وہی لوگ رہے جو مکہ سے ساتھ تھے۔

۲۱۱ ص ۶ طبری ج ۲ ص ۲۲۶ ایضاً

واپسی کا مشورہ

طبری نے اسی صفحہ (۲۲۶) پر اگلی روایت دی ہے کہ زبالہ کے بعد والی منزل بطن عقبہ پر قیام ہوا تو وہاں ایک شخص نے آپ کے حالات جاننے کے بعد باصرہ مشورہ دیا کہ برائے خدا آگے نہ جائیے ان حالات میں آگے جانا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ آپ نے اس رائے سے اتفاق کیا مگر فرمایا کہ ”اللہ کے ارادوں پر کوئی غالب نہیں ہو سکتا“ اور سفر جاری رکھا۔

ایک صفحہ قبل یعنی (۲۲۵ پر) طبری نے ایک اور روایت بھی ایسے ہی مشورے کی نقل کی ہے، یہ مشورہ ان دونوں کوفیوں نے دیا تھا جن کا ذکر ہم نے فرزدق کی ملاقات والی روایتوں کے ضمن میں کیا ہے کہ یہ حج کے بعد سے حضرت حسین کے قافلے کے پیچھے بطور مشاہد لگ گئے تھے۔ ان کی روایت ہے کہ زور زور کے مقام پر کوفے سے آنے والے ایک شخص سے ہم کو مسلم اور ہانی کے بارے جاننے کی خبر ملی جو ہم نے ثعلبۃ کی منزل پر حضرت حسین کی خدمت میں رازداری کے ساتھ پہنچائی اور پھر ذرا سا وقفہ دیکر عرض کیا کہ ”اللہ آپ آگے نہ جائیے۔ اب کوئی گنجائش نہیں ہے“۔ کہتے ہیں کہ سنتے ہی بنو عقیل چلائے کہ ہرگز نہیں! واللہ ہم اس کے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یا تو اپنے بھائی مسلم کا انتقام لیں اور یا ہم بھی ان کے والے انجام سے دوچار ہو جائیں۔“ کوفی راوی کہتے ہیں کہ اس پر آپ نے ہماری طرف دیکھا اور فرمایا کہ ان (بچوں) کے بعد بھلا زندگی میں کیا مزہ؟ یعنی آپ نے سفر جاری رکھنے کا فیصلہ فرمایا۔ ص ۲۲۶ والی روایت میں جو الفاظ بطن عقبہ کی منزل کے آئے ہیں کہ ”تم ٹھیک کہتے ہو مگر اللہ کے ارادوں پر کون غالب آسکتا ہے؟“ ان الفاظ کو دیکھ کر لوگ گمان ہوتا ہے کہ غالباً کوفیوں والی وہ روایت صحیح ہے جو ابھی گزری جس کے مطابق نظاراً آپ (دو منزل لیس پہلے ثعلبۃ کے مقام پر) یہ فیصلہ کر لینا چاہتے تھے کہ آگے نہ بڑھا جاؤ مگر بنو عقیل نے ثعلبۃ اس راہ کی مشہور منزلوں میں ہے۔ مکہ کی طرف سے جانے میں زبالہ سے ایک منزل پہلے پڑتی ہے۔

کاٹخ دیکھ کر اس کو مناسب نہ سمجھا اور ان کے اصرار کو آپ نے سمجھا کہ یہ تقدیر الہی ہے۔

حضرت محمد الباقری کی روایت

طبری نے رودادِ سفر اور واقعہ شہادت کے سلسلے میں دوسری بہت سی روایتوں کے ساتھ ایک مسلسل روایت ٹکڑوں میں بانٹ کر حضرت حسین کے پوتے حضرت محمد الباقری بھی درج کی ہے، اس روایت کے پہلے ٹکڑے کا ایک اقتباس ہم پیچھے دے چکے ہیں (باب ۷) اس کے دوسرے ٹکڑے میں آتا ہے۔

فاقبل حسین بن علی بکتاب	حسین بن علی، مسلم بن عقیل کا خط پانے
مسلم بن عقیل کان الیہ حتی	کے بعد کوفہ کی طرف متوجہ ہو گئے حتیٰ کہ
اذا کان بینہ و بین القادسیۃ	جب آپ وہاں پہنچے کہ نادر اسی کے اور
ثلثۃ امیال لقیۃ الحر بن یزید	آپ کے درمیان بس تین میل کا فاصلہ
التمیسی فقال لہ این ترید	تھا تو وہاں حر بن یزید اتمی سے ملاقات
تال ارید ہذا المصر قال	ہوئی۔ حر نے دریافت کیا، کہاں
لہ ارجع فانی لم ادع لک	کا ارادہ ہے؟ فرمایا اسی شہر کا۔ حر
خلفی شنیئاً ارجوۃ فہم ان	نے عرض کی، آپ لوٹ جائیں اسیلے
یرجع وکان معہ اخوۃ مسلم	کہ میں (جو وہیں سے آ رہا ہوں) آپ
بن عقیل فقالوا ادا للہ لانزعج	کے لیے کوئی اچھی صورت حال چھوڑ کر
حتی نصیب بثأرنا	نہیں آ رہا ہوں۔ اس پر اپنے واپسی
ادنقتل، فقال لاخیر فی	کا ارادہ فرمایا۔ لیکن مسلم بن عقیل کے

لہ تاویہ اسلامی تاریخ فتوحات کا نہایت مشہور نام ہے۔ کوفہ سے تقریباً ۲۵۔۵۰ میل بجانب جنوب مغرب اس کا محل وقوع ہے اس میں گزر کر ہی کوفہ کا سیدھا راستہ ملے سے تھا۔

حیاتنا بعد کم فساد... یلہ
 بھائی آپ کے قافلے میں تھے، وہ بولے
 کہ خدا کی قسم ہم تو بغیر بدلہ لیے یا اپنی
 جان دینے نہیں واپس ہوں گے، تب
 آپ نے فرمایا کہ تمہارے بعد میرے
 لیے زندگی میں کیا مزہ ہے؟ اور یہ کہہ کر
 آپ آگے کوچل دیئے۔

حضرت محمد الباقری کی اس روایت کے بعد۔ جو اگر سنا صحیح روایت ہے اور یقیناً انہوں نے اپنے
 والد ماجد حضرت علی بن اکسین (زین العابدین) سے سنی ہوگی جو اس سفر میں اپنے والد ماجد
 حضرت حسین کے ساتھ تھے۔ یہ بات بالکل یقینی ہو جاتی ہے کہ حضرت حسین نے حالات کے
 مکمل انقلاب کا علم یقین حاصل ہو جانے کے بعد واپسی کا ارادہ فرمایا تھا۔ اگرچہ وہ برادران
 مسلم کی وجہ سے عمل میں نہ آسکا۔

سمتِ سفر کی تبدیلی اور نزولِ کربلا

جیسا کہ اوپر کی روایت میں آیا آپ نے برادرانِ مسلم کی بات سن کر واپسی کا ارادہ ترک
 کیا اور آگے کوچل دیئے۔ مگر پھر یہی روایت بتاتی ہے کہ آگے کو بڑھتے ہی ابن
 زیاد کا گھڑ سوار دستہ سامنے آگیا۔ جو قادیسیہ میں متعین تھا۔ اسے دیکھ کر
 آپ نے اپنا رخ قادیسیہ اور کوفے سے ہٹا کر کربلا کی طرف کر دیا۔

۱۔ طبری ج ۶ ص ۲۲ ۲۔ خود محمد الباقری بھی اُس وقت دو ڈھائی سال کی عمر کے تھے؛ یعنی
 تاند کر بلا میں داخل تھے۔ ۳۔ کربلا قادیسیہ سے بجانب شمال اور کوفے سے بجانب
 شمال مغرب ۱۲-۱۰ کلومیٹر آگے ہے۔ اور حضرت حسین جنوب مغرب کوفہ کی طرف کو بڑھ رہے تھے۔

مسار فلقیہ، ادائل خیل عبد اللہ
 فلما رأی ذالک عدل
 الی کربلاء فاسند ظہرہ
 الی تصباء و خلا کی لایقاتل
 إلا من وجہ واحد فنزل
 و ضرب ابنیتہ و کان
 اصحابہ خمسۃ و اربعین
 فارسا و ماۃ راجل
 پس آپ آگے کوچل دیئے، مگر چلتے
 ہی آپ کو عبید اللہ بن زیاد کا مقدمہ
 ابجیش نظر آیا۔ اسے دیکھ کر آپ نے
 کربلا کی طرف رخ موڑ لیا۔ وہاں آپ نے
 بانس اور زر کل کے جنگل کو اپنی پشت
 پر لیا اور مضبوطی سے جم گئے تاکہ دشمن
 سوائے ایک طرف کے کہیں اور سے
 حملہ نہ کر سکے۔ یہاں نزول فرما کر آپ
 نے اپنے خیمے لگوائیئے اور آپ کے
 ساتھی پینتالیس سوار اور سو تالیس
 پیادے تھے۔



باب دہم کربلا کی سرگذشت

عمر بن سعد کی آمد

حضرت محمد الباقرؑ کی جس روایت کے الفاظ پر گذشتہ باب بند ہوا ہے، اسی روایت میں آگے بیان ہوا ہے کہ عمر بن سعد بن ابی وقاص جن کو ابن زیاد رُسے کا حاکم بنا کر بھیج رہا تھا، حضرت حسینؑ کا معاملہ سامنے آجانے پر اپنی ابن سعد کو یہ حکم ہوا کہ پہلے تم اس معاملے سے پیٹتے جاؤ (عربی کے الفاظ ہیں اکفنی هذ الرجل) انھوں نے اس خدمت کے معافی چاہی، مگر مجبور ہونا پڑا اور حضرت حسینؑ کے نزول کربلا کی اطلاع پا کر کربلا کا رخ کیا۔

صلح کی بات اور ناکامی

فلما اتاه قال له الحسين	پس جب ابن سعد وہاں پہنچ گئے تو
اخذوا احداً اماناً تدعونى	حضرت حسین نے ان سے کہا کہ تین باتوں
فاصرف من حيث جئت	میں سے ایک قبول کرو یا تو میں جہاں
اما ان تدعونى فاذهب	سے آیا ہوں وہاں واپس ہو جانے دو
الى يزيد واما ان تدعونى	یا زید کے پاس چلا جانے دو اور یا

اے فارس کا ایک اہم شہر جو اب تہران سے تین میل کے فاصلے پر ایک مضافاتی بستی ہے۔

فانطلق لیسیر نحو طریق الشام
 نحو زید فلیقتہ الخیول بکربلاء
 فنزل ینا شداہم اللہ
 والاسلام قال وکان بعث
 الیہ عمر بن سعد وشمس
 ذی الجوشن وحصین بن
 نمیر فنا شداہم الحسین
 اللہ والاسلام ان لیسیر ذہ
 الی امیر المؤمنین فیضع
 یدہ فی یدہ فقالوا لا
 علی حکم بن زیاد۔

اندر کی توخر نہیں البتہ اتنا جانتے
 ہیں کہ ہم ادھر سے ادھر جا سکتے ہیں
 اور نہ ادھر سے ادھر آسکتے ہیں۔ اس
 پر آپ نے شام کو راستے کی طرف یعنی
 زید کی طرف کو چلنا شروع کیا اور اسی
 اثنائیں مقام کربلا میں آپ کو گھروسوار
 دستوں کا سامنا ہوا پس آپ اترے
 اور انھیں اللہ اور اسلام کا واسطہ دیکر
 سمجھانے لگے۔ راوی کا مزید بیان ہے
 ابن زیاد نے عمر بن سعد، شمر بن ذی
 الجوشن اور حصین بن نمیر کو کربلا بھیجا
 تھا۔ سو آپ نے انکو اللہ اور اسلام کا واسطہ
 دیکر کہا کہ آپکو امیر المؤمنین زید کے پاس
 جانے ہیں وہاں آپ اپنا ہاتھ انکے ہاتھ
 میں دیدیں گے مگر ان لوگوں نے کہا کہ
 نہیں پہلے آپ کے ابن زیاد کا حکم ماننا ہوگا
 (یعنی ان کے پاس چلنا ہوگا)

لہ یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ یہ بات چیت قادیسیہ کے قریب ہی کہیں ہو رہی ہے جو کونے کا ناکہ تھا اور
 جہاں روک تھام کے انتظامات تھے۔

۲۲۲ ج ۶ ۲۲۲ اس روایت میں تین صورتوں کے بجائے صرف زید کے پاس جانے والی صورت کا ذکر
 ہونے کی وجہ شاید یہ ہو کہ یہ تینوں صورتوں میں سب زیادہ اہم اور قابل ذکر چیز تھی۔ واللہ اعلم۔

اس روایت میں اس بات کا ذکر نہیں ہے جو اوپر والی روایت میں تھا کہ عمر بن سعد نے تو حضرت حسین کی پیش کش (یا مصاحتی فارمولہ) قبول کر لیا تھا مگر ابن زیاد نے اُسے رد کر کے واحد صورت یہ تجویز کی کہ وہ کوفے آکر پہلے اُس کے ہاتھ میں ہاتھ دیں۔ بعد میں ان کے مستقبل کا فیصلہ ہوگا۔ مگر یہاں اس بات کا ذکر نہ ہونا کہ عمر بن سعد نے تو قبول کیا تھا مگر ابن زیاد نے رد کر دیا۔ صرف بر بنائے اختصار ہی سمجھا جانا چاہیے، ورنہ ایسی کوئی ایک روایت بھی نہیں ہے جس کی بنا پر یہ خیال کرنے کی گنجائش ہو کہ عمر بن سعد کو لڑائی ٹالنے سے نہیں بلکہ برپا کرنے سے دلچسپی تھی۔ ابن سعد سے متعلق تمام روایتیں اس کی شہادت دیتی ہیں کہ وہ ہر ممکن طریقے پر زحواہش مند تھا کہ اسکے نامہ اعمال میں قتل حسین نہ لکھا جائے۔ اگرچہ اس معاملے میں حکومت کو ناراض کرنے کی حد تک جانے کو تیار نہ تھا۔

جنگ اور شہادت

حضرت محمد الباقری روایت میں اوپر گزر چکا ہے کہ ابن زیاد کی طرف سے یہ شرط کہ پہلے حسین اُس کے قیدی بن کر کوفے آئیں بعد میں ان کی سرخوشی پیش کش پر غور کیا جائے گا۔ حضرت حسین کو منظور نہیں ہوئی اور فرمایا لا اذ الله لا يكون هذابداً“ اس کے بعد بیان ہوا ہے

فقاتلہ فقتل اصحاب الحسين	جس پر عمر نے آپ سے جنگ کی ریاپ
كلهم وفيهم بضعة عشر شاباً.	نئے عمر سے جنگ کی اور اس میں تمام
من اهل بيته وجاء سهم	رفقائے حسین شہید ہوئے اور ان میں
ناصر ابنا له معني حجر	۱۵-۲۰ کے درمیان جوان آپ کے
فجعل يمسح الدم عنه	اہمیت میں سے تھے۔ اور ایک تیر کے

ويقول اللهم احكم بيننا وبين
 قوم دعونا لينصرونا فقتلونا
 ثم امر بجبرة فشقها
 ثم لبسها وخرج بسيف
 فقاتل حتى قُتل صلوات
 الله عليه -
 آپ کے ان صاحبزادے کو لگا جو آپ کی گود
 میں تھے آپ صاحبزادے کا خون پونختے
 جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے کہ اے
 اللہ تو ہی انصاف کیجئے ہمارے اور ان
 لوگوں کے درمیان جنہوں نے ہماری
 مدد کے وعدے پر ہمیں بلایا اور پھر
 قتل کیا پھر آپ نے ایک چادر طلب کر کے
 اسے پھاڑا اور اپنے اوپر لپیٹا پھر تلوار
 لیکر نکلے اور قتال کیا حتیٰ کہ شہید ہوئے۔
 صلوات اللہ علیہ۔

حصین بن عبدالرحمن کی روایت میں اس موقع پر ذرا سی اور تفصیل ہے، اُس میں
 کہا گیا ہے کہ ابن زیاد نے جو لشکر حسینیؑ کا قتلہ کی گرفتاری کے لیے بھیجا تھا اس میں ایک صاحب
 حر بن زید حنظلی بھی تھے جو ایک سوار دستے کے سالار تھے۔ انہوں نے جب یہ صورت حال
 دیکھی کہ حضرت حسینؑ کی بات رد کی جا رہی ہے تو معاملہ میں مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ
 یہ کیا غضب ہے!

والله لو سألكم هذا الترك
 والذليل مما حل لكم ان
 تروا ده -
 یہ بات تو اگر تم سے ترک اور ذلیل (کے)
 کا تر بھی مانگتے تو ان کا سوال بھی رد
 کرنا تمہیں روانہ تھا۔

مگر ہائی کمان کے ان تینوں افراد (عمر، شمر، حصین) نے اپنی بات پر اصرار جاری رکھا جس پر

لہ طبری ج ۶ ص ۲۲۲ ۲۲۳ ایضاً ص ۲۲۲۔ ۲۲۳ بعض دوسری روایات میں یہ بات اس طرح
 بیان ہوئی ہے کہ حر نے یوم عاشورہ کی صفت آرائی کے وقت ابن سعد (یعنی حاتم بن محمد) سے کہا کہ

حُزْنِ نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور حضرت حسین کی صفوں میں پہنچ گیا اور وہاں سے پلٹ کر ابن زیاد کے لشکر پر حملہ آور ہوا۔

فصوت المحرّ وجه فرسه
وانطلق الى الحسين واصحابه
فظنوا انه اتماجاء ليقاتلهم
فلما دنا منهم قلب ترسه
وسلم عليهم ثم كثر على اصحابه
ابن زياد فقاتلهم فقتل منهم
رجالين ثم قتل رحمة الله
عليه

اپس حُزْنِ نے اپنے گھوڑے کا رخ پھیرا
اور حسین اور ان کے ساتھیوں کی طرف چلا
اُن لوگوں نے گمان کیا کہ شیخ اُن سے
لڑنے آرہا ہے مگر قریب پہنچ کر حُزْنِ
نے اپنی ڈھال کو اُلٹ دیا اور دوست
نکر دشمن ہونے کی علامت تھی اور
سلام کیا اس کے بعد وہ اصحاب ابن
زیاد پر پلٹا اور حملہ کر کے دو آدمی مارے
علیہ

اور پھر خود بھی جان دیدی۔

حُصَيْنِ بن عبد الرحمن کی روایت کے اس زائد حصے سے یہ سمجھنا ممکن ہوتا ہے کہ کربلا کی جنگ کا آغاز شاید حُزْنِ بن یزید کی تلوار سے ہوا مگر کسی دوسری روایت سے اس کی تائید نہیں ہوتی بلکہ اس سے مختلف شکل سامنے آتی ہے جبکہ اس روایت کا بیان اتنا تشنہ ہے کہ محض اس کی بیاد پر اس میں درج واقعہ کو جنگ کا آغاز قرار دینا مشکل ہے۔

حُزْنِ بن یزید دوسری روایات میں

حُزْنِ بن یزید کا تذکرہ واقعہ کربلا کی دوسری روایات میں بہت زیادہ تفصیل کے ساتھ پایا جاتا ہے اور امام حسین کی مجلسوں میں انصار حسین کے جب نام آتے ہیں تو وہاں یہ

(بقیہ حایرہ صفحہ گذشتہ) امیر لشکر کو مطالبہ کر کے یہ بات کہی تھی اور ابن سعد ہی نے صرف جواب دیا تھا جو یہ تھا کہ میں تو خود ہی چاہتا تھا مگر میرا اختیار نہیں ہے۔ لہ طبری ج ۶ ص ۲۲۲۔

ایک بہت نمایاں نام ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں پہلی تفصیلی روایت یہ ہے کہ عمر بن سعد کے فوجی دستوں سے پہلے ایک گھڑ سوار دستے نے آکر حضرت حسینؑ کا راستہ روکا تھا، یہ دستہ حُر بن یزید، ہی کی قیادت میں تھا۔ اس روایت کے مطابق اس دستے کا اور قافلہ حسینؑ کا سامنا کر بلا سے کچھ دور پہلے ذوحجہ پہاڑ کے دامن میں ہوا۔ یہ دستہ اس اطلاع پر کہ حضرت حسینؑ نے اپنا رخ کوفے سے موڑ کر اس راہ پر کر دیا ہے جو شام اور دمشق کو جاتی ہے، اس مقصد سے قادسیہ سے دوڑایا گیا تھا کہ ان لوگوں کو صراحت میں کوفہ لائے حضرت حسینؑ نے اس بات سے انکار کر کے مکہ کو واپسی کا ارادہ کیا تو حُر اس میں حائل ہوا لیکن دل میں نرمی تھی، کسی بڑی سختی پر آمادہ نہ ہو پایا اور بیچ کی راہ یہ نکالی کہ نہ آپ کوفے جائیں نہ ہی مکے کو، بلکہ ایک مین مین راستے پر ہم دونوں ہلکے ہلکے چلتے ہیں حتیٰ کہ میں ابن زیاد کو خط بھیج کر موجودہ صورت حال میں اس کا نیا حکم حاصل کروں۔ روایت کہتی ہے کہ یہ حکم آیا کہ جہاں ہو وہیں قافلے کو روک لو اور انتظار کرو۔ چنانچہ حُر نے جو ابن زیاد کا حکم آپ کو پہنچایا اور مزید کسی رعایت سے معذوری ظاہر کی، تو اگرچہ آپ کے کچھ ساتھیوں کی رائے نہ تھی کہ اس حکم کے مطابق اسی جگہ پر رگ جانا قبول کیا جائے۔ بلکہ وہ چاہتے تھے کہ کسی مناسب اور اپنی پسند کی جگہ تک پہنچنے کی کوشش کی جائے، اگرچہ اس میں حُر کے دستے سے جنگ ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ مگر حضرت حسینؑ نے کسی طرح کی جنگ آزمانی کو مناسب نہ جانا اور حُر نے جہاں کہا وہاں آپ ٹھہر گئے۔ اور یہ کر بلا کا میدان تھا۔

۱۔ طبری ج ۶ ۲۳۲۔ کر بلا کے متعلق روایتوں میں یہ بھی ہے اور اسکی بجز شہر ہے، کہ یہ بے آب گیاہ ریتلا میدان تھا۔ مگر واقعہ میں یہ بے آب ہے۔ خود حضرت محمدؐ الباقولہ روایت کے الفاظ کہ ہاں بائیں درنگل (قضا، ہاں جنگل تھا اسکی تردید کرتے ہیں۔ بعض روایتوں میں آپ کے مقام نزول کو مینوی بھی بتایا گیا ہے۔ معجم البلدان کے مطابق یہ مینوی ایک وسیع علاقہ ہے جس میں کر بلا کا قریب واقع تھا۔ یہ وہ مینوی نہیں ہے جو شہر موصل کے پاس مشہور شہر اور ایک پرانی تہذیب کا مرکز ہے۔ — ج ۲ ۱۵۲

آپ کے اس نزول۔ نزول کر بلا۔ کی تاریخ ۲۱ محرم یوم پنجشنبہ ۱۱ھ درج ہوئی ہے۔ اور طبری نے چونکہ حرّ سے متعلق یہ روایت "۱۱ھ کے واقعات" کا عنوان قائم کر کے دی ہے۔ اس لیے سمجھنا چاہیے کہ حرّ کے دستے سے آپ کے تافلے کا سامنا یکم محرم ۱۱ھ کو ہوا۔ یعنی اس سے پہلے نہیں۔ اس کے بعد روایت کا سلسلہ بیان کہتا ہے کہ اگلے دن یعنی ۳۱ محرم یوم جمعہ کو۔ عمر بن سعد کی سرکردگی میں چار ہزار نفوس پر مشتمل مزید فوجی دستے پہنچ گئے۔

دونوں روایتوں میں تطبیق

حصین بن عبدالرحمن کی روایت اور دوسری روایتوں میں جو فرق پایا جاتا ہے اُسے ہم اجمال اور تفصیل کا فرق کہہ سکتے ہیں۔ بایں معنی کہ حرّ بن یزید کا پورا قصہ اسی تفصیل کے مطابق ہو جو ابھی اوپر بیان ہوئی لیکن حصین بن عبدالرحمن کی روایت میں اس کا اختصار کر کے بس حرّ کی موجودگی میدان کر بلا میں دکھائی گئی ہے۔

حرّ کے کردار کی کچھ اور تفصیلات

لیکن اس موجودگی کے بعد حرّ کے جس خاص کردار کا بیان حصین کی روایت میں ہوا ہے کہ وہ اپنے دستے کی قیادت چھوڑ کر حضرت حسینؑ کی صفوں میں جا ملے اور پھر اُدھر سے پلٹ کے عمر بن سعد کے لشکر پر حملہ آور ہوئے، اس کردار کی جو تفصیلی شکل طبری کی دوسری روایتوں میں بیان ہوئی ہے وہ ایسی نہیں ہے کہ جسے تفصیل اور اجمال کا فرق کہہ کر قبول کر لیا جائے بلکہ یہ دراصل میدان کر بلا کے واقعات کی اُس "تفصیل" کا حصہ ہے جس کا وجود بظاہر عالم واقعہ میں نہیں ہوا بلکہ وہ مصنفینِ مقاتل یا ان کے "راویوں" کی قوت تخیل کا کرشمہ ہیں۔

اس نوعیت کی تفصیلی روایتوں کے مطابق جن کا سلسلہ طبری میں صفحہ ۲۳۴ سے

تقریباً ۲۶۸ تک یعنی تیس تیس صفحات میں پھیلا ہوا ہے، حُمر نے یوم عاشورہ میں عین اس وقت جبکہ دونوں طرف صفت بندی ہو چکی تھی اپنے سرداران لشکر کی آنکھوں کے سامنے بڑی باریک حکمتِ عملی سے کام لیکر اپنی صفت کو پار کیا اور صفتِ حسینی میں جا پہنچے۔ اذلاً معافی تلافی کی کہ یہ میرا ہی تصور ہے جو آپ کو کیج یہ صورتِ حال درپیش ہے۔ ورنہ میں اگر آپ کا راستہ نہ روکتا تو آپ سلامتی کے ساتھ واپس ہو چکے ہوتے۔ اس کے بعد اپنی معافی اور توبہ کی قبولیت کا اطمینان حضرت حسینؑ کی زبان سے حاصل کیا۔ پھر پلٹ کر لشکر ابن زیاد کی طرف گئے اور ایک تقریر ان کو مخاطب کر کے کی۔

”اے لوگو، تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ حسین کی پیش کردہ باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی تم قبول نہیں کرتے۔ ”لوگوں“ نے کہا کہ ”ہمارے امیر عمر بن سعد سے بات کرو۔ پس انہوں نے عمر کو مخاطب بنا کر یہی بات کہی۔ عمر نے جواب دیا کہ ”مجھے تو خود بید خواہش تھی، اگر میرے بس میں بات ہوتی،“ اس پر حُمر پھر عام لوگوں سے مخاطب ہو گئے کہ ”اے کو فیو خدا تمہیں عنارت کرے۔ تم نے ان کو بلایا اور بلا کر دشمن کے حوالے کر دیا۔ تم نے دعویٰ کیا تھا کہ تم اپنی جانیں ان پر قربان کرو گے۔ اور اب تم اٹان کو قتل کرنے کے درپے ہو۔ تم نے انہیں گھیر لیا ہے اور گھوٹ کے مارنا چاہتے ہو۔ اللہ کی لمبی چوڑی زمین میں سے کسی طرف کو چلے جانے کا اذن نہیں دے رہے کہ وہ اور ان کے اہلبیت اسن پائیں۔ تم نے ان کو ایسا بے بس قیدی بنا لیا ہے کہ اپنے نفع نقصان کا کچھ بھی اختیار ان کو نہیں رہ گیا۔ تم نے ان کو اونگی عورتوں اور ساتھیوں کو فرات کے اس بہتے پانی سے محروم کر رکھا ہے جسے پڑی مجوسی اور نصرانی بھی پیتے ہیں اور علاقے کے خنزیر اور گتے اس میں لوٹتے ہیں اِدھر یہ ہیں کہ پیاس سے مرے جاتے ہیں۔ کیا ہی بُرا سلوک ہے جو تم نے ذریت

۱۔ اس حکمتِ عملی کی تفصیل خاصی طویل ہے۔ طبری ج ۶ ص ۲۴۲۔

محمدؐ کے لیے روار کھا ہے، خدا تمہیں بھی (قیامت کی) پیاس کے دن پانی کے
 قطروں کو ترسائے۔ اگر تم اس وقت کارویہ چھوڑ کر اس سے توبہ نہیں کرتے ہو۔“
 اور سب باتیں چھوڑیئے اس بات کا یقین تو درکنار کیا امکان بھی مانا جاسکتا ہے
 کہ لشکر کا ایک انصر عین میدان جنگ میں کھلی غداری کر کے ”دشمن“ کی صفوں کا حصہ بن جائے
 اور لشکر کا انصر بالانہ صرف یہ کہ دشمن کی صفوں سے اس کی تقریر سننے اور اپنے فوجیوں کو سننے
 دینے کے لیے تیار ہو جائے، بلکہ اس کے جواب میں ایسے الفاظ بھی کہے کہ:-
 ”تم جانتے ہو کہ میرے بس میں کچھ نہیں۔ ورنہ میں تو شروع ہی سے اس بات کا
 حامی اور حریص ہوں کہ حسینؑ کی تین باتوں میں سے کوئی ایک بات مان لی جائے؛
 ظاہر ہے کہ یہ تو عام حالات میں بھی ایک ناقابل تصور بات ہے۔ مگر یہاں تو حالات
 بھی عام قسم کے نہ تھے۔ اسی تاریخ طبری کی روایات کے مطابق یہ صورت حال تھی کہ عرب
 سدا کی ہر ممکن کوشش کے باوجود کہ اُسے اس ہم پر نہ بھیجا جائے ابن زیاد نے مجبور کر کے بھیجا
 تھا۔ پھر جب انہیں روایتوں کے مطابق اس نے حضرت حسینؑ کی طرف سے مصالحت کی
 پیش کش اور اُس کا فارمولا اپنی سفارش کے ساتھ ابن زیاد کو بھیجا تو وہاں سے جواب آتا تھا کہ:-
 ”میں نے تم کو اس لیے نہیں بھیجا تھا کہ تم دہاں جا کر اپنی بچت کی راہیں نکالو حسین
 کو ڈھیل دو اور بقاء و سلاحتی کے خواب دکھاؤ، نہ اس لیے کہ دہاں جا کر ان کے
 سفارشی بن بیٹھو۔ دیکھو اگر حسین اور ان کے ساتھی میرا حکم مانتے اور اپنے آپ کو
 سپرد کر دیتے ہیں تو انہیں یہاں بھیجو۔ ورنہ ان پر یمن اور ورنہ ضرر قتل کرو
 بلکہ ان کا مُتلاک کرو (ناک کان کاٹو) اس لیے کہ یہ اسی کے قابل ہیں اور خاص کر

طبری ج ۶ ص ۲۳۵ ۲۳۶ غلط نہیں ہو یہاں دشمن کا لفظ ابن زیاد کی فوج کے نقطہ نظر سے اور اس کے احساس
 کی ترجمانی کے طور پر لکھا گیا ہے۔ ۳۰ جی ہاں ”انہی روایتوں کے مطابق“ ورنہ آگے جو بات نقل کی جا رہی
 ہے اس مصنف کے نزدیک اسکا بیشتر حصہ تو بالکل من گھڑت ہے اور ہو سکتا ہے کہ کل ایسا ہی ہو۔

حسین قتل ہوں تو ان کا سینہ اور پشت گھوڑوں سے روندو۔ ایسے کہ وہ حکومت کے نافرمان، باغی، حریت اور نہایت خطا کار ہیں۔“

نیز یہ بھی اس سلسلے کی روایات میں موجود ہے کہ ابن زیاد نے یہ جوابی خط شمر ذی الجوشن کو اس ہدایت کے ساتھ دیکر کربلا روانہ کیا تھا کہ اگر عمر بن سعد پھر بھی لیت و لعل کرے تو لشکر کی کمان تم ہاتھ میں لو اور عمر کا سر کاٹ کر ہمارے پاس بھیج دو۔

چنانچہ جیسا کہ حسین بن عبد الرحمن کی روایت میں اوپر گزرا اور اس کے سوا بھی طبری کی متعدد روایتیں یہی بات بتاتی ہیں کہ عمر بن سعد حضرت حسین کی پیش کش قبول کرنے سے غدر کر کے ان کے سامنے بس یہی ایک فیصلہ کن بات رکھنے پر مجبور ہوئے کہ آپ اپنے آپکو ابن زیاد کے حکم کے مطابق (جو سرکارِ زید کی طرف سے حضرت حسین کے معاملے میں کئی (FULL)) مختار بنا دیئے گئے ہیں) ہمارے حوالے کر دیں۔

کیا کوئی امکان ان حالات میں اس بات کے سوچے جانے کا ہے کہ اسی عمر بن سعد نے اپنے لشکر کے ایک باغی کی نصرت تقریر خود سنی اور اپنے لشکر کو پورے سکون و اطمینان سے سننے دی بلکہ نہایت ندامت کے ساتھ علی الاعلان یہ جواب بھی دیا کہ ”میں کیا کروں مجبور ہوں؟“ ہاں یہ بات ہو سکتی تھی جبکہ مان لیا جائے کہ عمر بن سعد کو گرفتاری یا جنگ کیلئے نہیں بلکہ صلح کی گفت و شنید کے لیے بھیجا گیا تھا مگر ایسی صورت میں ۴۵ ہزار فوج کی کوئی تنگ نہ بیٹھیگی۔

ایک اور روایت اس قصے کو اور بھی زیادہ ناقابل تصور بنانے والی سن لیجئے، طبری کی اسی جلد ۲۲۲ پر ہے کہ عمر بن سعد اپنے ساتھیوں کے ساتھ گرمی دور کرنے کے لیے نہر میں گھسے ہوئے تھے کہ ایک شخص نے آکر کان میں کہا: امیر ابن زیاد نے جویریہ بن ابی

طبری ج ۶ ص ۲۳۶ ۲۳۷ ایضاً

تمہی کو اس ہدایت کے ساتھ آپ کے پاس بھیجا ہے کہ آپ (عمر) اگر حسین اور ان کے ساتھیوں سے جنگ نہیں کرتے ہیں تو وہ آپ کی گردن مار دے۔ عمر نے یہ سنا تو گود کر اپنے گھوڑے کی طرف آئے، سوار ہوئے اور گھوڑے ہی پر بیٹھے بیٹھے ہتھیار منگا کر سجائے اور لشکر لے کر حسینی قافلے پر پہنچے اور جنگ کی۔ ذرا غور کر لیجئے کہ ایک طرف یہ روایتیں اور ایک طرف وہ روایتیں! کیا کوئی بھی صورت دونوں کے بیک وقت درست ہونے کی ہے؟

اور یوم عاشورہ کی باقی کہانی

حیرت مصنفین مقتل حسینؑ یا ان کے راویوں پر نہیں؛ جنہوں نے واقعہ کربلا کو ایک بھر لوہر زریبہ داستان کا روپ دینے کے جوش میں اس کے مبینہ واقعات کے سلسلے میں امکان اور عدم امکان سے بحث نہیں رکھی۔ حیرت اپنے مورخین پر ہے کہ یہ باہم متضاد اور ناممکن الوقوع قسم کی حکایتیں قطار در قطار انہوں نے اپنی کتابوں میں جمع کر لی ہیں۔ جیسے حرّ کی تقریر کی یہ روایت ہے ایسے ہی انہیں حالات میں جن کی طرف اوپر دو تین اشارے کیے گئے، کتنی ہی روایتیں اور حکایتیں ہمیں حضرت حسین اور ان کے ساتھیوں کی کتنی ہی چھوٹی بڑی تقریریں سناتی ہیں۔ دو دو آدمی عمر بن سعد کی گردن مارنے کا حکم لیے ہوئے موجود ہیں۔ اور ایک تو ان میں شمر جیسا بد نام بھی ہے۔ مگر ابن سعد ہیں کہ نہ صرف حسینؑ کے خلافت تلوار آزمائی میں ”بدستور ڈیر لگا رہے ہیں بلکہ اس طرح ڈیر لگا رہے ہیں کہ اپنے فوجیوں کو وہ تقریریں سنواتے ہیں جو انہیں بغاوت پر آمادہ

لے اور یہ تمام گفتگو حرّ کے بارے میں اس نیا دہ پر ہو رہی ہے کہ وہ ابن زیاد کا ایک فوجی افسر تھا جیسا کہ مشہور روایات میں ہے۔ مگر یاد کیجئے حضرت محمد الباقردالی روایات ساس کی رو سے یہ شخص مخالف فریق سے کوئی تعلق ہی نہ رکھتا تھا ایک عام آدمی تھا، جو کوفے کی طرف سے آتا ہوا حضرت حسینؑ کو ملا تھا۔

کرنے کے لیے دشمنوں کی صفوں سے کی جا رہی ہیں، اہل تشیع اپنے ائمہ کے لیے معجزات کا ویسے ہی عقیدہ رکھتے ہیں جیسے ہم انبیاء علیہم السلام کے لیے۔ وہ اگر ان ناممکنات کے قائل ہیں اور ایک ہی وقت میں متضاد باتوں کے وقوع کا بیان منبر پر کرتے ہیں تو ٹھیک ہیں وہ بطور معجزہ امام ان باتوں کا قائل اپنے آپ کو کر سکتے ہوتگے، مگر ہم لوگ جو ان ائمہ کے لیے تمام تر احترام کے باوجود کوئی معجزہ نہیں مانتے وہ کیسے انتہائی درجہ کی ان متضاد روایتوں کو اپنے دل و دماغ یا اپنی کتابوں میں جگہ دیتے ہیں؟ ان متضاد اور عجوبہ روایتوں کے جنگل میں تقریباً دس ماہ پہلے داخل ہو کر یہ راقم الحروف جس حیرت میں مبتلا ہوا تھا آج تک اُس حیرت کا وہی عالم بلکہ اس سے بھی کچھ سوا ہے۔ اب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہو پایا کہ ہمارے مؤرخین نے کیسے اس جنگل کو اپنی کتابوں میں سجایا ہے؟

حضرت حسینؑ اور رفقاء کی تقریریں

طبری نے روایت بیان کی ہے کہ شمر بن ذی الجوشن، عبید اللہ بن زیاد کا وہ حکمنامہ عمر بن سعد کے پاس لے کر آیا جس کا ذکر اوپر آچکا ہے جس میں کہا گیا تھا کہ حسینؑ سے نپٹنے کے معاملے میں فضول وقت مت گنواؤ تمہیں اس لیے بھیجا گیا ہے کہ انہیں حراست میں لے کر یہاں آؤ۔ حرارت قبول نہیں کرتے تو قتال کر کے قتل کر دو۔ ورنہ ہم نے شمر کو ہدایت کی ہے کہ وہ لشکر کا چارج تم سے لے لے۔ ابن سعد نے خط دیکھ کر کہا کہ مجھے لگتا ہے کہ معاملہ تم ہی نے خراب کیا ہے۔ ورنہ ابن زیاد حسین کی پیش کردہ تین صورتوں میں سے کسی ایک کو مان ہی لیتا اور پھر یہ کہہ کر کہ نہیں، میں ہی مفوضتہ ہم کو انجام دوں گا۔

۱۔ کتاب کے پہلے ایڈیشن کے تبصرے پر ایک تبصرہ نگار نے اس جملے پر اعتراض کیا تھا کہ اس میں دونوں عقیدوں کو کیا بتایا گیا ہے جو کہ غلط ہے۔ مگر اس میں غلطی دراصل تبصرہ نگار سے ہو رہی تھی کہ اس نے "دیے ہی عقیدہ رکھتے ہیں" کو "دیا ہی عقیدہ رکھتے ہیں" کے معنی میں لے لیا۔

اُس نے اسی وقت فوج کو حملے کے لیے کوچ کا حکم دیدیا۔ یہ محرم ۱۱ھ کی ۹ تاریخ پنجشنبہ کا دن اور عصر کا وقت تھا۔ اس کے بعد بیان ہوا ہے کہ ان لوگوں سے یہ کہہ کر مہلت (حضرت حسین کی طرف سے) مانگی گئی کہ بھئی یہ تم ایک دم سے چڑھ آئے، ہمیں بتایا تو ہوتا۔ کہ کوفے سے ہمدانی پیش کش نامنتظر ہو گئی ہے۔ بات منقول تھی۔ شمر کو بھی اتفاق کرنا پڑا اور اس قرار داد پر فوج واپس ہو گئی کہ صبح تک آپ لوگ فیصلہ کر لیں، صبح کو یا تو سپردگی ہو جائے ورنہ ہم طاقت استعمال کریں گے۔

حالات کی جو صورت اور پر بیان کی گئی تھی اس میں ۹ محرم کی شام کو داخل ہونے والے اس نئے عصر کا بھی اضافہ کر لیجئے، جس کا ابھی ذکر ہوا کہ دشمن ۹ کی شام ہی کو حملہ آور ہونے کے لیے آیا اور مشکل صبح تک کا وقت دیکر واپس گیا کہ رات میں فیصلہ کر لیں کہ پُر امن سپردگی منظور ہے یا مزاحمت۔ اور پھر اس پس منظر میں ذرا غور کیجئے کہ کیا یہ بات قابل عقین نظر آتی ہے کہ تاریخ کی صبح عمر بن سعد، شمر بن ذی الجوشن کے ساتھ اور اُس عمرو بن الجحج کے ساتھ جسے ہم روایتوں کے مطابق کچھ ہی دیر بعد رفقائے حسین پر بہر فرات کا راستہ روکتے ہوئے پاتے ہیں، اپنی فوج لیے ہوئے آتا ہے تو نہ یہ پوچھتا ہے کہ آپ نے کیا فیصلہ کیا؟ اور نہ ہی کسی علامت سے یہ نتیجہ اخذ کر کے کہ مزاحمت کا فیصلہ ہے حملہ آور ہوتا ہے، بلکہ اپنی چار پانچ ہزار فوج اور شیعہ مضعین کے مطابق کم از کم بیس تیس ہزار فوج کے ساتھ آگے بہتر پیادوں اور تیس سواروں کے سامنے اس طرح کھڑا ہو جاتا ہے جیسے کچھ برابر سوار کی بات ہو اور باقاعدہ جنگ ہونی ہو۔ اور پھر اس صورت حال میں حضرت حسینؑ انھیں

۱۱ھ طبری ج ۶ صفحہ ۲۲۶-۲۲۷ ۱۲۸ھ ایضاً ۱۲۸ھ روایت میں ہے کہ صبح کو جب لشکر حسینؑ خیموں پر پہنچا تو دیکھا کہ خیموں کے ارد گرد آگ روشن ہے جس سے سمجھا جاسکتا تھا کہ مزاحمت کا فیصلہ ہے اور یہ حفاظتی انتظام ہے۔
۱۳ھ شہید انسانیت، از قبلہ علی نقی صاحب لکھنوی، صفحہ ۳۴ ۱۴ھ کوئی بھی حکومت اپنے باغیوں کے ساتھ حتی الامکان برابر کے حرفوں والا معاملہ نہیں کرتی چرچا ہے کہ اتنا کزور حرفیہ۔

مخاطب کر کے کچھ فرمانے کے لیے "ادنیٰ پر سوار ہو کر تشریف لاتے ہیں۔ اور آپ کو پورا موقع دیا جاتا ہے کہ جو کچھ فرمانا ہو فرمائیں۔ چنانچہ حسب روایت وہ فرماتے ہیں:-

"اے لوگو، میری بات سنو، جلدی سے کام نہ لو، یہاں تک کہ مجھ پر جو تمہارا حق ہے اس کے ماتحت تم کو نصیحت و ہدایت کا فرض ادا کرو اور تمہارے سامنے یہ حقیقت حال بیان کر دوں کہ میں تمہاری جانب کیوں آیا۔ اگر تم نے میرے بیان کو صحیح سمجھتے ہو تو تسلیم کر لیا اور میرے ساتھ انصاف سے کام لیا تو یہ تمہاری خوش قسمتی ہوگی۔ اور تمہیں معلوم ہو گا کہ تمہارے لیے میری مخالفت کی کوئی وجہ ہو ہی نہیں سکتی اور اگر تم نے میرے بیان کو قبول نہ کیا اور انصاف سے کام نہ لیا تو شوق سے مجتمع کر لو اپنی طاقتوں کو اور اکٹھا کر لو جس جس کو چاہو اپنے ہم خیالوں میں سے اور کوئی کوشش اٹھانے نہ رکھو۔ پھر پوری طاقت سے بغیر ایک دم کی بھی نہلت ڈیٹے ہوئے میرا خاتمہ کر دو۔ میرے لیے وہ پروردگار کافی ہے جس نے قرآن کو نازل کیا اور وہی اپنے نیک عمل بندوں کا مددگار ہے۔"

راوی کہتا ہے کہ حضرت جبین کے یہ ارشادات جب (خمیوں میں) ان کی بہنوں اور بیٹیوں نے سنے تو وہ چیخیں چلائیں اور روئیں اور ان کی آواز بلند ہو کر باہر پہنچی تو آپ نے اپنے بھائی عباس اور اپنے بیٹے علی کو بھیجا کہ "جاؤ انھیں چپ کراؤ، کس قدر یہ لوگ رو رہی ہیں۔" پھر جب وہ چپ ہو گئیں تب آپ نے از سر نو حمد و ثنا سے تقریر شروع کی اور فرمایا:-

"ذرا تم میرے نام و نسب پر غور کرو اور دیکھو تو میں کون ہوں۔ پھر اپنے گریبانوں میں منہ ڈالو اور غور کرو کہ کیا تمہارے لیے میرے خون کا بہانا اور میری جنتِ حرمت کرنا جائز ہے؟ کیا میں تمہارے نبی کا نواسہ نہیں ہوں، اور اُنکے

وصی اور اوران کے چچا زاد بھائی اور ان پر سب سے پہلے ایمان لانے والے اور انکی تصدیق کرنے والے کافر زند نہیں ہوں؟ کیا عمرہ سید الشہداء میرے باپ کے چچا اور حفصہ طیار خود میرے چچا نہیں تھے، کیا حدیث جو زبان زد خلائق ہے تمہارے کانوں تک نہیں پہنچی کہ حضرت رسول خدا نے میرے اور میرے بھائی کے بارے میں فرمایا تھا کہ ”یہ دونوں جو انان اہل جنت کے سردار ہیں؟“ اگر تم میری بات کو سچ سمجھتے ہو اور حقیقتہً وہ سچ ہی ہے (اس لیے کہ میں نے جب سے یہ جانا کہ اللہ جھوٹ بولنے والے سے ناراض ہوتا ہے اور خود اس کا جھوٹ بھی اسے نقصان دیتا ہے تب سے میں نے کبھی جھوٹ کا ارادہ نہیں کیا) پھر تو کوئی بات نہیں اور اگر تم میری بات کو غلط سمجھو تو اسلامی دنیا میں ابھی ایسے اشخاص ہیں جن سے اگر تم پوچھو تو بتلا دیں گے۔ پوچھو لو جابر بن عبد اللہ سے، ابو سعید خدری سے، سہل بن سعد ساعدی سے، زید بن ارقم سے، انس بن مالک سے وہ تمہیں بتلائیں گے کہ انہوں نے رسالت ماب سے اپنے کانوں سے اس حدیث کو سنا ہے، پھر کیا یہ تمہیں میری خونریزی سے روکنے کیلئے کافی نہیں ہے؟“

راوی کہتا ہے کہ ”اس موقع پر شمر آپ کا قطع کلام کرتے ہوئے بولا کہ ”میں خدا کی تابعداری کنارے پر کھڑے ہو کر کرنے والوں میں سے (یعنی منافقوں میں سے) ہوں، اگر ذرا بھی سمجھا ہوں کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔“ حبیب بن مظاہر، یکے از فقہاء حنین نے جواب میں کہا کہ واللہ میں تو سمجھتا ہوں کہ تو اللہ کی تابعداری ایک کنارے پر نہیں، شتر کناروں پر کھڑے ہو کر کرتا ہے (یعنی برے درجے کا منافق ہے) اور میں گواہی دیتا ہوں کہ تو سچ کہہ رہا ہے کہ تیری سمجھ میں حضرت کی بات ذرا بھی نہیں آرہی۔ کیونکہ اللہ نے تیرے دل پر مہر لگا دی ہے۔“ اس کے بعد حضرت حنین نے سلسلہ تقریر دو بارہ جاری کرتے ہوئے فرمایا:-

”اگر تمہیں اس حدیث کی صحت میں پھر بھی شک ہے تو کیا اس میں بھی شک ہے

سہ ماہی کے جواب علم روا تو ملے، درایت غور کرنے عادی ہیں انھیں شاید یہ ماننے سے اختلاف ہو کر بے گھڑی ہوئی روایت ہے۔

کہ میں تمہارے رسول کا نواسہ ہوں، اور خدا کی قسم مشرق سے مغرب تک کوئی بھی رسول خدا کا نواسہ میرے سوا موجود نہیں ہے، نہ تم میں اور نہ تمہارے سوا کسی دوسری قوم میں۔ بس میں ہی ایک تمہارے نبی کا نواسہ ہوں۔ ذرا بتاؤ تو سہی کہ تم کیوں میرے درپے ہو؟ کیا کسی مقتول کا بدلہ لینے کو جس کو میں نے قتل کیا ہے؟ یا کسی مال کے سلسلے میں جس کو میں نے تلف کر دیا ہے؟ یا کسی کو زخم لگایا ہے جس کا قصاص مطلوب ہے؟

راوی کہتا ہے کہ ”کوئی جواب کسی طرف سے نہیں ملا“ تو آپ نے نام لے لے کر ان میں سے بعض کو مخاطب کیا:-

”اے شہت بن ربیع، اے حجار بن ابجر، اے قیس بن اشعث، اے یزید بن حارث کیا تم نے مجھے نہیں لکھا تھا کہ ”باغات میں بہا رہے، کھیتیاں سرسبز ہیں، چشے ابل رہے ہیں، اور مسلع لشکر آپ کی پذیرائی کو چشم براہ ہیں۔ پس قدم رجبہ فرمائیے؟ ان لوگوں نے جواب دیا کہ نہیں، ہم نے تمہیں کوئی خط نہیں لکھا یہ سن کر ارشاد ہوا۔ التذکر، اتنا بڑا جھوٹ! قسم ہے خدا کی تم نے لکھا تھا۔“ اس کے بعد آپ نے فرمایا:-

”اے لوگو، اگر تمہیں میرا آنا پسند ہے تو مجھے چھوڑ دو کہ روئے زمین پر جاؤ کہیں اپنے لیے امن و امان کی جا سمجھوں چلا جاؤں۔ اس پر قیس بن اشعث نے کہا کہ آپ اپنے نبی عم کا حکم کیوں نہیں مان لیتے؟ آپ کو کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوگی۔ جو آپ چاہیں گے وہی آپ کے ساتھ ہوگا۔ حضرت نے فرمایا: تم اپنے بھائی۔ محمد بن اشعث۔ کے بھائی ہی تو ہو۔ کیا تمہاری خواہش ہے کہ نبوہاشتم تم پر مسلم بن عقیل کے علاوہ کسی دوسرے خون کا بھی دعویٰ لے لے؟“

مسلم بن عقیل کے واقعہ میں گزر چکا ہے کہ ان کی گرفتاری محمد بن اشعث کے ذریعہ ہوئی تھی۔

کریں۔ نہیں خدا کی قسم میں ذلت کے ساتھ اپنا ہاتھ تھارے ہاتھ میں نہیں
 دوں گا۔ اور نہ غلاموں جیسے اقرار تھارے آگے کروں گا۔ اے لوگو! میں تمہارے
 رب کی اور اپنے رب کی پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ تم مجھ کو سنگسار
 کرو، اور میں پناہ مانگتا ہوں ہر تکبر سے جسے یوم حساب پر ایمان نہیں۔“
 راوی کہتا ہے کہ ”اس کے بعد آپ نے اونٹنی کو بٹھایا، اترے اور عقبہ بن سمرعان
 (خادم) کو حکم دیا کہ اسے باندھ آئے اور اب دشمن آپ کی طرف بڑھنے لگا۔“
 حضرت حسینؑ کی یہ مصیبت تفریر اس سوال پر غور کرنے کے لیے من و عن نقل کی گئی ہے
 کہ جب امیر لشکر عمر بن سعد کو اتنے سخت احکام ہوں جیسے کہ اوپر پٹری کی زوائدوں سے نقل کیے
 گئے۔ دود و آدمی ان روایتوں کے مطابق، ان تاکیدی احکامات کے ساتھ بھیجے گئے ہوں
 کہ اگر عمر بن سعد حسین کو ڈھیل دینے اور معاملے کو طول دینے کی روش سے باز نہ آئے تو اس کی
 گردن کاٹ کر ہمارے پاس بھیج دی جائے اور معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا جائے، کیا
 اس سب کے باوجود (اور مزید اس کے باوجود کہ ایک شب کی جو آخری ہفت حضرت حسین کو
 کوہِ کربلا کی شام کو دی گئی تھی وہ بھی ختم ہو گئی اور ان کی طرف سے تسلیمِ خم کرنے کی بات سامنے
 نہیں آئی) یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ اگر صحیح کو عمر بن سعد اپنا لشکر لے کر خیام
 حسینی پر آئے تو بجائے اس کے کہ فوراً کوفے کے احکام کی تعمیل شروع کرے وہ حضرت
 حسینؑ کو موقع دیتا ہے کہ اس کے ہاتھوں میں اپنے ایک طویل خطاب کے ذریعہ کوفے
 اور دمشق کی حکومت کے خلافتِ جذبات پیدا کرنے کی پھر پور کو شمشیں کلریں، حقیقتاً یہ
 قابلِ تصویر بات بھی نہیں ہے، چہ جائیکہ بطور واقعہ پیش آئی ہو، ہاں کوئی حضرت حسینؑ
 کے لیے معجزہ کی قدرت کا قائل ہو تو اسکے لیے شاید یہ بات قابلِ تصور ہو سکتی ہو۔

لہ طبری ج ۶ ص ۲۴۲-۲۴۳ حضرت کی تفریر کے آغاز سے یہاں تک اقتباسات کے ترجمے میں اپنی سہولت
 کی خاطر ہم نے قبلہ علی نقی صاحب کے ترجمے سے فائدہ اٹھایا ہے لیکن کلینتہ انحصار نہیں کیا گیا۔

معاملہ کا ایک اور پہلو

اس سوال سے قطع نظر جس کی بنیاد تقریر کے ماحول اور موقع پر رکھی گئی ہے اور اسی موقع و محل کے پیش نظر ہم مجبور ہوئے ہیں کہ اس تقریر کی واقعیت میں کلام کریں، اس سے قطع نظر تقریر میں داخلی شہادتیں بھی اس بات کی صاف نظر آ رہی ہیں کہ یہ واقعہ نہیں کچھ لوگوں کی تخیلی قوت کا کرشمہ ہے۔ عہد نامہ جدید کی انجیل مرقس جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تختہ دار پر چڑھا ہوا دکھاتی ہے وہ آپ کی زبان مبارک سے یہ کلمہ شکایت و جزع و فزع کہلاتی ہے کہ:-

الوہی الوہی لما سبقتنی لہ
اے میرے اللہ! میرے اللہ تو نے

مجھے کیوں چھوڑ دیا ہے؟

اسلامی ذہن کی رو سے یہ کیسا بڑا داغ ہے جو اللہ کے ایک جلیل القدر پیغمبر کے دامن صبر و رضا پر لگایا گیا ہے۔ مگر حضرت حسین کی طوت مذکورہ بالا تقریر منسوب کرنے والوں نے اس کو کہیں زیادہ بڑا داغ نوا سزا رسول کے دامن عزت و شرف کو لگایا ہے۔ اہل انجیل نے پیغمبر کو بہر حال صرف خدا ہی کے سامنے رُلایا اور اس سے شکوہ کرایا ہے۔ مگر ان لوگوں نے پتہ نہیں یہ کس سطح کے لوگ تھے؟ حضرت حسین کو ان غدار کوفیوں اور ابن زیاد کے کاسہ لیسوں کے سامنے ہر ہر رخ سے اور ہر رنگ میں جان کی امان مانگتے دکھایا ہے جنکی طرف رخ کرنے کی اجازت بھی غیرت کے قانون میں نظر نہیں آتی۔ اور یہ تو عام قانون غیرت کی بات ہے یہاں تو معاملہ رجاء رسول کی غیرت کا اور ہاشمی خون کی غیرت کا ہے۔

وہ مرتبہ ناشناس اور زمانہ ساز جنھوں نے کل آپ کے بڑے بھائی حضرت جن مجتبیٰ کو سبج دینے اور سوا کرنے میں کوئی کسر اٹھانے رکھی اور جو آج چند ٹکوں یا چھوٹے بڑے مرتبوں کی خاطر آپ کا خون بہانے کو... لشکر اعداد میں شامل ہو گئے تھے جس میں شمر جیسے زباں دراز بھی تھے جس نے ابھی ابھی آپ کے خیموں کے گرد آگ کے لاؤ دیکھ کر

پکارا تھا:-

يا حسين استعجلت النار
فی الدنیا قبل یوم القیامة۔
او حسین یہ آگ کی ایسی جلدی کہ قیامت سے
پہلے دنیا ہی میں اس کا بندوبست کر لیا؟

ان بے ادبوں اور مسخ فطرتوں کے سامنے آپ واسطہ دینے اٹھے اپنی نبی عظمتوں کا! نواسرہ
رسول ہونے کا! ابن فاطمہ بنت الرسول ہونے کا! ابن علی نقیؑ و صبی رسول ہونے کا! حضرت
حمزہ سید الشہداء سے اپنی قرابت کا اور جعفر طیارؑ سے رشتے کا! کیا واقعی یہ باتیں کسی ایسے
آدمی کے لیے قابل تصور ہیں جو سچ مچ حضرت حسینؑ کا کچھ مرتبہ سمجھنے کے قابل ہو؟ اور یوں بھی
یہ واسطہ دینا تو کسی بھی حالت میں حضرت حسین جیسے مرتبہ کے انسان کے لیے موزوں بات
نہیں ہو سکتی۔ بہت کم شعور اور کم سطح کے لوگ ایسے واسطوں کا استعمال کرتے ہیں۔
آگے آئیے۔ تقریر کے اس حصے پر وہی شمر ایک بار پھر زبان درازی کا وہ مظاہرہ کرتا
ہے جو اوپر گزر چکا اور خالص بولہبی لہجے میں کہتا ہے ع۔

سمجھ میں کچھ نہیں آیا یہ تم نے کیا سنایا تھا

مگر افسوس کہ یہ خطاب حسینی کے مصنف اس کے بعد حضرت والاکئی زبان سے کہلواتے ہیں کہ
چلو تمہیں میرے اور میرے بھائی کے بارے میں جو انان جنت کی سرداری والی حدیث کی
صحت کا یقین نہیں تو کیا یہ بھی تمہارے لیے ممکن ہے کہ میرے نواسرہ رسول ہونے میں شک
ظاہر کرو؟ کیا مشرق و مغرب میں ایک میرے سوا کوئی اور ہے جسے نواسرہ رسول ہونے کا
دعویٰ ہو؟ گل روئے زمین پر میں تنہا ہوں جو اس شرف کے ساتھ مشرف ہو۔ بتاؤ اس
کے باوجود تم کیسے میرے خون کے پیاسے ہو؟

اور ابھی بس کہاں؟ وہ شہد بن ربیع، وہ حجار بن ابجر، وہ قیس بن اشعث اور زید بن
حارث جن کے دستخطی خط حضرت والاکئی تحویل میں موجود تھے جن میں بڑے اشتیاق
سے کوفہ میں و تدمر رنجہ فرمانے کی دعوت دی گئی تھی۔ یہ

چاروں اپنی بے غیرتیوں کے ساتھ صفتِ اعداء میں اپنے اپنے قبیلوں کی کمائیں سنبھالے کھڑے تھے۔ حضرت حسین کو ان بے غیرتوں سے بھی تو نام بنام مخاطب ہو کر ان کے خطوط یاد دلاتے دکھایا گیا ہے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔ پتہ نہیں یہ کون لوگ تھے جنھوں نے اس طرح دانستہ یا نادانستہ سبطِ رسولؐ کی رسوائی کا سامان کیا ہے؟

اور ہاں وہ عواتین خالوادہ نبوتِ حق کے ذکر کے ساتھ ساتھ صبر و ضبط اور عزیمت و خودداری کی صفات تصور میں آتی ہیں۔ وہ نقشِ فاطمی ذہن میں اُبھرنا ہے جو میدانِ اُحد میں قائم ہوا تھا کہ سیدۃ فاطمہ کسی آہ و بکا کے بجائے اپنے والد ماجد اور ہمارے آقائے نامدار کی مرہم پٹی کا حوصلہ دکھا رہی اور دوسروں کا حوصلہ بڑھا رہی ہیں۔ اور پھر عائشہ صدیقہ کا وہ نقشِ کر زخموں کو دھونے اور زخمیوں کو پانی پلانے کے لیے مشک اٹھانے دوڑ رہی ہیں۔ ان صفات کی جگہ پر ہمیں یہ کر بلا میں ”خطابِ حسینی“ کا قصہ سنانے والے سنا تے ہیں کہ ابھی تلوار چلی نہیں، کوئی معرکہ ہوا نہیں، کوئی خون نہیں، کوئی زخم نہیں، فقط ایک جملہ حضرت حسین کی زبان سے ابتدائے تقریر میں نکلا کہ ”اگر تم نہیں مانتے تو پھر ایک دم کی بھی ہنالت دیئے بغیر پوری طاقت سے اٹھو اور میرا حاتمہ کر دو“ بس اتنا سنا تھا کہ خالوادہ نبوت کے خیمے ماتم کدے بن گئے اور آہ و بکا کا وہ شور برپا ہوا کہ حضرت کو تقریر روک دینا پڑی۔

حقیقت کم از کم راقم کے نزدیک، یہ ہے کہ پوری تقریر اور اس کے درمیانی قصے گویا لکھے ہی اسی نقطہ نظر سے گئے ہیں کہ واقعہ کر بلا کے نام پر ایک ماتمی نصیحا سید کرنے میں مدد مل سکے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ واقعیت سے ان کا دور دور بھی کوئی تعلق ہی نہیں نہ ہو سکتا ہے۔ واقعیت اگر ہے تو اُس دعا میں ضرور نظر آتی ہے جو تقریر والی روایت سے متصلاً پہلے کی روایت میں طبری نے دی ہے۔ روایت یہ ہے کہ جب (۱۰ری) صبح کو دشمن کا لشکر آ پہنچا تو

۱۔ طبری ج ۶ ص ۱۹۷ پر ان لوگوں کے خط اور ناموں کا ذکر ہے، وہ نام چار سے زیادہ ہیں البتہ تیس بن اشعث کا نام ان میں نہیں ہے۔ ۲۔ طبری ج ۶ ص ۲۳۱-۲۳۲

حسینؑ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور (لوں بارگاہِ احدی میں) عرض کیا ہوا ہے:-
 ”خداوند! تو ہی میرا سہارا ہے ہر تکلیف میں، میرا قبلا، امید ہے ہر کلفت میں،
 اور تجھ ہی پر ہر ہم میں جو مجھے درپیش ہو، میرا بھروسہ ہے۔ کتنے ہی حالات
 ایسے ہیں جن کے مقابلے میں دل کمزور پڑ جاتا ہے اور تدبیر کی راہیں بند نظر آتی
 ہیں، دوست ان میں ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور دشمن طعنہ زنی کرنے لگتے ہیں، میں
 ان حالات کو تیرے حضور پیش کرتا اور تیری بارگاہ میں فریاد کیا کرتا ہوں، اسیلے
 کہ تجھے چھوڑ کر کسی اور سے لو لگانا میں جانتا نہیں۔ پس تو حالات کی تکلیف
 اور ان کی ناسازگاری کو دور کرتا اور راہ نکالتا ہے۔ یقیناً تو ہی ہر نعمت کا
 مالک، ہر بھلائی کا سرچشمہ اور ہر امید کا مرکز ہے۔“

یہ دعا اگر معیارِ روایت کے اعتبار سے کوئی کمزوری نہیں رکھتی تو اس کی واقعیت
 تسلیم کرنے میں ذرا بھی اشکال نہیں، کیونکہ یہی تفسیر کے برعکس موقع و محل کا عین تقاضہ
 ہے اور حضرت حسین سے پورے طور پر متوقع اور ان کے شایانِ شان ہے۔

زہیر بن قین کی تقریر

دو تقریریں جو اوپر درج ہو گئیں، ایک محمد بن زید کی اور ایک خود حضرت حسینؑ کی، ان
 میں سے کسی ایک کے لیے بھی اس ماحول اور صورتِ حال میں جو کر بلا کے سلسلے کی زوا
 بتاتی آرہی تھیں کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ مگر جیسا کہ عرض کیا گیا یہاں تو ایسی تقریروں
 کا ایک لمبا سلسلہ ہے۔ لگتا ہے کہ معرکہ کارزار نہیں۔ میلہ عکاظ تھا۔ طوالت ہوئی جاتی
 ہے، مگر ایک تقریر اور سن لیجئے۔ یہ زہیر بن قین نام کے ایک ساتھی ہیں۔ اور ان کی بھی
 کچھ ایسی اہمیت ہے جیسی محمد بن زید کی۔ ایک ایسا شخص اس تقریر کا راوی بتایا گیا ہے
 جو ابن زیاد کی فوج میں شامل تھا، نہ کہ حضرت حسینؑ کے ساتھیوں میں۔ یہ کہتا ہے کہ

(حضرت حسین تقریر کے بعد بیچھے ہٹے اور) ہم آگے بڑھے تو زُبَیْر بن قَیْن نکل کر آئے۔ گھوڑے پر سوار اور اسلحہ سے لیس تھے، انھوں نے ہمیں مخاطب کر کے کہا:

”کونے والو، خیردار، خدا کے عذاب سے خبردار، ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان بھائی کا حق ہے کہ اس کی خیر خواہی کرے۔ ہم لوگ اس وقت بھائی بھائی ہیں، ایک دین اور ایک ملت پر ہیں، جب تک ہمارے درمیان تلوار نہیں چلنے لگتی، ہاں اگر تلوار چل گئی تو پھر یہ رشتہ خود بخود کٹ جائے گا اور تم الگ اور ہم الگ ملت ہو جائیں گے۔ دیکھو ہمیں تمہیں اللہ نے ذریت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ آزمایا ہے تاکہ دیکھے کہ ہم تم کیا کرتے ہیں۔ سو ہم تمہیں دعوت دیتے ہیں کہ ان کی مدد کرو اور سرکش عبید اللہ بن زیاد کا ساتھ چھوڑ دو۔ اس لیے کہ تمہیں ان کی حکومت سے سوائے دکھ اور رنج کے اور کچھ نہ ملے گا جو تمہاری آنکھوں میں سلاٹیاں پھرواتے، تمہارے ہاتھ پاؤں قطع کر اتے تم کو سولیاں دلو اتے اور تمہارے نیک اعمال قراء اور عبادت مستلاً حُجْر بن عدی اور ان کے اصحاب ابوبانی بن عروہ وغیرہ کو قتل کر اتے رہے۔“

راوی کہتا ہے کہ اسپر ہماری طرف والوں نے زُبَیْر کو بُرا بھلا کہا اور عبید اللہ بن زیاد کی تعریفیں کیں اور کہا کہ ہم تمہیں اور تمہارے صاحب (حضرت حسین) اور ان کے سب ساتھ والوں کو اس کے بغیر نہیں چھوڑیں گے کہ یا قتل کریں اور یا گرفتار کر کے عبید اللہ بن زیاد کے پاس روانہ کریں۔ اس پر زُبَیْر بن قَیْن پھر عرض پر داز ہوئے کہ:-

”اے اللہ کے بندو و ناطقہ رضوان اللہ علیہا کی اولاد سبیت کی اولاد کے مقابلے میں تمہاری محبت اور مدد کی زیادہ حمت مار ہے۔ اور اگر تم مدد نہیں کر سکتے تو میں تمہارے لیے اس بات سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ تم ان کو قتل کرو، تم اس شخص (حسین) کے اور اس کے چچا زاد یرید بن معاویہ کے درمیان سے

ہٹ جاؤ۔ قسم میری جان کی۔ یزید کے لیے تمہاری اطاعت کو قتل حسین کی مہر در
نہیں ہے۔ وہ اس کے بغیر بھی تمہاری اطاعت پر راضی رہے گا۔

ایک خاص نکتہ

ماحول صورت حال اور موقع و محل کے اس نکتے کے علاوہ جس کی بنیاد پر ہمارے لیے
یہ ماننا مشکل ہو رہا ہے کہ فی الواقع یہ تقریریں میدان کر بلا میں ہوئی تھیں۔ زُہیر بن قین کی
تقریر کے بارے میں خاص طور سے یہ نکتہ بھی توجہ طلب ہے کہ اس میں جو کچھ لعنت و ملامت
کو فیول کو ہے اور جو کچھ آپس اور فہمائش کے جملے ہیں ان سب کی بنیاد بس یہ ہے کہ
حضرت حسین اور ان کے اہل خانہ اولاد فاطمہ رضی اللہ عنہا اور ذریت محمد صلی اللہ علیہ وسلم
ہیں۔ حالانکہ ان صاحب کے تعارف میں کہا گیا ہے کہ یہ اہل میں عثمانی گروہ کے تھے اور
اس لیے اتفاق سے جو حج سے واپسی میں حضرت حسین کے قافلے کا ساتھ ہو گیا تو منازل پر
فاصلے سے اپنا خیمہ لگاتے اور حضرت حسین کے سائے سے بھی بچنا چاہتے تھے۔ مگر
حضرت حسین کے اس سفر کے حالات میں آتا ہے کہ وہ راستے کے تقریباً ہر اہم آدمی ہی
کو باخضوص جس کا کون سے سے تعلق تھا، اپنے ساتھ ملانا چاہتے تھے چنانچہ آپ نے ایک دفعہ
ان کو بلاوا بھیجا تو ان کی بیوی نے شرم دلا کر کہ "بہر حال ابن بنت رسول اللہ ہیں، آپ کو انکی
دعوت پر جانا چاہیے، ان کو خیمہ حسینی میں جلنے پر مجبور ہی کر دیا اور پھر وہ آپ کی طرف سے
آپ کی ہم میں رفاقت کی دعوت بھی رد نہ کر سکے اور جان و دل سے ساتھ ہو گئے۔ بہر حال
ایک عثمانی الاصل آدمی بھی صرف اسی "ذریت محمد" اور "ابن بنت رسول اللہ" کے حوالے

۱۔ طبری ج ۶ ص ۲۴۳ - ۲۴۴ پر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کو منزل بہ منزل ساتھ چلنے کی ضرورت
کیا تھی جو یہاں ساتھ ہو کر بھی دور رہنے کا اہتمام کرنا پڑتا تھا۔ یہ اس فاصلے کو کم از کم ایک دو
منزل کا فاصلہ بھی تو بنا سکتے تھے!

سے زیدی کو فیوں کو لعنت و ملامت یا ان سے اسپیل کرے یہ کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ شک یہ بھی ایک نہایت مناسب عنوان اور حوالہ تھا۔ مگر اسی پر انحصار اور صرف اسی حوالے سے حضرت حسین اور ان کے اہل خانہ کی عظمت اور ان کا حق پہنچانا، ابن زیاد کے مقابلے میں ان کے لیے صرف اسی حوالہ کو وجہ ترجیح بنانا یہ تو شیعیت کا مزاج ہے اور اس لیے جس طرح حضرت حسین کی تقریر میں علاوہ حالات اور ماحول والے نکتے کے بعض اور پہلو بھی اس تقریر کو غیر واقعی اور جعلی قرار دینے والے اور اسی کے ساتھ اس جملہ سازی کی بنا بھی سامنے لانے والے ہیں۔ اسی طرح زہیر بن قین کی تقریر کا یہ پہلو بھی اس کی غیر واقعیت کو ظاہر کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس جعلی کاروائی کے پیچھے کام کرنے والے اس نقطہ نظر کو بھی صاف سامنے لے آتا ہے کہ اس طرح کی تقریریں اگر حضرت حسین کی موجودگی میں عثمانی الاصل لوگوں کی زبان سے ادا کر دی جائیں تو شیعہ تصورات اور طرز فکر کو ایک اچھی اساس اور بنیاد ملتی ہے۔

سبھی کچھ تصنیف

جس طرح یہ تقریریں بول رہی ہیں کہ میدان کربلا میں ہونی نہیں بلکہ بعد میں تصنیف کی گئی ہیں اسی طرح۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا تھا۔ یوم عاشور کی تقریباً پوری کہانی کا یہی حال نظر آتا ہے۔ مثلاً:-

(۱) مبارزہ جنگ کے قصے

تقریروں کا سلسلہ ختم ہوتا ہے تو مبارزہ طلبی شروع ہو جاتی ہے، اور عمر بن سعد جو

۱۔ مجھے اس امکان سے انکار نہیں ہے کہ محرک نقطہ نظر اسکے علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔ ۲۔ ایک صفحہ ایک سورما نکل کر پکارتا ہے کہ کوئی اسکے مقابلے کو آئے اس طرح دونوں صفوں سے ایک ایک دنی نکل کر لڑتا ہے ۳۔ مقابلے کو دیکھتا رہتا۔

ابن زیاد کی ساری تنبیہات کے خلاف ان حضرات کو تقریریں کر کے اس کے اپنے کیمپ میں بغاوت کی آگ بھڑکانے اور بے یقینی اور بے دلی پھیلانے کا پہلے ہی کافی موقع دے چکا تھا۔ تقریروں کے بعد حضرت بن زید کے حملہ آور ہونے اور دو آدمی بھی اپنی صف کے اس کے ہاتھوں مارے جانے کے باوجود ابن زیاد کے انتہائی سخت احکام کی تعمیل میں بھڑپور لیجا کر کے قہر ختم کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ بلکہ صفِ حسینی سے جو مبارزانہ جنگ کا سلسلہ اب شروع ہوتا ہے، جو غیر معمولی قلتِ تعداد کی بنا پر اس صف کے لیے مناسب ترین اور پسندیدہ ترین صورتِ جنگ ہو سکتی تھی، تو وہ اس میں بھی ان کی معاونت شروع کر دیتا ہے۔ اور شمر جو اپنی آمد کے بعد سے برابر اپنی موجودگی کا اظہار طرح طرح سے کر رہا ہے۔ ابن سعد کی اس بے عملی کے معاملے میں وہ ذرا بھی باعمل نظر نہیں آتا۔ حالانکہ وہ بھی باصاف اسی لیے گیا ہے کہ ابن سعد کی سست روی اور بے عملی کا سلسلہ روک دے پس ہے یہ سمجھ میں آنے والی کوئی بات کہ وہاں جنگ مبارزانہ ہونی ہوگی؟

(ب) صبح سے سہ پہر تک کے معرکے

ابن زیاد کے سخت احکام کی اور شمر جیسے "حسین دشمن" کو تعمیلِ احکام کے لیے مسلط کیے جانے کی روایتیں جس طرح اس بات کو باور کرنے کی اجازت نہیں دیتیں اگر بلا میں مبارزانہ جنگ کا سلسلہ چلا ہوگا۔ یہی روایتیں اور لشکر ابن سعد کی تعداد والی روایتیں (کہ کم سے کم ۴-۵ ہزار) ورنہ شیعہ ماخذ کے مطابق کم سے کم تیس چالیس ہزار) اس بات کا تصور مشکل بناتی کہ اس لشکر نے قافلہ حسینی کو کوئی باقاعدہ جنگ کرنیکا موقع دیا ہوگا۔ کیس اور معاملہ کسی جنگ کا تھا ہی نہیں، یہ فقط مزاحمت کا اور مزاحمت کو توڑنے کا کیس تھا۔ ابن سعد کی اس لٹے شمر کا نام صفین کی معرکہ آرائی میں بھی ملتا ہے اور بہت واضح طور پر تو نہیں، لیکن بظاہر وہ حضرت علی کی صف کا آدمی نظر آتا ہے۔ اگر فی الواقع ایسا ہی ہے تو اس کی یہ دشمنی بھی عجیب ہے۔

نفسیاتی کیفیت کو دیکھتے ہوئے جس کی گواہی قصے کی تمام روایتیں دے رہی ہیں کہ ایک طرف ابن زیاد کی فرمانبرداری بھی منظور تھی دوسری طرف حضرت حسین کی سلامتی بھی عزیز (اس کیفیت میں اور کم از کم بیست پچیس گنا زیادہ نفی کے ساتھ) واقعہ کربلا کی اسکے سوا کوئی اور صورت از روئے عقل و عادت نہیں ہونی چاہیے تھی کہ ابن سعد کی طرف سے ان لوگوں کو گھیر کر اور بے قابو کر کے زیادہ سے زیادہ تعداد میں سلامتی کے ساتھ گرفتار کر لینے کی کوشش ہوتی اور ادھر سے مزاحمت۔ یہ مزاحمت طاقتور ہوتی، اور بظاہر طاقتور ہونی ہی چاہیے تھی، تو ابن سعد کی کوشش ناکام ہوتی، اور زیادہ سے زیادہ تعداد اپنی عزت پر قربان ہو جاتی۔ لیکن اس میں صبح سے سہ پہر تک کا وقت لگ جاتا اور باقاعدہ ”لشکڑوں“ کے درمیان جنگ کی صورت بنتی، جیسا کہ روایتیں کہتی ہیں اور مجالس عزاد میں دہرایا جاتا ہے، یہ کوئی سمجھ میں آنے والی بات ہرگز نہیں۔ بظاہر یہ بیان واقعہ کے بجائے واقعہ کی اسی طرح کی ایک مبالغہ آمیز اور انتہا پسندانہ تعبیر ہے جس طرح کی دوسری انتہا پسندانہ تعبیر اس کے مقابل ایک روایت میں یوں پائی جاتی ہے کہ ابن زیاد نے جس شخص زخربن قیس کو حضرت حسین کا سر لے کر زید کے پاس بھیجا۔ اس نے زید کے پاس پہنچ کر کہا کہ:-

”البتیریا امیر المؤمنین بفتح	امیر المؤمنین مرثدہ ہو، اللہ کی طرف سے
اللہ ونصرہ ودرء علینا الحسین	فتح و نصرت کا! حسین بن علی اپنے
بن علی فی ثمانیۃ عشر من	اٹھارہ گھروالوں اور ساٹھ شیعوں
اہل بیتہ وستین من	کے ساتھ آئے تھے۔ (اس خبر پر)
شیعتہ فسرنا الیہم فسالناہم	ہم لوگ ان کی طرف چلے اور ہم نے
ان یستسلموا ینزلوا علی حکم	مطالبہ کیا کہ اپنے آپ کو ہمارے سپرد
الامیر عبید اللہ بن زیاد	کر کے امیر عبید اللہ بن زیاد کے فیصلے
والقتال، فاخذوا القتال	پر چھوڑ دیں ورنہ قتال کے لیے تیار

علی الاستسلام فعدونا علیہم
 مع شروق الشمس فأحطنا بہم
 من کل ناحية حتی اذا احت
 السیوف فأخذنا من ہام
 القوم یہربون الی غیر ذر و
 یلوزون منابا الا کام والمحفر
 لو اذاکما لا الذحمائم من
 صقر فواللہ یا امیر المؤمنین
 ما کان الاجزر جزوہا و
 لومة قائل حتی اتینا
 علی اخرہم لہ

ہوں۔ ان لوگوں نے قتال پسند کیا۔
 نتیجہ میں ہم لوگوں نے سوج نکلے ہی
 ان پر چڑھائی کی اور ہر طرف سے گھیر لیا
 حتیٰ کہ جب تلواروں نے ان کی کھوپڑیوں
 پر کام شروع کیا تو جدھر منہ اٹھا بھاگ
 پڑے ہمیں ٹیلوں کی کہیں گڑھوں کی
 پناہ ڈھونڈنے لگے جیسے کہ کبوتر شکرے
 کے سامنے کیا کرتے ہیں۔ پس اے
 امیر المؤمنین قسم ہے خدا کی ہمیں انکا
 خاتمہ کرنے میں اس سے زیادہ وقت
 نہیں لگا جتنا ایک قصاب کو ایک
 اونٹ ذبح کرنے میں یا دو پہر کو کسی
 شخص کے قیلو لہ کرنے میں لگتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جس طرح یہ روایت بجد بمانے پر مبنی ہے یہی حال صبح سے سہ پہر تک کی
 روایتوں کا سمجھنا صحیح ہے۔

لمبے وقت کے دامن میں لپٹے قصے

لمبا وقت لگنے کی روایتیں جب ناقابل اعتبار اور ناقابل قبول ٹھہر جاتی ہیں تو پھر
 اس لمبے وقت کے دامن پر جو اور بہت سی کہانیاں ٹانگ دی گئی تھیں وہ بھی کسی اعتبار کے
 لائق کہاں رہ جاتی ہیں؟ انھیں کہانیوں میں فرزند ان اہلبیت کی لاشوں کا ایک کے بعد

لہ طبری ج ۶ ص ۲۶۵

ایک کر کے تڑپنا، حضرت حسین کا ان کے پاس دوڑ دوڑ کے جانا، رنج و الم کے کلمات سے انھیں آفرت کے لیے رخصت کرنا، یا ایک طرف کولا کے لٹانا۔ حضرت زینب کبریٰ کا روتے روتے بار بار میدان جنگ میں نکل آنا۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ ساری کہانیاں جن میں سے کتنی ہی ایسی ہیں جو دراصل حضرت حسین کی شان کج جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے، داغ لگاتی ہیں، صحت معلوم ہوتا ہے کہ اُس سبائی ذہن کے ماتحت گڑھی گئی ہیں جو برابر فرزند ان اسلام کی "متاع دین و دانش" لوٹ لینے کی جدوجہد میں لگا ہوا تھا اور اسے نواسٹہ رسول کی مظلومیت کے نام پر ایک ہوشربا قسم کی جذباتی فضا پیدا کر دینے میں اپنے اس منصوبے کی تکمیل کا بہترین سامان نظر آیا، اور اور اپنے اس حربے اور مقصد میں وہ خوب خوب کامیاب رہا۔ اسلام کے ناواقف اور ضعیف العقیدہ فرزندوں کی ایک بڑی تعداد اس حربے کا شکار ہو کر اسلام کی شاہراہ ریا (MAIN STREAM) سے ہٹ گئی اور بالکل ایک اجنبی راہ پر اسلام ہی کے بلکہ اصل اسلام کے نام سے لگ گئی۔ آج جو لوگ اس مذہب ماتم حسین کے پیرو ہیں یقین ہے کہ وہ اپنے دلوں سے اسلام دوست ہیں۔ اس مذہب کے اصل بانیوں کی طرح چھپے شمن نہیں بلکہ صیاد کے اقبال، "کا بھی کیا" سحر ہے کہ ان کے "صید" کی یہ موجودہ نسل بھی (جو ہماری ہم عصر ہے) اپنی قید کی جان و دل سے حفاظت کرنا چاہتی ہے۔ اور اسی مذہب والوں کا کیا، ہر شخص جس مذہب کے ماحول میں پیدا ہو گیا ہے، بے سوچے سمجھے بلکہ سوچ سمجھ کی دعوت سے (اللا ماشاء اللہ) شمنی کرتے ہوئے اسی مذہب پر صیاد اور مرنے چاہتا ہے۔

۱۔ عبداللہ بن سبا وغیرہ۔ ۲۔ شکاری ۳۔ شکار۔

۴۔ طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا اپنی منقاروں سے حلقہ کس ہے جس جال کا۔

دامانِ اہلبیت کے لیے سنگ

بہر حال آئیے یوم عاشورہ کی وہ کہانیاں دیکھیں جن سے دراصل حضرت حسین کی شان اور عظمت کو دھبہ لگتا ہے۔ دھبہ لگانے کو تو وہ قبل از جنگ کی تقریر ہی بہت کافی ہے جو اوپر نقل ہو چکی۔ علی رضی اللہ عنہ کا بیٹا اور ان بے جیا، خدار اور پست کردار لوگوں سے جن کا از خود کیا ہوا احسان بھی اہل شرف و عزت کے یہاں قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ اپنے والد ماجد کے نام پر اپنی والدہ خاتونِ جنت کے نام پر، اپنے نانا سید الانبیاء کے نام پر، اپنے چچا جعفر طیار کے نام پر اور اپنے نانا کے چچا سید الشہداء حضرت حمزہ کے نام پر اپنی جان کی امان مانگے؟ (جیسا کہ وہ تقریر دکھاتی ہے) اور ایک بار نہیں، عنوان بدل بدل کر بار بار مانگے؟ العیاذ باللہ!

اس تقریر میں سنگ و حار کا یہ پہلو ہرگز کوئی ایسا لکتہ نہیں ہے کہ کوئی آکے اُسے کھولے تو لوگوں پر کھلے۔ بالکل کھلی ہوئی اور عام آدمی کو محسوس ہونے والی بات ہے مگر اس حد تک عام آدمی کہاں جاسکتا ہے کہ روایت میں کلام کرے۔ اس پہلو کا معاملہ تو وہ حضرت حسین پر چھوڑ دے گا کہ ہوگی کوئی مصلحت، البتہ بیات اس کے دل میں نقش ہو جائے گی کہ حضرت حسین اپنی اصل عظمت یہ سمجھتے تھے کہ وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نواسے، فاطمہ بنت رسول اللہ اور علی رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں اور وہی وہ دوسرے مسلمانوں سے چاہتے تھے کہ انہیں اس نسبی عظمت سے دیکھا جائے اور اسی کے مطابق ان کے ساتھ معاملہ کیا جائے۔ اصل اہمیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کے نسبی رشتے کی ہو، دینی رشتے پر نظر ہو یا نہ ہو (حالانکہ اسلام میں اصل اہمیت تقویٰ اور تدبیر کی ہے نہ کہ نسل و نسب کی) یہ بات اگر مسلمانوں کے ذہن نشین ہوگی اور عزت و احترام کے ساتھ قبول کر لی گئی تو سبائی منہ بچے کی کامیابی کیلئے پوری بنیاد فراہم ہو گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں عبداللہ بن سب کا بنیادی کردار ایک مانا ہوا کردار تھا لیکن (بغیر جائزہ شدہ پر)

صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت اور وراثت کو ایک نسبی سلسلہ بنا دینے اور نسب ہی میں ساری عظمتیں جمع کر دینے کا کام اس کے بعد کچھ مشکل نہیں رہ گیا۔ بس یہ فلسفہ ہے جو اس سراپا ننگ و عار تقریر کے پیچھے کام کرتا نظر آ رہا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

یہی بیماری جو اس تقریر کے ذریعے مسلمانوں کے ذہن میں پیوست کرنے کی کوشش کی گئی تھی اسی کو آگے کی ان کہانیوں سے خوب خوب گہرائی میں اتارنے کی سعی کی گئی ہے کہ آپ اپنے فرزندوں، بھتیجوں، بھانجوں اور بھائیوں کی لاشوں کی طرف دوڑتے ہوئے جاتے اور اس طرح کے کلمات سے اپنے رنج و الم اور بے بسی کا اظہار کرتے۔

بَعْدَ الْقَوْمِ قَتْلُكَ وَ مَنْ
خَصَمَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْكَ حَبْلًا
ہلاک ہوں وہ لوگ جنہوں نے تجھے قتل
کیا اور جن کے مقابلے میں قیامت کے
دن تیرے مانا فریق ہوں۔

اسی طرح کسی رفیق کربلا کی جانبازی اور مردانہ کارکردگی پر اُسے شاباش دیتے ہیں تو ان روایتوں کے مطابق بایں الفاظ دیتے ہیں :-

جزاك الله خيرا عن
اهل بيتك
اللہ تمہیں اپنے نبی کے اہل بیت کی
طرف سے بہترین بدلہ دے۔

بہر حال یہ تو ایک ضمنی بات کی مثالیں آگئیں۔ اصل منشاء یہاں حضرت حسین کی تقریر کے علاوہ ان مزید کہانیوں کی کچھ نشاندہی ہے جن سے واقعہ میں حضرت موصوت کی شان پر یا آپ کے دیگر اہل بیت کی شان پر دھبہ آتا ہے، مگر دھوم سے مشہور کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ڈاکٹر اصحابین ہماری نے جب سے تحقیق پیش کی ہے کہ کوئی حقیقی نہیں بلکہ راویوں کی بنائی ہوئی شخصیت ہے تب سے شیوخ اہل قلم ابن سبکی شخصیت کا انکار کرنے لگے ہیں مگر اصحابین کی تحقیقات کا حال تو یہ ہے کہ انہوں نے حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام کے وجود کا بھی انکار کر دیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ایک دوسرے مصری محقق الوداعی کی مجموعہ مضامین "تضایا معاصرہ" اس سے طلحہ حسین کے یہودی راویوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ لہ طبری ج ۶ ص ۲۵۵ یہ کلمات جس موقع سے نقل کیے جا رہے ہیں وہ آپ کے بھتیجے قاسم بن حسن کی شہادت کا موقع ہے۔ لہ ایضاً ص ۲۵۵۔

گئی ہیں اور ہر سال تازہ کی جاتی ہیں۔

سب سے بڑی مثال

اس کی سب سے بڑی مثال وہ روایتیں ہیں جو دکھاتی ہیں کہ حضرت حسین دوسرے رفقاء و انصار ہی کو نہیں اپنے خاندان کے ایک ایک فرد کو بھی، حتیٰ کہ نابالغ بچوں کو بھی، اپنے اوپر قربان ہونے کی اجازت دیتے رہے اور جب سوکے ایک بیمار صاحب منراش صاحبزادے، علی بن حسین (زین العابدین) کے اور کوئی نہ بچا تب آپ نے تلوار اٹھائی۔ اول تو اپنے بچوں ہی کو آدمی، اگر مجبور معذور نہیں ہے تو ہلاکت کے لیے آگے نہیں بڑھاتا یا کم از کم اکیلا نہیں چھوڑتا۔ اور یہاں روایتیں ہمیں باور کر رہی ہیں کہ نہ صرف صاحبزادے علی اکبر دسمبر ۱۹-۲۰ سال کو اکیلا آگے بڑھنے دیا اور پھر دکھتی آنکھوں اکیلا ہی آخر دم تک لڑنے بھی دیا، بلکہ بھتیجیوں اور بھانجیوں اور بھائیوں کے ساتھ بھی ان کی کم عمری کے باوجود یہی معاملہ رکھا! کوئی بتائے کہ کیسے یقین کیا جائے؟ اور یقین کیا جائے تو پھر کیسے حضرت والا کے لیے عقیدت کو ایک شدید احساس کی چیمبن سے بچایا جائے؟

ایک تاویل لاطائل

بات خدا لگتی ہے، چنانچہ جو لوگ ان روایتوں کے قائل ہیں وہ بھی اس سوال سے انہیں نہ چڑا سکے۔ مگر تاویل کی راہ کہیں بھی بند نہیں ہوتی۔ چنانچہ جناب علی نقی صاحب کی کتاب "شہیدانسانیت" جس کا ہم پہلے تذکرہ کر چکے ہیں۔ اس میں بھی یہ سوال

لے یا بھی قاسم بن الحسن کا جو نام گزرا ہے۔ ان کے بارے میں "شہیدانسانیت" میں تصریح ہے کہ بالغ نہیں ہوئے تھے (منہ) اور شہادت کا جو واقعہ طبری میں ہے اس میں بھی کچھ عمر کی علامتیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً زخم کھارہ ہائے چچا، یکا زنا وغیرہ۔

سامنے لایا گیا ہے اور خطابت و ذہانت کی پوری صلاحیتیں صرف کر کے اس کا حل یوں
پیش کیا گیا ہے کہ:-

”حسین کے لیے نسبتاً یہ بہت آسان ہوتا کہ سب سے پہلے آپ اپنی جان کا ہمدیہ
راہِ حق میں پیش کر دیتے۔ اس صورت میں آپ کی قربانی اپنی جان کی قربانی ہوتی
اور اس کو کسی ایسے شہید کی قربانی سے بڑا درجہ نہ دیا جاسکتا جس نے کبھی بھی
حمایتِ حق میں اپنی قربانی پیش کی ہو۔“

اس صورت میں آپ کی قربانی اس سے زیادہ وسیع نہیں سمجھی جاسکتی تھی
جنہی کہ بقول نصاریٰ حضرت عیسیٰ کی قربانی، کہ آپ دینِ حق کی تبلیغ کی وجہ سے
سولی پر چڑھا دیئے گئے۔ یا سقراط کی قربانی کہ ان کو اصول کی حمایت میں زہر
کا جام پینا پڑا۔ اور حسین کے لیے اس منزل سے گزر جانا مشکل ہی کیا ہوتا جب
کہ آپ اسی باپ کے بیٹے تھے جس کا قول یہ تھا کہ مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ
موت مجھ پر آ پڑتی ہے یا موت پر میں جا پڑتا ہوں اور نیز یہ کہ موت سے اس
سے زیادہ مانوس ہوں جتنا کہ بچہ پستانِ مادر سے مانوس ہوتا ہے..... مگر
حسین کی شہادت کو جو خاص امتیاز حاصل ہے وہ اسی لیے کہ آپ نے ایسے
ہر ہر فرد کو جو آپ کی ذات سے دور یا قریب کا تعلق رکھتے تھے، اپنی موجودگی
میں راہِ حق میں نثار کر دیا..... حسین کا کمال عملِ محض ہی نہیں تھا کہ وقت
اور موقع آنے پر آپ نے اپنی جان راہِ خدا میں پیش کر دی بلکہ آپ کے نفس کا
کمال یہ تھا کہ آپ نے جان سے عزیز ہستیاں رضائے حق کے راستے میں
یکے بعد دیگرے قربان کر دیں۔ اور جب تک صبر و تحمل کے ساتھ ان تمام

لے اگرچہ ان میں ایسے کم عمر بھی تھے، جیسے کم عروں کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد میں شریک
ہو کر راہِ خدا میں بھی اپنی جان قربان کرنے کی اجازت نہیں دی؟

الم کے کلمات ادا فرمانا نہیں آتا۔ حضرت زینب سرکھوئے، سینہ پٹی اور پچھاڑیں کھاتی ہوئی نہیں آتیں، لاش سے لپٹ کے بین کرتی نہیں پائی جاتیں۔ حضرت حسین پیاس کی شدت سے فرات کی طرف گھوڑا دوڑاتے ہوئے اور عین اس حالت میں کہ پانی حلق سے اتارنے جا رہے ہیں، گلے میں دشمن کا تیر کھاتے ہوئے اور پھران کے لیے یوں بدعا کرتے نہیں دکھائی دیتے کہ:-

”اے اللہ! ان کو گن لے اور پھر انھیں جہنم کے مار اور ایک کو بھی باقی نہ رکھ۔“
 اور پھر بعد میں زخموں سے چور دشمن کے زرخے میں گھرے ہوئے اُن سے یوں مخاطب ہوتے ہوئے بھی نہیں ملتے، جس سے ایک عاجزی اور بیچارگی کی تصویر بنتی ہے کہ:-
 ”کیا تم میرے قتل پر ایک دوسرے کو اکساتے ہو؟ یاد رکھو کہ میرے بعد کوئی ایسا بندہ نہیں ہے جس کے قتل سے اللہ اتنا ناراض ہو جتنا میرے قتل سے ہگا.....
 اور اگر تم نے مجھے قتل کر ہی دیا (اور نہ مانے) تو اللہ تم پر آپس کی لڑائی اور خونریزی کا عذاب مسلط فرمائے گا اور پھر اس عذاب دینا پر بس نہ کرتے ہوئے (آخرت کے) عذاب الیم کا اس پر اضافہ فرمائے گا۔“
 اور پھر حضرت زینب یہ کہتی ہوئی نہیں نکل آتیں کہ:-

یا عمر بن سعد ابقتل ابو اے عمر بن سعد کیا ابو عبد اللہ (حسین)

۱۔ طبری ج ۶ ۲۵۸ ۲۔ طبری ج ۶ من ۲۶ اس عبارت میں علاوہ اس بات کے کہ اور سب کو کٹو اور حضرت حسین اپنی جان بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ عبارت کے زیر خط الفاظ بھی توجہ طلب ہیں قرآن کے اسلام میں ایک نبی اور رسول کے علاوہ کوئی شخص مجاز نہیں کہ ایسا گمان اپنے بارے میں رکھے فَلَا تُرْكُوا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ اتَّقَىٰ۔ اپنی پاکیزگی (بزرگی) کے دعوے نہ کرو اللہ بہتر جانتا ہے کون متقی ہے (انجم آیت ۳۱) کیسے انا جاننا لکتا ہے کہ حضرت حسین قرآن پاک کی اس تعلیم سے نا آشنا تھے اور معاذ اللہ وہ باتیں زبان پر لا رہے تھے جو اہل تقویٰ کی شان نہیں۔

عبداللہ وانت تنظر الیہ علیہ نقل ہوں گے اور تم پھر رہے ہو گے؟
چنانچہ اُس سادہ روایت کا ذکر، باوجود حضرت محمد الباقتر کی روایت ہونی کے، شکل ہی سے کہیں ملیگا۔

قصہ مختصر

اختصار کی کوشش کے باوجود قصہ طویل ہو گیا۔ مختصر یہ ہے کہ معرکہ کربلا کی لمبی چوڑی کہانیاں، علاوہ اس کے کہ موقع و محل کے حالات ان کے وقوع کے لیے گنجائش نہیں دکھاتے اور علاوہ اس کے کہ ان قصوں کی سندیں نہایت بے وقعت ہیں، یہ قصے متعدد پہلوؤں سے خانوادہ نبوت پر داغ بنتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی مثال کے ذکر سے ہم نے اوپر بات شروع کی تھی، اور اس کے ضمن میں باقی وہ تمام باتیں بھی آگئی تھیں جن کو الگ الگ ذکر کرنے کا ارادہ تھا۔ یعنی حضرت حسین کا اپنے آپ کو اپنی زبان سے مقدس اور اور مقبول بارگاہِ حقیتا جس کی کوئی گنجائش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں نہیں ہے۔ اپنے دشمنوں کو بد دعائیں دینا، جو ان کے نانا کی سنت نہیں اور مردوں کا میدانِ جنگ میں شیوہ نہیں۔ سیدہ زینب بنت خاتونِ جنت کا بین و بکا کرتے ہوئے بار بار میدانِ جنگ میں آنا اور لاشوں سے لپٹ کے رونا چلانا۔ پھر حسین کے لیے عمر بن سعد سے رحم کی اپیل کرنا۔ بھلا یہ باتیں کہیں خانوادہ نبوت کی خواتین کو زیب دیتی ہیں اور خاتون بھی علی رضی جیسے شیر مرد کی بیٹی۔ یہ روایتیں اگر قابل اعتبار ہو سکتی ہیں تو صرف ان لوگوں کے لیے جنہیں خانوادہ نبوت کی محبت کے نام پر ان کی منظومیت کے ماتم کی دوکان کھولنی ہے خواہ منظومیت کی اس داستان کو رنگین کرنے کے لیے ان تمام چیزوں کا اپنے ہی ہاتھوں سے خون کرنا پڑے جو اس خانوادے کا اور کسی بھی خانوادے کا شرف اور اس کی عزت ہوں۔

والے افسانے کی حقیقت بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔

محلے کے کچھ اور پہلو!

کربلا جیسی لب دریا سرزمین پر اس بات کو ممکن سمجھ لینا کہ وہاں ڈیڑھ دو سو ایسے مسلح انسانوں پر جن میں تیس تیس سوار بھی تھے، مسلسل تین دن تک پانی کی مکمل بندش کی جاسکتی تھی، یہ بات عقل و خرد سے مکمل رخصت لیے بغیر ممکن نہیں۔ ہاں اگر یہ بات کہی جائے کہ پانی کا گھاٹ۔ یعنی اس جگہ کا جو قریبی گھاٹ تھا وہ۔ روکا گیا تھا۔ تاکہ حسینی قافلہ بسہولت پانی نہ لے سکے تو یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ پانی کے گھاٹ سے ہٹ کر پورے دریا پر روک ممکن نہیں ہو سکتی اور واقعہ یہ ہے کہ روایت میں گھاٹ روکنے ہی کا ذکر ہے جس کے الفاظ آگے آرہے ہیں۔

لیکن اس میں بھی، تاریخ سے شروعات کی جو بات کہی جاتی ہے، اور وہ بندش آب والی روایت میں آئی ہے، وہ بھی ایسی ہی ناقابل فہم ہے جیسی مکمل بندش والی بات۔ اسکے برضات جو بات واقعاتی لحاظ سے قابل فہم ہے وہ یہ ہے کہ تاریخ کو جب دشمن نے قطعی اقدام کا فیصلہ کر لیا تو اپنی جلد از جلد کامیابی کے لیے جہاں دوسرے ذرائع اور ہتھیار استعمال کیے وہاں ایک تدبیر یہ بھی اختیار کی جو جنگ میں عام طور پر کی جاتی ہے کہ فریق مخالف کے لیے پانی کا حصول مشکل بنا دیا جائے۔ اس سے قدرتی طور پر مخالف فریق کی قوت مدافعت گھٹتی ہے۔ پس اگر یہ دعویٰ کیا جائے یا یوں کہیے کہ روایت میں اس طرح کی بات کہی گئی ہو، تو یہ ایک قابل فہم بات ہے اور اس پر کسی کو کلام کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوگی۔ نیز واقعے کے تمام پہلوؤں کی روایات کے چوکھٹے میں اس کا فٹ ہونا بھی دقت طلب نہ ہوگا۔ جبکہ اس کے برعکس، تاریخ والی روایت بعض دوسری روایتوں کے ساتھ جوڑ نہیں کھا سکتی بلکہ ایک تضاد کا درجے ہوئے نظر آئیگی۔ ایسے اس پہلو سے روایت کا جائزہ لیجئے۔

ہم نے اگرچہ تفصیل اور ترتیب کے ساتھ وہ روایات اس کتاب میں جمع نہیں کی ہیں جن میں ابن سعد اور حضرت حسین کے درمیان نامہ و پیام اور ملاقاتوں کا بیان ہے۔ اور پھر اس کے نتیجے میں ابن سعد اور ابن زیاد کے درمیان ہونے والی خط و کتابت کا بیان آتا ہے تاہم کچھ نہ کچھ ذکر ان سب چیزوں کا اسی باب کے اوپر کے صفحات میں آچکا ہے اور یوں بھی یہ باتیں واقعہ کر بلا کے سلسلے میں بہت مشہور و معروف ہیں۔ اس لیے قارئین اس بات سے بے خبر نہیں ہو سکتے کہ جس وقت سے ابن سعد نے کربلا میں قدم رکھا اسی وقت سے اُس کے اور حضرت حسین کے درمیان نامہ و پیام اور پھر ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور پھر اس کا نتیجہ ابن سعد اور ابن زیاد کے درمیان خط و کتابت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جس کا حاصل یہ تھا کہ ابن سعد حضرت حسین کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرے؟ اس سلسلہ میں کئی ایک روایات ہیں جن کا مجموعی تاثر یہ بنتا ہے کہ طرفین کی یہ سلسلہ جنبانی بالکل آخر وقت تک قائم رہی۔ اور دو روایتیں تو صراحت کے ساتھ بتاتی ہیں کہ ۹ تاریخ کی شام کو یہ سلسلہ بند ہوا۔ ان دونوں روایتوں کا ذکر اوپر اسی باب میں آچکا ہے۔ طبری جزو ۶ میں ان میں سے ایک روایت ۲۲۲ پر سعد بن عبدہ کے حوالے سے ہے۔ دوسری ۲۳۶ پر عبد اللہ بن شریک عامری کے حوالے سے۔

معاملات کے اس پس منظر میں ذرا غور کر کے دیکھنا چاہیے کہ ۹ تاریخ سے بندش آب کا نہ صرف حکم بلکہ اس کا نفاذ بھی بتانے والی روایت کو ماننے کی گنجائش کہاں سے نکل سکتی ہے؟ اور وہ بات الگ رہی جو اس گفتگو کے شروع میں عرض کی گئی ہے کہ قتل و قتال کی حالت میں تو ۱۰ تاریخ کو ہوا، بندش آب کی کارروائی کچھ باہم مفصل اور باہمی ہو سکتی تھی۔ بغیر قتل و قتال کی حالت کے یہ ایک فہنول سی محض بدنامی مول لینے والی بات تھی۔ مزید برآں کیا یہ ممکن ہے کہ ۹ تاریخ سے ایسا ہوا ہو اور ۱۰ تاریخ سے پہلے کہیں کسی طرح بھی اس کی شکایت کی کوئی روایت نہ پائی جائے؟ تمام شکایتی بیانات ۱۰ تاریخ ہی کے ذیل میں

آتے ہیں۔ اس سے پہلے کا کوئی بیان نہیں ملتا حالانکہ دونوں فریقوں میں برابر رابطہ چل رہا تھا!

روایت کی اندرونی شہادت

روایت میں اس بات کی صراحت تو ہے ہی، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، کہ بندش آب کی صورت صرف یہ تھی کہ گھاٹ روکا گیا تھا۔

”..... پس عمر بن سعد نے عروین التجاج کو پانچ سو سواروں کا دستہ دے کر بھیجا اور وہ گھاٹ پر جا اترے اور حسین اور ان کے ساتھیوں اور پانی کے بیچ میں حائل ہو گئے.....“

اس کے علاوہ اس بات کی بھی علامت روایت کے اندر پائی جاتی ہے کہ یہ کاروائی اترالخ ہی کو عمل میں آئی جو جنگ کا دن تھا، کیونکہ روایت میں اگرچہ مذکورہ بالا الفاظ کے بعد ”وذاک قبل قتل الحسين بثلاث“ (اور یہ شہادت حسین سے تین دن پہلے کی بات ہے) کے الفاظ آتے ہیں مگر پھر فوراً اترالخ ہی کا قصہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس سے پہلے کی کوئی بات نہیں۔

قال ونازلہ عبد اللہ بن	حمید کہتا ہے کہ عبد اللہ بن ابی اسحق بن
ابی الحصین الازدی وعد اداۃ	ازدی جس کا شمار بجلید میں ہوتا تھا،
فی بجلیدۃ فقال یا حسین الا	حضرت حسین کے مقابلہ پر آیا اور کہا کہ
تنظر الی الماء کانت کبد السماء	حسین تم پانی کو دیکھ رہے ہو کیسا آسمان
واللہ لاتذوق منہ قطرة	کی طرح شفاف ہے قیوم خدا کی تم اس
حتی تموت عطشاً	سب ایک قطرہ بھی نہ چکھ سکو گے حتیٰ کہ

۱۔ روایت کے اصل الفاظ میں ”فنزولہ علی الشریعة“ (طبری ج ۶ ص ۲۳۳) ”شریعة“ کے معنی گھاٹ یا گھاٹ کا راستہ۔
 ۲۔ یعنی سرکاری رجسٹر میں اس کا نام قبیلہ بجلید کے تحت درج تھا۔ ۳۔ حوالہ سابق۔

پیاس سے (معاذ اللہ) دم نکل جائے۔
 سچ بات یہ ہے کہ بالکل سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں یہ بے تکلف طور پر شہادت تین
 دن پہلے کے الفاظ روایت میں درج کیے گئے ہیں۔ حضرت حسینؑ کسی کا مقابلہ اتاریخ
 سے پہلے کہیں مروی نہیں اور پانی کی کوئی شکایت بھی ۱۰ تاریخ سے پہلے کہیں بیان
 نہیں کی گئی۔

اور خود راوی کے اوصاف !

اس روایت پر غور و فکر کے سلسلے میں اس کے راوی حمید بن مسلم کے کردار پر بھی نظر
 ضروری ہے۔ واقعہ کربلا کے سلسلے میں اس کی روایات بے شمار ہیں جن میں اس بات کے
 نہایت واضح قرائن ہیں کہ اس کی روایتیں ہی جعلی اور حسانہ ساز نہیں بلکہ یہ خود بھی شاید
 ایک جعلی شخصیت ہے۔ ورنہ ایک نہایت موقع پرست اور کوفیل کے امتیازی (TYPICAL)
 اوصاف کا مجسمہ ہے۔ ویسے تو یہ اپنے آپ کو ابن سعد کی فوج میں شامل بتاتا ہے۔ اور
 جب تک واقعہ شہادت ہو نہیں جاتا یہ اپنا کوئی ذرا سا بھی ہمدردانہ کردار اہل بیت کے
 ساتھ نہیں دکھاتا مگر جیسے ہی یہ واقعہ ہولیتا ہے نہ صرف اس سے بڑھ کر اہل بیت کا کوئی
 ہمدرد کربلا کے میدان میں نظر نہیں آتا بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ صفت اعداء کا نہیں صفت حسینی
 کا آدمی تھا۔ جنگ کے وقت میں حضرت حسین نے دشمنوں کی جارحیت اور سفاکی پر جو جو عمل
 اللہ سے دعایا بددعا کی صورت میں یا اظہار رنج و الم کی صورت میں ظاہر فرمایا اس کا ایک
 ایک لفظ آپ اس شخص کی زبان سے سن لیجئے جیسے کوئی ہمزاد ہو۔

ایسا لگتا ہے کہ واقعہ کربلا کے تین چار سال بعد یزید کی موت کے ساتھ ہی جب وقت
 بدلا اور ایک طرف حضرت عبداللہ بن زبیر اور دوسری طرف مختار ثقفی نے ہمدردانہ بنی امیہ
 اور قاتلان حسین کے لیے زمین تنگ کر دی تو بہت سے لوگوں نے عافیت طلبی کے لیے

چولابلا، حمید بن مسلم واقعی اگر اُس زمانے کا کوئی شخص تھا تو یقیناً انہی چولابد نے والوں میں سے ایک تھا۔ اہل بیت کی ہمدردی میں طرح طرح کے غم انگیز افسانے تراشا ہے یہاں تک کہ اس معاملہ میں اپنے آپ کو شمر صبیہ سخت آدمی سے بھی لڑتا ٹھیکڑتا اور اُسے مغلوب کر لیتا ہوا دکھاتا ہے۔ جو کہ روایات کی روشنی میں حادثہ کربلا کا سب سے بڑا ذمہ دار ہے۔ اور جس کی آمد کے بعد ابن سعد کو بھی اس قتل و قتال پر مجبور ہونا پڑا تھا جس کو وہ برابر ٹالنے کی کوشش میں لگا تھا۔ ان افسانوں سے جن میں سے ایک یہ بندش آب والا افسانہ بھی ہے، وہ ایک طرف اپنے آپ کو محبانِ اہل بیت میں شمار کر رہا تھا، دوسری طرف نظر آتا ہے کہ وہ اس موقع سے ذاتی اور خاندانی رنجشیں یا رتا نہیں بھی چکار رہا تھا۔ ورنہ جب یہ خود زیدی لشکر میں تھا تو اس کے لیے کوئی جواز نہ تھا کہ مظالم کی روایتوں میں افراد کو بھی نامزد کرتا جیسا کہ اوپر کے اقتباس میں عبداللہ بن ابی اکھسین کا نام اس نے دیا ہے۔ اس کی روایتوں میں یہی تنہا ایک نامزد رپورٹ نہیں ہے۔ بار بار وہ یہی کام کرتا نظر آتا ہے۔ حضرت حسینؑ کے جد مبارک کو گھوڑوں کی سُم سے روندے جانے والی روایت میں جس پر آگے کلام آئے گا، یہ دس آدمی اس ناپاک کام میں شریک بتاتا ہے مگر صرف دو کا ذکر نام کے ساتھ کرتا ہے۔ اس طرح کا معاملہ اس کی اور روایتوں میں بھی ہے۔ بلکہ اس شخص کے اسی کردار کی بنا پر یہ بھی خیال ہونے لگتا ہے کہ کہیں شمر کی بدنامی میں بھی اُس کی اپنی واقعی بد اعمالیوں کے ساتھ حمید بن مسلم کی "مہربانیوں" کا بھی تو کافی دخل نہیں ہے؟ اس لیے کہ اس کی روایتوں میں شمر کا ذکر بار بار آجاتا ہے اور اس ذکر میں اس کی بُرائیاں الم شرح کرنے سے حمید کی بہت ہی خصوصی دل چسپی کا اظہار ہوتا ہے۔ اگلے باب میں حمید پر اس کی کچھ اور روایتوں کے ماتحت بھی گفتگو آئے گی۔

سہ طبری ج ۶ صفحہ ۲۶ پر اس کی روایت میں دکھایا گیا ہے کہ حضرت علی بن ابی طالبؑ جو قتل و قتال کی زد سے بچ رہے تھے انھیں بعد میں شمر کی زد سے بچانے کا کارنامہ اسی ذروی کا ہے۔

خلاصہ کلام

یوم عاشورہ کے واقعات کی روایتوں کے سلسلے میں جن مختلف پہلوؤں کو اوپر کے صفحات میں اُجاگر کیا گیا ان کے پیش نظر اس بات میں کسی شبہ کی گنجائش نظر نہیں آتی کہ یہ روایتیں بالعموم ناقابل اعتبار بلکہ بیشتر بالبداہت (EVIDENTLY) قابل رد ہیں۔ اس لیے عقل اور نقل، قانون شریعت اور تقاضائے دیانت ہر ایک کے ماتحت ان روایتوں کی فراہم کی ہوئی تفصیلات کو کم از کم ناقابل اعتبار ضرور قرار دیا جا سکتا ہے اور اس سے زیادہ کچھ کہتے کی گنجائش نہیں سمجھی جانی چاہیے جو ایسی روایتوں میں آتا ہے جیسی روایت حضرت محمد الباقر کے حوالے سے اوپر نقل کی گئی ہے۔

”جب حضرت کربلا میں ٹھہرنے پر مجبور ہو گئے (اور کوفیوں کی غداری لشکرِ عمر بن سعد کی شکل میں عملاً سامنے آگئی) تو آپ نے اس نئی صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تین شکلیں ابن سعد کے سامنے رکھیں۔ میں حجاز واپس چلا جاؤں۔ یزید کے پاس چلا جاؤں۔ یا کسی سرحد پر نکل جاؤں (یعنی ملک چھوڑ دوں) ابن سعد نے تجویز پسند کی اور ابن زیاد کے پاس بھیج دی۔ وہاں سے نا منظور ہوئی اور اس کی جگہ یہ حکم آیا کہ وہ کسی اور بات سے پہلے، ابن زیاد کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ (پھر ان کی کسی بات پر غور کیا جائے گا) اس شرط کو حضرت حسین نے قطعی طور سے رد کر دیا۔ نتیجہ میں ابن سعد نے جیسا کہ اس کو حکم تھا، طاقت استعمال کی اور اس میں حضرت حسین کے تمام ساتھی شہید ہوئے۔ ان میں آپ کے گھرانے کے بھی قریباً ۱۵-۲۰ جوان تھے۔ آپ کا ایک چھوٹا بچہ بھی اکٹ

لے یہ احتیاط علمی ذمہ داری ہی کی بنا پر لازم نہیں ہے بلکہ شرعی اور اخلاقی ذمہ داری بھی یہی چاہتی ہے اس لیے کہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کا تعلق دو فریقوں سے ہے اور شرعاً و اخلاقاً کسی فریق کی حمایت یا مخالفت میں کوئی بات مضبوط شہادت کے بغیر جائز نہیں۔

تیرا کر لگنے سے شہید ہوا۔ اس کے بعد آپ نے بھی تلوار اٹھائی اور قتال کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔

روایت حضرت باقر کی خطا؟

واقعہ کربلا کے بیان میں شیعہ نقطہ نظر کو براہ راست جاننے کی غرض سے جو چند کتابیں مجھے دیکھنے کا موقع ملا اس سے ظاہر ہوا کہ حضرت محمد الباقر کی یہ روایت ان حضرات کے یہاں ذکر میں نہیں لائی جاتی۔ حالانکہ سند کے اعتبار سے ان حضرات کے یہاں اُس کی بے حد وقعت ہونی چاہیے تھی۔ ہاں اس کا آخری حصہ جو دربار یزید میں حضرت حسین کا سر لٹکا جانے سے متعلق ہے، جس کا ذکر ہم آگے کریں گے، اس کا تذکرہ یہ حضرات کر دیتے ہیں۔ جب صرف یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس روایت میں یزید کے پاس جانے کی پیشکش بھی پائی جاتی ہے۔ اور یہ پیشکش باوجود ”حسین کی پیشکش“ ہونے کے ایسی ناخوشگوار شنی گردانی گئی ہے کہ یوم عاشورہ کی جن روایتوں کا بڑے مدوق و شوق سے بیان کیا جاتا ہے، ان میں بھی جہاں کہیں اس پیشکش کی بات صراحتہً یا اشارہً آگئی ہے وہاں یا تو روایت کا بیان اسی جگہ ختم کر دیا گیا ہے، یا یہ جزو حذف ہے۔ کئی ایک مثالوں میں سے بس ایک مثال حضرت حسین کے رفیق زہیر بن قین کی اُس تقریر کی لے لیجئے جو اسی باب میں اوپر گزر چکی ہے۔ اس میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں کہ:-

”اے اللہ کے بندو، فاطمہ رضوان اللہ علیہا کی اولاد پر نسبت ابنِ سُمیتہ (ابن زیناب) کے تمھاری محبت اور نصرت کی زیادہ مستحق ہے۔ لیکن اگر تم ان کی مدد نہیں بھی کرتے تو ان کے قتل کے درپے ہونے سے تو باز آؤ اور اس آدمی

لے طبری ج ۶ ص ۲۳۰ لے اور جیسا کہ باب ۱۱ میں گزر چکا ہے محققین اہل سنت کے یہاں تو قصے کی تمام روایتوں میں دو ہی روایتیں سند کے اعتبار سے قوی ہیں اور ان میں سے ایک ہی حضرت محمد الباقر کی روایت ہے۔

(حضرت حسینؑ) کے اور اس کے چچا زاد یزید بن معاویہ کے درمیان سے ہٹ جاؤ۔ میری جان کی قسم یزید کو تم سے راضی کرنے کیلئے اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ تم حسینؑ کو قتل کرو۔

لیکن "شہید انسانیت" کے مصنف اس تقریر کو اس پیشکش سے پہلے والے جملے پر ہی ختم کر گئے ہیں۔ یہ بعد کے جملے ہی ان کے قارئین تک پہنچ جائیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حسینؑ یزید کے پاس جانا چاہتے تھے اس کو انھوں نے پسند نہیں فرمایا۔

اور شیعہ حضرات کو کیا کہیں، خود اہل سنت حضرت حسینؑ سے متعلق شیعہ تصورات سے اس درجہ متاثر ہوئے ہیں کہ ان کے یہاں بھی واقعے کے اس جز کو جو حتمی طور پر ثابت ہے، تاریخی ہی میں رکھنا عام طور پر پسند کیا گیا۔ ۳۴۳ھ تا ۳۵۳ھ کا واقعہ کہلا، نامی راقم کا مضمون جس پر "نظر ثانی" اس کتاب کی شکل اختیار کر گئی جو اب پڑھ رہے ہیں اس مضمون میں راقم نے اس حقیقت سے بے خبری کے عالم میں کہ حضرت حسینؑ نے جو رخی پیش کش کر بلا میں کی تھی جس کا ایک جز یزید کے پاس جانا اور اکثر روایتوں کے مطابق بیعت کے لیے جانا تھا، اس کا یہ جز مکمل تاریخی میں ہے، اس جز کو بھی روشنی دکھانے

۱۔ طبری ج ۶ ص ۲۲۲۶ ۲۔ ملاحظہ ہو ص ۸۱-۲۸۰ ۳۔ حُر بن یزید تمیمی کی تقریر اور اس سے متعلق قصے میں بھی بار بار حضرت حسین کے پیش کردہ شرائط کے الفاظ بار بار ہیں۔ وہ روایت جس میں شمر ابن زیاد کو یہ شرائط قبول کرنے سے روکتا ہے اس کا تقریباً ہر مصنف کے یہاں تذکرہ ہوتا ہے اسی روایت میں وہ شرائط پوری تفصیل سے موجود ہیں مگر ان کی طرف سے تجاہل ترنا جاتا ہے۔ آخری بات یہ ہے کہ اس سلسلہ پر اختلافی بیانات اور راویوں کی روایتیں طبری نے ۲۳۵ پر درج کر دی ہیں ان کا یکجائی مطالعہ بھی صاف طور سے اسی نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ یہاں شرائط والی روایتیں ہی مضبوط ہیں اور خود طبری نے گویا بہت ناثر دیا ہے۔ ۴۔ ان روایتوں کے الفاظ ہیں حتیٰ اصنع یدی فی یدک جس کا لفظی ترجمہ ہے تاکہ میں اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیدوں (کوئی اس جہارت کا ترجمہ بیعت سے نہ بھی کرنا چاہے تو سپردگی سے بھر بھی کرنا ہی ہوگا اور پھر فرق کیا رہا؟ ویسے سردا و سردا دست در دست یزید کو الے مشہور مصرعے کے مطابق تو ان الفاظ کا مطلب بیعت ہی ہوتا ہے)

کی غلطی کر دی اور بس یہ "غلطی" قیامت خیز ہو گئی۔ بہت بہت پڑھے لکھے سنی حضرات جن میں میرے بعض بڑے محترم اور مشفق بھی شامل تھے، ان کے لیے حضرت حسینؑ کی طرف اس بات کی نسبت ناقابل برداشت ہوئی اور معاملہ اس وقت ٹھنڈا ہوا جب الفرقان کی اگلی اشاعت میں تاریخ طبری اور ابن کثیر وغیرہ کے پانچ چھ حوالوں سے اصل عربی عبارتوں میں وہ پیش کش نقل کر دی گئی اور لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ اس پیش کش کی بات کوئی افتراء اور بہتان یا کسی کمزور ذریعے (SOURCE) کی بات نہیں تھی۔

ناقابل انکار حقیقت

بہر حال یہ بات پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ سامنے آجانی چاہیے کہ حضرت حسینؑ نے کربلا میں یہ دیکھ کر کہ حالات کارع اُس خیال اور گمان کے بالکل برعکس ہے جس گمان اور اطمینان کے ساتھ کوفے کی طرف سفر شروع کیا گیا تھا، ابن زیاد کے نائب عمر بن سعد کو وہ پیش کش کی جو حضرت محمد الباقری کی روایت میں بیان ہوئی ہے۔ اور جس کی تائید واقعہ کربلا سے متعلق چند درجہ بعد آیات میں صراحت یا اشارہ پائی جاتی ہے۔ یہ حضرت حسینؑ کے ورود کربلا کے ساتھ جسڑی ہوئی ایسی حقیقت ہے کہ جب تک آپ کے ورود کربلا اور عمر بن سعد کے وہاں آنے سے انکار نہ کر دیا جائے اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا ہے، جسٹس امیر علی جیسے شیعہ مصنفین جن کے یہاں شیعیت تو قدرتی طور سے پائی جاتی ہے۔ مگر علمی خیانت کے نظر ہر قابل نہیں ہیں، انھوں نے بھی واقعہ کربلا کے سلسلے میں نہ صرف اس سے گمانہ پیش کش کی بات پوری صراحت سے درج کی ہے بلکہ ایک روایت (صرف ایک روایت) جو اس کی تردید میں پائی جاتی ہے اس کو رد بھی کر دیا ہے۔ اپنی مشہور کتاب "اسپیراٹ اسلام" (SPIRIT OF ISLAM)

میں واقعہ کربلا کے ذکر میں حضرت حسین کی سہ گانہ پیش کش بیان کر کے موصوفت نے اس پر حاشیہ دیا ہے جو کتاب کے اردو ترجمے میں بایں الفاظ درج ہوا ہے:-

”صاحبِ روضتہ الصغایہ شرائط بیان کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ خدام حسین میں سے ایک شخص نے جو مقتل کربلا سے اتفاقاً بچ نکلا، اس دعوے کو غلط بتایا کہ امام حسین نے اموی سردار کے سامنے کسی قسم کی شرائطِ صلح پیش کیں، ممکن ہے کہ اس خادم نے یہ الکارینہ ظاہر کرنے کی خاطر کیا ہو کہ امام حسین نے صلح کی تجویز کر کے اپنے آپ کو دشمن کے سامنے ذلیل نہیں کیا۔ لیکن میرے نزدیک صلح کی تجویز سے حضرت حسین کی سیر عالیہ کی کسی طرح کسر شان نہیں ہوتی۔“



۱۔ یہاں سے جس ایمر علی کا ترجمہ شروع ہوا ہے۔

۲۔ روح اسلام ترجمہ ”اپرٹ آف اسلام“ از محمد بادی حسین۔ اسلامک بک سینٹر دہلی ۱۹۸۵ء

باب یازدہم

شہادت کے بعد کی کہانی

شہادت تک کے مرحلے میں جس طرح کی بے سروپا کہانیاں اللہ ہی جانتا ہے کہ بنانے والوں نے کن کن مقاصد کے لیے بنائیں اور ہمارے اہل تاریخ نے شائع کیں، ان کہانیوں کا سلسلہ شہادت کے المناک مناظر پیش کرنے پر ختم نہیں ہو گیا۔ جنہیں پیش کرنے کی ہمت ہم اپنے اندر نہیں پاسکے کہ کیوں ایک جھوٹ سے خواہ مخواہ دل زخمی کیا جا، بلکہ ان سے بھی بدتر قسم کے مناظر دکھانے والی کہانیاں ہم اپنی اہنی تاریخ کی کتابوں میں مابعد شہادت کے سلسلے میں پاتے ہیں۔

خواتین کی بے حرمتی

شہادت اور اس کے ذیل کے ولد و زنا مناظر جس روایت کے اندر آتے ہیں اُس کا خاتمہ خواتین اہل بیت کی بے حرمتی پر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ حضرت حسینؑ کا سرتن سے جدا کرنے اور آپ کے جسم کی پوشش پر چڑے، جوتے، ٹوپی کھسوٹ لینے کے بعد یہ لوگ خواتین اور خیمے کے مال و اسباب پر ٹوٹے، حدیہ تھی کہ سروں سے اوڑھنیاں اور چادریں تک کھینچ لی گئیں۔ اس کے بعد کی روایت کہتی ہے کہ اس مرحلے پر عمر بن سعدؓ طبری اور ابن اثیر کا تو ایک ہی حال ہوا البتہ کہیں کہیں بن کثیر نے تھوڑی سی حقیقتا برتی ہے ۲۶ ص ۶۲ طبری ۲۶

پہنچے اور اعلان کیا کہ کوئی شخص ان عورتوں کے خیمے میں نہ جائے اور ان کے سامان کسی نے کچھ لیا ہو تو واپس کرے۔ مگر کسی نے کچھ واپس نہیں کیا۔

لاش کی بے حرمتی

پھر یہی روایت بتاتی ہے عمر بن سعد نے یہ شریفانہ حکم جاری کرنے کے بعد دوسرا اس کے مقابل میں حکم یہ جاری کیا کہ

”ہاں کون ہے جو اپنے گھوڑے کے ذریعے حسینؑ کی لاش کو روندے؟ چنانچہ دشہمت والے نکل کے آئے اور انھوں نے ”یہ کار خیر“ بھر لو پڑھ لیتے سے انجام دیا۔“

سر کی بے حرمتی اور یاقیاتِ قافلہ سے بدلہ کی

اسی روایت کے مطابق آپؐ کا سر فوراً کونے کو روانہ کیا گیا اور دوسرے دن قافلے کی خواتین اور باقی ماندہ بچوں کو ساتھ لے کر عمر بن سعد اور اس کی فوج نے کربلا سے کوچ کیا، آگے کی ایک روایت کے مطابق جس کاروی حمید بن مسلم ہے، حضرت حسینؑ کا سر اور آپ کے اہل بیت جب ابن زیاد کے یہاں پہنچائے گئے تو اس نے سر کی بھی بے حرمتی اپنی چھڑی اور زبان سے کی اور اہل بیت کے زخمی دلوں پر بھی خوب خوب نمک چھڑکا۔ اور پھر اس کے آگے آنے والی روایت کے مطابق حضرت علی بن حسینؑ (حضرت زین العابدین) جو کربلا میں بیمار صاحب فراش ہونے کی وجہ سے ”میدان جنگ“ میں نہ نکل سکے تھے (اور بعد ازاں خود حمید بن مسلم کی ”عنایت“ سے بچ گئے تھے) کو باقیاتِ قافلہ میں دیکھنا ابن زیاد کو اس قدر ناگوار ہوا کہ اس نے اُن کا ستر کھلو کر باغ اور نابالغ ہونے کی چانچ کرائی اور نتیجے میں باغ پا کر قتل کا حکم دیا۔ مگر پھر مختلف روایتوں کے مطابق مختلف وجوہ سے اُن کی

۱۔ طبری ج ۶ ص ۲۶۰ ۲۔ ایضاً ص ۲۶۱ ۳۔ ایضاً ص ۶۳-۶۲

جان بخشی کر دی۔

تنقید کی ایک نظر

پچھلے باب میں ہم نے کہا ہے کہ اس واقعہ کی روایتوں میں روایت اور درایت کے اصولوں کے اعتبار سے اس قدر ناقابل قبول اور ناقابل قیاس باتیں بھری ہوئی ہیں کہ کسی بھی روایت کو خاص کر جس سے کسی پر کوئی الزام آتا ہو قبول کرنا اور مان لینا ایک بڑا مشکل اور بھاری ذمہ داری کا کام ہے؛ کیونکہ شبہ کا فائدہ ملزم کو دیا جانا ہر مذہب قانون کا ضابطہ ہے۔ شریعت اسلامی کا ضابطہ بھی یہی ہے۔ یہ سب روایتیں جن کا اختصار اوپر کے صفحات میں بیان ہوا اسی الزامی نوعیت کی ہیں۔ تاہم جہاں تک ابن زیاد کا سوال ہے اُس کے متعلق یہ ماننا از روئے قیاس کچھ بہت مشکل نظر نہیں آتا کہ حضرت حسینؑ کا سر اس کے سامنے رکھا گیا ہو تو اس نے آپ کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے چھڑی سے آپ کے دانتوں اور سر کو ٹھوکا دیا ہو۔ لیکن آفت رسیدہ خواتین کے ساتھ جس قسم کی نمک پاشی کی باتیں اُس سے منسوب کی گئی ہیں اُن کے لیے جب تک کوئی نہایت مضبوط شہادت ہو تو کوئی جواز یقین کر لینے کا نظر نہیں آتا۔

حضرت حسینؑ کے دانتوں کو چھڑی لگانا یوں بعد از قیاس نہیں ہے کہ ابن زیاد کو بظاہر حضرت حسینؑ کا کوئی ایسا احترام نہیں تھا جیسے احترام کے تغیل سے ہمیں یہ بات بے حد قبیح معلوم ہوتی ہے۔ اُسے اگر کوئی احترام ہوتا تو کربلا کا ساتھ ہی کیوں پیش آتا، لیکن خواتین کی بات بہت مختلف ہے۔ حضرت حسینؑ کے لیے بے احترامی کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ ابن زیاد، جس حکومت کا عہدہ دار ملک شیبانی نمک خوار تھا حضرت حسینؑ اس کو چیلنج کرنے کیلئے نکلے تھے، خواتین بے چاری محض تابع تھیں اور انھوں نے کوئی عمل یزید کی حکومت کو

لے طبری ج ۶ ص ۲۶۳

چیلنج کرنے کا نہیں کیا تھا۔ اس لیے قرین قیاس نہیں ہے کہ وہ خواتین کے ساتھ خاص طور سے اُن کی غمزدگی میں، ایسے طور سے پیش آیا ہو جسے کوئی بھی ماحول پسند نہیں کر سکتا۔ اسی خلافت قیاس بات کا الزام کسی کو دینے کے لیے بہت ٹھوس شہادت چاہیے۔ اور یہاں شہادت کس کی ہے؟ حمید بن مسلم کی۔ ایسا جھوٹا اور لپٹا رادوی جس کے جھوٹ اور افسانہ تراشی کی شہادت خود طبری کے اندر کی اس کی روایتوں میں موجود ہے۔ حتیٰ کہ انہی روایتوں میں درشمول زیر بحث روایت موجود ہے جو اوپر کے صفحات میں پیش کی گئیں۔ آئیے ایک نظر ڈالیے۔

حمید بن مسلم کے تضادات

اس روایت کو (جو کہ زیر بحث ہے) شروع کرتے ہوئے حمید بن مسلم کہتا ہے کہ رباب سے اُسے عمر بن سعد نے اپنے گھر روانہ کیا تاکہ اس کی خیر و عاقبت کی خبر اور "فتح" کی خوشخبری پہنچائے۔ اور یہ کام کر کے وہ ابن زیاد کی طرف گیا تو وہاں دیکھا کہ حسینؑ رکھا ہوا ہے اور قافلہ حسینی کے باقیماندہ افراد بھی پہنچے ہوئے ہیں۔ بس اس کے آگے وہ خواتین اور اہل بیت کے زخموں پر ابن زیاد کی نمک پاشی کا قصہ سنانا ہے۔ جبکہ یہی شخص ایک صفحہ پہلے (ص ۲۶۱) کی روایت میں یہ بیان دے رہا ہے کہ عمر بن سعد نے اس کو اور قلال دوسرے شخص کو حضرت حسین کا سر ابن زیاد کے پاس پہنچانے کے لیے بھیجا۔ یعنی اس کی ایک روایت کے مطابق سر پہنچانے والا یہ خود تھا اور دوسری روایت کے مطابق کسی دوسرے شخص نے یہ کام کیا۔

اے شیعہ حضرات کی کتابوں میں ان خواتین کی طوط جو باعینانہ تقریریں کوفے میں ان کے داخلے کے موقع پر نموسب کی گئی ہیں۔ ذرا سے غور سے بھی آدمی اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ سب تصنیف ہے۔ ورنہ جب وہ انہی لوگوں کے بقول قیدلوں کی طرح لے جائے جا رہی تھیں تو کون انہیں راستے میں کھڑے ہو ہو کر باعینانہ تقریریں کرنے دیتا۔ اے پچھلے باب میں اس کے کردار پر کافی روشنی پڑ چکی ہے۔

بہر حال یہ شخص ایک "حاضر و ناظر" قسم کا راوی ہے، ہر جگہ موجود ملتا ہے۔ اور تضاد قسم کی باتوں پر یقین کی دعوت دیتا ہے۔ اس کی شہادت پر کیسے کسی کو ملزم ٹھہرا جا سکتا ہے؟ افسوس ہوتا ہے کہ آخر طبری نے اس کے ایسے بیانات کیوں نہ کر بلا کسی تنقید اور تبصرے کے جمع کر دیئے ہیں جو خواہ مخواہ تشویش ذہن اور ضیاع وقت کا باعث ہوں!

رہی وہ روایت کہ حضرت زین العابدین کا ستر کھول کر ان کے بلوغ اور عدم بلوغ کا امتحان کیا گیا۔ تو اس مذاق کے لیے کیا کہا جائے! اس راوی کو اتنا بھی پتہ نہ تھا کہ حضرت زین العابدین ۲۲ سال کی عمر کے شادی شدہ اور ایک پتے حضرت محمد الباقر کے باپ تھے۔ اور پتہ بھی قافلے میں موجود تھا۔

لے شیعہ ماخذ میں تو ابن زیاد کے بارے میں اس موقع کی وہ روایتیں ہیں کہ اللہ کی پناہ اور وہ کسی حد تک سنیوں میں بھی پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کی بابت تفصیل میں ہمیں نہیں جانا۔ البتہ ایک روایت کا ذکر یہاں کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ ابن زیاد کے ساتھ بھی ہم کوئی بے انصافی کا معاملہ نہ کریں بلکہ حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ یہ روایت طبری ہی میں ہے اور بتاتی ہے کہ :-

فجئى برأس الحسين الی ابن	پس حسین کا سر ابن زیاد کے پاس لایا گیا اور
زیاد فوضع بین یدیه فجعل	سانے رکھا گیا اسپر وہ اپنی چھڑی سے اتار
یقول بقضیبہ ویقول ان	کرنے اور کہنے لگا کہ اچھا ابو عبد اللہ کے
ابا عبد الله قد کان شمط قال	بال تو کھچڑی ہو گئے تھے اور ان کی بیوی
وجعی ینسأہ وبناتہ واهله	بیٹیاں اور دیگر اہل خانہ بھی لائے گئے
وکان احسن شئى صنعہ ان	ان کے معاملے میں ابن زیاد نے سب سے اچھی
امر لہم بمنزل فی مکان معتزل	بات یہ کی تھی کہ ان کے قیام کے لیے ایک
واجری علیہم رزقا و امرہم	ذرا الگ تھلگ جگہ پر انتظام کیا تھا وہیں
بنفقہ وکسوة قال فانطلق	ان کا کھانا جاتا تھا، اور (بقیہ حیاتہ آئندہ صفحہ پر)

اس کے بعد پیچھے کی طرف چلیے۔ حضرت حسینؑ کے جد خاکی کو گھوڑوں سے روندوانے کی روایت ان روایتوں میں سرفہرست رکھے جانے کی مستحق ہے جن کی وجہ سے روایتوں کا یہ سارا کارخانہ جبل و فریب پر مبنی نظر آتا ہے۔ اس کا راوی بھی وہی سلم بن حمید ہے اسی روایت میں حمید کا وہ بیان بھی آتا ہے جس میں اس نے بتایا ہے کہ مجھے عمر بن سعد نے حضرت حسینؑ کا سر لے کر ابن زیاد کے پاس روانہ کیا تھا، اور آپ ابھی معلوم کر چکے ہیں کہ اسی شخص کی دوسری روایت اس بیان کی تردید کرتی ہے۔ علاوہ ازیں اس روایت میں جھوٹ کی یہ منہ بولتی علامت بھی موجود ہے کہ حضرت حسینؑ کے ساتھیوں میں سے

(بقریۃ شریفہ کذا) دوسری ضروریات اور اخراجات فراہم کرنے کی بھی احکام دیئے تھے، اسی دوران میں ایک واقعہ پیش آیا کہ ان میں سے عبداللہ بن جعفر کے دو بیٹے یا پوتے نکل کر بنو طے کے ایک بڑی کے یہاں پہنچ گئے اور اس پناہ چاہی تو اس (ظالم) نے ان کی گردنیں مار دیں اور سر لے کر ابن زیاد کے پاس آیا۔ راوی کہتا ہے کہ ابن زیاد نے (غصے میں) اس کے قتل کا ارادہ کیا اور (بھرنیصلہ بدل کر) اس کا گھر ڈھا دیا۔
کا حکم دیا اور وہ ڈھا دیا گیا۔

اس روایت میں اور سب باتیں خود سمجھ لینے کی ہیں مگر ایک نقطہ عام قارئین کے اعتبار سے وضاحت طلب ہے کہ اہل عرب کے یہاں کنیت سے کسی کا ذکر یا اس کو خطاب ازراہ تعظیم ہوتا ہے اس روایت کے مطابق ابن زیاد نے حضرت حسینؑ کا ذکر آپ کی کنیت ابو عبد اللہ سے کیا ہے اور چھڑی سے کہیں ٹھوکا نہیں دیا ہے، بلکہ اشارہ کیا ہے جو ابن زیاد کے رویے کو کافی مختلف شکل دینے والی بات ہے اور کم سے کم خواتین کے مسائل کے سلسلہ میں ہم اس روایت کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

شہدا کی تعداد بہتر بتاتا ہے، جو محض ایک شہرت ہے واقعہ نہیں۔ جناب علی نقی صاحب لکھنوی بھی لکھتے ہیں کہ:-

”ایک تاریخی صراحت کے مطابق یہ تین سو اور چالیس پیادوں سے زیادہ نہیں تھے اور اسی لیے شہداء کے کربلا کے لیے بہتر کا لفظ زباں زدِ خلافت ہے مگر کربلا کے حالات جنگ اور مجاہدین کے ناموں کی تفصیل اور دوسرے متعلقہ واقعات سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ یہ تعداد سوسے زیادہ اور دوسوسے کم تھی۔“

اگر یہ شخص (حمید بن مسلم) واقعی کربلا میں موجود ہوتا یا جو روایتیں اس کے نام سے آتی ہیں وہ واقعی کسی بھی ایسے شخص کی ہوتیں جو کربلا میں موجود تھا تو یہ بہتر کی خلافت واقعہ تعداد اس نے نہ بتائی ہوتی۔ اور یہی وہ روایت ہے جو خواتین کے سروں سے چادریں تک کھینچ لینے کا قصہ سناتی ہیں، پس خود ہی سمجھ لینا چاہیے کہ کیس قسم کی روایت ہے اور اس میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں ان کی کیا حیثیت ہے؟

قصر زید میں

بیان میں کہا گیا ہے کہ کوفے سے حضرت حمین کا سر امیر زید کے پاس دمشق بھیجا گیا۔ علی بن اقا نعلہ حسینی کے باقیماندہ افراد خواتین اور بچے بھی وہیں پہنچائے گئے۔ اس بار میں جو روایتیں مشہور ہیں وہ تو یہ ہیں کہ زید نے بھی سر کے ساتھ ٹھوکا دینے کی گستاخی کی اور لقبہ السیف اہل خانہ کے ساتھ بھی رنج پہنچانے والی باتیں کیں۔ بلکہ شیعہ روایات کے مطابق تو اہل خانہ کا قافلہ کوفے سے دمشق تک لایا ہی گیا غیر مسلم قیدیوں کی طرح نہایت ذلت اور تشہیر کے ساتھ تھا۔ اور پھر گھنٹوں محل کے دروازے پر کھڑا رکھا گیا وغیرہ و غیرہ خرافات، جن میں امیوں کے ہاتھوں خاندان نبوت کی وقہ تذلیل دکھا کر جو مسلمانوں نے کبھی غیر مسلموں کے ساتھ بھی روا نہیں رکھی

بلکہ ان اہلیت کی خود اپنے ہاتھوں بھی اپنی تدلیل اور تشہیر (انکی "تقریروں" وغیرہ کی شکل میں) دکھا کر دراصل شیعہ مذہب کے تمام عقائد اور اعمال و رسوم کی سند اور اصل اہلیت ہی سے فراہم کرنے کا وہ فنکارانہ انتظام کیا گیا ہے کہ ایک فن کے اعتبار سے بے اختیار وادینے کا جی چاہتا ہے۔ لیکن جبکہ اہلیت اور اقصیت دلچسپی ہے، اس کے لیے اسی طبری میں، جس میں خود کافی لغویات موجود ہیں، ان تمام خانہ ساز لغویات کی تردید کا سامان بھی موجود ہے۔

وہ ایک روایت جو سوئیں باب میں گذری ہے کہ ابن زیاد نے جو آدمی حضرت حسینؑ کا سر لیکر دمشق بھیجا تھا اور اُس نے کربلا کی یہ کہانی سنائی تھی کہ حسینؑ اور اُن کے ساتھی پہلے سامنے ایسے بھاگے جیسے شکر میں کئے سامنے بگوتے تھے کہ ذرا سی دیر میں اُنکا کام کر دیا گیا۔ اس میں آگے مزید یہ الفاظ بھی تھے "پس اب وہاں اُن کے جسم ہیں بے لباس کچڑے ہیں خون آلو، چہرے خاک آلود..." وہی روایت اس کے بعد بتاتی ہے:

فدمعت عین یزید و قال قد کنت	یہ سکر یزید کی آنکھیں بھرا میں اور کہا اے یہ
ارضی بطاعتکم بدون قتل	کیا کیا میں تو قتل حسینؑ کے بغیر بھی تم سے راضی
الحسین لعن اللہ ابن سُمیہ اما	رہنا اللہ ان سُمیہ کو عارت کرے بھلائے پاک
واللہ لو انی صاحبہ فحفوت عنہ	میں گرا سکی جبکہ ہوتا حسینؑ سے درگزر ہی
فرحم اللہ الحسین ولم یصلہ	کر تا۔ اللہ حسینؑ پر رحمت کرے اہل پھر
بشئ	اُس دن کو کوئی انعام دیا (جس کا وہ توقع تھا)

اس کے بعد راوی مزید بیان اس بارے میں دیتا ہے کہ ابن زیاد نے حضرت حسینؑ کے اہل خانہ کو بھی دو آدمیوں کی تحویل میں امیر یزید کے پاس ارسال کیا تھا۔ ان دو میں سے ایک کا نام محض بن ثعلبہ تھا۔ اس محض نے محل کے دروازے پر آ کر آواز لگائی:

هَذَا مُحَضَّرٌ مِنْ ثَعْلَبَةَ اتَى

یہ محض بن ثعلبہ ہے جو ایسوں

لہ ابن سیمہ تو ابن زیاد کے باپ زیاد کو کہا جاتا ہے، واللہ اعلم، یہاں ابن زیاد کے لیے کیونکر استعمال ہوا۔

ایسول، کو (معاذ اللہ) لے کر آیا ہے۔

باللثام الفجرۃ۔

یزید نے اس کے جواب میں کہا کہ:-

مُحْفَزُ كِي مَالِ نَعِ اس سے زیادہ بُرا اور

مَا وِلْدَتِ اُمُّ مَحْفَزٍ شَرًّا وَاَلَامُ

اس سے زیادہ لئیم نہیں بنا۔

(مت ۱۱)

ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ روایت ضرور صحیح ہے لیکن یہ ضرور کہا جائے گا کہ اس روایت کی موجودگی ان روایتوں کو مشکوک ضرور بنا دیتی ہے جن میں یزید کے اس رویے کے برعکس روایت دکھایا گیا ہے۔ اور یزید یہ بھی کہا جائے گا کہ جو مزاج، جو طبیعت اور جو خاندانی ماحول یزید کیلئے فی الوقت ثابت ہے (رنہ خاندان سازگیس) اور حضرت حسین کے لیے اسکے جس رویے اور جن احساسات کی مضبوط شہادت کر بلا کے واقعہ شہادت کے کچھ پہلے تک کیلئے پائی جاتی ہے جن کا کچھ بیان اس کتاب کے بعض گزشتہ ابواب میں بھی ہوا ہے، یہ ثبوت اور یہ شہادتیں بہر حال اپنا وزن اس روایت کے اور اس جیسی روایتوں کے پڑنے میں ڈالتی ہیں۔

حضرت محمد الباقری روایت اور یہ قصے؟

ہم نے حضرت محمد الباقری روایت کا بار بار حوالہ گزشتہ صفحات میں دیا ہے اور تقدیر ضرورت شہادت تک کا حصہ نقل بھی کیا ہے۔ اس حصے کے بعد اس روایت میں بھی بعد شہادت والا قصہ ابن زیاد اور یزید سے متعلق آتا ہے ضروری ہے کہ اس گفتگو میں سکو بھی سامنے لایا جائے۔

اس روایت کو ہم نے شہادت حضرت حسین تک نقل کیا تھا اس کے آگے اس روایت میں ہے کہ آپ کو قبیلہ مدحج کے ایک آدمی نے قتل کیا تھا پھر اس نے سر کو تن سے جدا کیا اور

لے بہت بڑے الفاظ تھے اس لیے ترجمہ نہیں کیا گیا ہے۔ عربی الفاظ میں لثام لئیم کی جمع ہے اور فخرہ فاجر کی لثام طبری ج ۶ ص ۲۶۴ "طبری میں" شروء والائم ہے جو بدابہہ غلط ہے "شروء والائم منہ" ہونا چاہیے ابن اثیر میں یوں آیا ہے "الائم واحمق منہ" ج ۳ ص ۲۹۵۔

لے کر عید النہین زیاد کے پاس آیا اور انعام کا طالب ہوا۔ ابن زیاد نے یزید کے پاس روانہ کر دیا۔ یزید کے سامنے لا کر رکھا گیا تو وہ آپ کے مُنہ پر چھڑی سے ٹھوکے دیتے ہوئے ایک ”شعر“ پڑھنے لگا جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ حسین نے ازراہ حق ناشاسی و حق تلفی ہمارے خلاف صفت آرائی کی حضرت ابو بزرہ اسی صحابی موجود تھے انہوں نے ٹوکا کہ چھڑی ہٹا لو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بار بار دیکھا ہے کہ انکے مُنہ پر مُنہ رکھے ہوئے چوم رہے ہیں۔ بعد میں حضرت جبین کے اہل خانہ بھی کوفہ سے دمشق ہی پہنچا دیئے گئے۔ اس موقع پر یزید نے اپنے خواص اہل شام کو جمع کیا جن میں سے ایک نے خانوادہ حسینی کی ایک صاحبزادی پر نظر ڈال کر یزید سے کہا کہ امیر المؤمنین یہ لڑکی مجھے بخش دیجئے۔ حضرت یزید نے آٹے آکر کہا کہ ایسی بات کوئی شخص دین حق سے باہر ہو کر ہی کہہ سکتا ہے اس نے اپنی بات پھر دہرائی تو یزید نے کہا کہ باز آ جاؤ (کف عن هذا) اور پھر ان لوگوں کو اپنے گھر میں بھیج دیا۔ بعد ازاں اُنکے لیے سامانِ رخصت مہیا کر کے انکو مدینہ روانہ کیا۔

گویا اس روایت کا بیان بھی ایک ملے میں انہی روایتوں کی طرح ہے جن کے مقابلے میں ہم نے بھی اس کو ذکر کردہ روایت (بحوالہ طبری ص ۲۶۴) کو قابل ترجیح قرار دیا۔ یعنی اس میں بھی متہ پر چھڑی لگانے والی بات آئی ہے۔ سو اس سلسلے میں پہلی بات تو ہمارے نزدیک قابل توجہ ہے کہ یزید سے ہم حضرت جبین کیلئے اُس احترام کی توقع نہیں کر سکتے جو ہمارے نزدیک ضروری ہے ایسے بالکل ممکن ہے کہ چھڑی سے اشارہ کرتے ہوئے کچھ شکایت کا واقعہ پیش کیا ہو۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ روایت کے اس حصے میں کھلے طور پر اسحاق کی نشانیاں موجود ہیں۔ اور وہ یہ ہیں۔

۱۔ یہ روایت کہتی ہے کہ قاتل نے سر کو تن سے جدا کیا اور سیدھا لیکر ابن زیاد کے پاس پہنچ گیا۔ حالانکہ اس کا تصور نہیں کیا جاسکتا کہ بغیر سالار لشکر ابن سعد کے بھیجے ہوئے کوئی شخص یہ کام بالا ہی بالا خود کر ڈالتا۔

۲۔ یہ شعر بھی روایت میں اسی شخص کی زبان سے ابن زیاد کے سامنے کہلوائے گئے ہیں

جن کا ترجمہ ہے:

”حنور والا میری سواری کو سونے اور چاندی سے لاد دیتے تھے۔ اس لیے کہ میں نے ایک شاہ ذی شان کو قتل کیا ہے۔“

میں نے اس کو قتل کیا ہے جو اپنے نسب اور ماں باپ کے اعتبار سے سب سے اچھا ہے“
لیکن یہی دو شعر پڑھتا ہوا قاتل ہمیں ایک دوسری روایت میں کربلا کے میدان میں عمر بن سعد کے خیمے پر بھی دکھایا گیا ہے۔ اور پھر اس میں یہ بھی ہے کہ عمر بن سعد نے سنا تو کہا کہ :
” واللہ تو اذلی مجنون ہے۔ لاؤ اس کو اندر لاؤ۔ چنانچہ اندر لایا گیا تو چھڑی سے اس کی پٹائی کی۔ اور کہا، اے اوپا گل تو ایسی باتیں منہ سے نکال رہا ہے؟ ابن زیاد نے اگر سن لیا تو تیزی گردن مار دے گا۔“

عمر بن سعد کے خیمے پر بھی فی الواقع یہ شعر پڑھے گئے تھے یا نہیں؟ یہ الگ بات ہے لیکن نسبت اسکے کہ قاتل سرالگ کر کے بالا ہی بالا ابن زیاد کے پاس لے گیا ہو اور وہاں ان اشعار کی صدا لگائی ہو، یہ بات زیادہ سمجھ میں آئی ہو گی ہے کہ وہ یہ ”کارنامہ“ کر کے عمر بن سعد پر اللہ شکر کے خیمے پر آیا ہو اور داد و انعام کا طالب ہو اور ہو۔

بہر حال کچھ بھی ہو۔ ایک روایت کے مطابق یہ شعر قاتل نے میدان کربلا میں ابن سعد کے خیمے پر پڑھے تھے۔ اب اگر بعد میں یہی قصہ کوئی ابن زیاد سے متعلق کر کے سنا ہے تو صاف طور سے یہ کسی گڑبڑ کا شاخسانہ ہے اور وہ بھی بہت اُٹ پٹانگ قسم کی گڑبڑ، اور پھر اس کھلی گڑبڑ کے نتیجے میں بالکل قرین قیاس نظر آتا ہے کہ زید کی طرف ”چھڑی سے ہٹو کا دینے“ کی نسبت بھی اسی نوعیت کی چیز ہو، یعنی یہ کہ واقعہ تو ابن زیاد کا تھا۔ جیسا کہ اور روایتوں میں اچھا ہے۔ مگر حلقہ کی گڑبڑ یا ارادے کی گڑبڑ سے کسی راوی نے زید کے سر لگا دیا۔ اور یاد رہے کہ ابن زیاد کے بارے میں بھی ہم اپنی رائے کا اظہار کر چکے ہیں کہ ایسے واقعہ کا

ہونا بعید از قیاس اگرچہ ہرگز نہیں ہے، البتہ جب ایک روایت "ٹھوکا دینے" کے بجائے اشارہ کرنے کی موجود ہے تو کم از کم شک کا فائدہ ابن زیاد کو پہنچنے سے ہم نہیں روک سکتے۔ خواہ وہ قتل حسینؑ کی اصل ذمہ داری کے لحاظ سے ہیں کتنا ہی بیخوش ہو۔

خواتین خانوادہ نبوت کے ساتھ اور صاحبزادہ علی بن حسینؑ کے ساتھ رنج رسانی اور سخت کلامی وغیرہ کی روایتیں جو طبری میں بھی آتی ہیں اور دوسری کتابوں میں بھی ہیں ان سب کے بارے میں ہم اپنے آپکو یہی کہنے کے لیے مجبور پاتے ہیں کہ جب ان روایتوں سے بالکل مختلف صورت بتانے والی روایتیں بھی موجود ہیں جو ابھی ہمارے سامنے گذریں تو کوئی جواز نہیں کہ برائی اور بدسلوکی کا معاملہ دکھانے والی روایتیں قبول کر لی جائیں اور یہ تو مانا ہی ہوا ہے کہ یزید نے اس قافلے کو بہت دے دلا کر نہایت احترام کے ساتھ ایسے لوگوں کی معیت میں مدینے روانہ کیا تھا، جن کے احترام اور حفظ مرتبت کے رویے سے اہل قافلہ نہایت خوشنود اور شکر گزار ہوئے۔ اور پھر مدت العمر اس خاندان کے ساتھ غیر معمولی مراعات اور حسن سلوک کا رویہ رہا جس کی تفصیلات میں جانے کی شاید ضرورت نہیں اور پھر ایسا ہی رویہ اس خانوادہ نبوت کا بھی بنو امیہ کے ساتھ رہا۔ مگر اسکو کیا کیا جائے کہ ان سارے حقائق کے باوجود من گھڑت روایتوں کے پروپیگنڈے سے بنائی ہوئی جذباتی نفا میں لوگ ہمیں یہاں تک یقیں ماننے پر لے آئے ہیں کہ کونے سے جب شہداء کے کربلا کے سراور لقبیۃ السیف افراد کا فائدہ مشق کے حدود میں داخل ہوا اور یزید کی منتظر نظریں اپنے محل کی بلندی سے اس پر پڑیں تو اس نے وجہ میں آکر یہ دیکھ کر کافرانہ شعر پڑھے۔

لَمَّا بَدَتْ تِلْكَ الْحَمُولَ وَأَشْرَفَتْ تِلْكَ الرَّؤْسَ عَلٰی رَبِي جَيْرُونَ

نَعَقَ الْغُرَابُ نَقْلَتْ حُمْرًا وَلَا تَمَخَّحَ فَلَقَدْ تَقَضَّيْتُ مِنَ النَّبِيِّ دِيُونِي

ترجمہ: جب جیرون کے ٹیلوں پر کجاوے بٹھرائے اور وہ سر نظر آئے تو کوسے نے کانیں کانیں شروع کی

ملہ "اریخ طبری ج ۴ ص ۲۶۶

میں نے کہا کہ تو بول یا مت بول میں نے تو نبی سے اپنا قرض چکا لیا اور یعنی جنگ بدر کا قرض ہاں! کاش ہم سمجھ سکتے کہ یہ تیس غم حسین اور حمایت حسین کے پر دے میں کس کا قرآنہ منصوبے کی تکمیل ہیں۔

امام ابن تیمیہ کا ارشاد

اس موقع پر امام ابن تیمیہ کی بات قابل ذکر نظر آتی ہے۔ اپنی مشہور کتاب ”منہاج المسلمین“ میں لکھتے ہیں جس کا ہم یہاں خلاصہ پیش کر رہے ہیں:

”یزید کے سلسلے میں لوگوں کے تین گروہ ہیں، ایک کا اعتقاد ہے کہ یزید صحابی، بلکہ خلیفہ راشدین میں سے یا بلکہ انبیاء کے کرائم کے قبیل سے تھا۔ اسکے برعکس ایک سرگروہ کہتا ہے کہ وہ کافر اور بد باطن منافق تھا۔ اسکے دل میں بنو ہاشم اور اہل مدینہ سے اپنے اُن کافر اعدا و آفات کا بدلہ لینے کا جذبہ تھا جو جنگ بدر وغیرہ میں مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے تھے چنانچہ یہ لوگ کچھ اشعار اس کی دلیل میں اسکی طرف منسوب کرتے ہیں لیکن یہ دونوں قول ایسے غلط اور بے بنیاد ہیں کہ ہر سمجھدار اس کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہے یزید حقیقت میں ایک مسلمان فرمانروا اور بادشاہانہ خلافت والے خلیفہ، اس سے ایک خلیفہ تھا۔ وہ صحابی یا نبی تھا اور نہ ہی کافر و منافق۔“

حضرت حسین اور یزید کے قصے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

”ایک مجہول السند روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت حسین کا سر یزید کے سامنے لا کر رکھا گیا اور اُس نے آپ کے دندان کو اپنی چھڑی سے ہٹو کا دیا۔ یہ روایت نہ صرف یہ کہ از روئے سند ثابت نہیں ہے بلکہ اس کے مضمون ہی میں اس کے جھوٹ ہونے کا ثبوت ہے اس میں جن صحابہ کی موجودگی اُس وقت یزید کے پاس تائی گئی ہے (کہ انھوں نے اس کی حرکت پر ٹوکا تھا) وہ شام میں نہیں عراق

۱۔ یہی اشعار ہیں جو ابھی ہم نے نقل کئے۔

میں رہتے تھے۔ اور اس روایت کے برعکس متعدد لوگوں کی روایت ہے کہ زید نے
 ذہلِ حسین کا حکم دیا نہ اُس کا یہ مقصود تھا۔ بلکہ وہ تو اپنے والد حضرت معاویہؓ کی
 وصیت کے مطابق آپ کا اعزاز و اکرام ہی پسند کرتا تھا۔ البتہ اس کی خواہش یہ تھی کہ
 آپ اسکی حکومت کے خلاف اقدام کے ارادے سے باز آئیں۔ اور چونکہ آخر میں یہی ہوا
 کہ کوفے کے قریب پہنچ کر اپنے اپنا ارادہ ختم کر دیا اور زید کے پاس جانے یا کسی
 مسجد پر نکل جانے کی پیشکش کی۔ اس لیے جب زید اور اس کے گھروالوں کو آپ کی
 شہادت کی خبر پہنچی تو ان کے لیے یہ نہایت تکلیف دہ ہوئی۔ زید نے اس وقت
 یہاں تک کہا کہ خدا کی لعنت ہو ابنِ مرجانہ (ابن زید) پر، اس کی اگر حضرت حسینؓ سے
 رشتہ طاری ہوتی تو وہ کبھی ایسی حرکت نہ کرتا۔ پھر اس نے آپ کے اہلِ خاندان کھلے
 نہایت اچھا واپسی کا سامان کیا اور ان کو مدینے پہنچوایا اور اس سے پہلے پیشکش
 بھی کی تھی کہ وہ چاہیں تو دمشق ہی میں اُس کے پاس رہیں۔ ہاں یہ ٹھیک ہے
 کہ اس نے حسینؓ کے قاتلوں سے بدلہ نہیں لیا۔

اور یہ جو روایتیں بیان کی جاتی ہیں کہ حضرت حسینؓ کے گھرانے کی خواتین
 کو قیدی اور باندی بنا کر شہر گھمایا تو اللہ کا شکر ہے کہ مسلمانوں نے کبھی کسی
 ہاشمی خاتون کو باندی نہیں بنایا۔ عام امت مسلمہ تو کیا خود نبی اُمیتؐ میں
 ہاشمی خواتین کی تعظیم کا یہ حال تھا کہ حجاج بن یوسف نے (جو قریشی نہیں تھے)
 تھا، عبداللہ بن جعفر کی بیٹی سے شادی کر لی تھی تو حاندانِ نبو اُمیتؐ
 اس قدر برہم ہوا کہ دونوں کی علامدگی کرائے بغیر نہ رہا۔“



۱۰ انتخاب و تلخیص از منہاج السنۃ ۳۲۱ تا ۳۲۵

باب دوازدهم

وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا
ایک نوشتہ تقدیر تھا جو پورا ہوا

کر بلا کا یہ حادثہ فاجعہ اسے بجز تقدیر الہی کے اور کیا کہا جائے؟ کوئی سمجھ
میں آنے والی بات ہے کہ اہل تعلق اور اہل محبت جن میں وقت کے بزرگ ترین اکابر
اہل علم و دین بھی ہیں، ایک زبان ہو کر سمجھائیں کہ عراق کا قصد نہ کیجئے۔ یہ خدایوں اور دھوکہ
بازوں کی سرزمین ہے، صبح و شام بدل جانے والوں کی سرزمین ہے، اور ان آرزوئے ہوئے
نابکاروں کی سرزمین ہے جنہوں نے آپ کے والد ماجد کو رلایا اور آپ کے بھائی کو کبھی
نہ بھلایا جانے والا تجربہ کرایا۔ مگر یہ ساری فہمائشیں دھری رہ جائیں۔ نہ محمد بن حنفیہ جیسے
جاں نثار بھائی کی مؤذبانہ اور حکیمانہ گزارش کام آئے۔ نہ حضرت عبداللہ بن عمر کی بزرگانہ
اور تجبانہ فہمائش۔ نہ حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت ابو بکر بن عبدالرحمن بن حبارت
کا ہر ہر پہلو سے سمجھانا اور نہ حضرت عبداللہ بن مطیع کا فرویانہ واسطے دینا، نہ حضرت ابوسعید
خدری، حضرت وائل بن واقد اللبثی، حضرت مسور بن مخزوم اور حضرت جابر بن عبداللہ کا اپنے
اپنے انداز سے فیصلہ بدلوانے کی کوشش کرنا۔ حتیٰ کہ وہ آخر میں حضرت عبداللہ بن جعفر کا بیچ میں
آکر آخری زور لگا لینا بھی اسی طرح بے کار جائے، جیسے کمان سے نکلے تیر کو واپس
لانے کی کوشش بے سود ہو کرتی ہو!

اور پھر جب وقت آتا ہے کہ آپ (حضرت حسینؑ) سفر کے آخری مرحلے میں اُس مہم سے دستکشی کا فیصلہ فرماتے ہیں جس مہم کے لیے سفر اختیار فرمایا گیا تھا تو تھکے الہی یہاں بھی اڑے آجاتی ہے اور عبداللہ بن زیاد جس کو بظاہر بڑی خوشی کے ساتھ آپ کی تین باتوں میں سے زبرد کے پاس جانے والی بات تو مان ہی لینی چاہیے تھی کہ اچھا ہے، وہ جانیں اور بیجانیں، میں آزمائش سے بچا۔ مگر بالکل غلاتِ قیاس و گمان ابن زیاد نے آپ کی تینوں باتوں کو یکساں طور پر رد کر دیا۔ اور پہلے کو فے آنے کی وہ شرط لگا دی کہ حادثہ اور المیہ ٹلنے کی شکل بنتے بنتے بگڑ گئی۔ آخر اسے تقدیر الہی کے سوا اور کیا کہا جائے؟

تبادلہ کی منزل پر جب آپ کو اپنے عمزاد اور سیرِ مسلم بن عقیل کی کو فے میں گرفتاری اور انجام کی خبر ملی اور وہ ساری بساط اُلٹی ہوئی نظر آئی جس کی بنیاد پر آپ نے سفر شروع کیا تھا۔ تو وہ پہلا وقت تھا کہ آپ کو (غالباً عورتوں اور بچوں کے خیال سے) سفر ترک کر کے واپس ہو جانے کا خیال ہوا۔ اور یہ ایک مناسب وقت تھا۔ کیونکہ کو فے یہاں سے ابھی کچھ دور تھا۔ اور ان مخلصین کی نہمائشوں، گزارشوں اور فتوں کے پس منظر میں جو اس سفر سے مانع ہو رہے تھے۔ اور ان تجربات کے پس منظر میں جو حضرت علیؑ اور حضرت حسنؑ کو اہل کو فے سے پیش آئے تھے اور جب بڑھ کر خود مسلم بن عقیل کے خط کے پس منظر میں جو انھوں نے اپنی گرفتاری پر اہل کو فے کی بزدلی اور خداری کے حوالے سے حضرت حسینؑ کو اس مقصد سے لکھا تھا کہ وہ سفر ترک کر کے پیچھے کلوٹ جائیں (ان سب باتوں کے پس منظر میں) کسی کو بھی واپسی کے خیال سے اختلاف نہ ہونا چاہیے تھا۔ مگر جیسے کہ کوئی بات ہو کر رہی ہو، اور کوئی نہیں خود اور ان مسلم بن عقیل اڑ گئے کہ نہیں اب پیچھے نہیں لوٹا جاسکتا۔ ہم اپنے بھائی کا بدل لیں گے یا اپنی جان بھی دیدیں گے، ظاہر بات ہے کہ اس صورت حال میں حضرت حسینؑ کے لیے ممکن نہ تھا کہ واپسی پر اصرار فرمائیں، آپ کو واپسی کا خیال ترک کر کے معاملہ اللہ پر چھوڑ دینا پڑا۔ اور گویا پھر تقدیر کا ہاتھ بیچ میں آ گیا۔

اور پھر جب تادمیر کے قریب پہنچ کر مرحلہ وہ آ گیا کہ حالات کی خبروں کی بجائے حالات کی

اپنی ٹھوس شکل و صورت ہی سامنے آجائے اور اس مرحلے پر برادرانِ مسلم بھی غالباً اپنے جذبات کے عالم سے نکل آئے۔ ترب و لپی کے خیال پر عمل کرنا تو ممکن نہیں رہا تھا، مگر آپ نے کوفے کی بہت سے بہر حال ہٹ جانے کے لیے ایک غیر معمولی فیصلہ فرمایا۔ یہ فیصلہ تھا زید کے پاس دشمن چلے جانے کا! بلاشبہ یہ ایک غیر معمولی فیصلہ تھا۔ یہ ایک انقلاب لاسکتا تھا۔ روایات میں صراحت ہے کہ آپ نے یہ فیصلہ زید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دینے (وضع الید فی الید) کیلئے کیا تھا (اور صراحت یہ بھی ہوتی ہے) جن حالات میں آپ زید کے پاس جا رہے تھے، اُن حالات میں آپ کے وہاں جانے کے اور کوئی دوسرے معنی نہیں ہوتے) پس ابن زید کو بعد سترت یہ بات قبول کرنی تھی کہ آپ زید کے پاس تشریف لے جائیں۔ حضرت حسینؑ اور ان خود زید کے پاس جانے کا ارادہ فرما رہے ہیں! اس کے زیادہ کسی کو کیا چاہیے؟ زیادہ سے زیادہ اس کا اطمینان کر لیا جانا کہ آپ واقعی وہیں جائیں گے اور وہیں نہیں چلے جائیں گے۔ اس کیلئے ابن زید اپنا ایک دستہ ساتھ میں کر سکتا تھا۔ بلکہ بعض روایات کے مطابق تو آپ نے عمر بن سعد سے فرمایا ہی یہ تھا کہ:

(فان ابین هذا) نسیرنی الی
یزیدؑ

اگر دوسری بات منظور نہیں ہے (تو تم مجھے
زید کے پاس بھیجو۔ (جانے دو نہیں بلکہ بھیجو)

یزید کے پاس آپ کا اس درجہ چپکے ساتھ جانا کہ اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدیں اس کا نتیجہ (وقت کے تمام دستیاب قرآن و شواہد کی بنا پر) سوائے اس کے کچھ نہیں ہونا تھا کہ زید آپ کا اکرام کرے اور ہر ممکن طریقے سے اس بات کی کوشش کرے کہ آپ کی اس کے ساتھ کشیدگی جاتی رہے۔ وہ کیا شکل ہوتی؟ یہ ہم نہیں کہہ سکتے۔ لیکن اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ حضرت معاویہؓ کی وصیت کے مطابق انہی کے نقش قدم پر "صلح حسن" جیسا کوئی باب زید اور حضرت حسینؑ کے درمیان بھی ضرور رقم ہوتا۔ مگر قیاس و گمان کے تمام تقاضوں کے

لے بلکہ ان خاص حالات سے قطع نظر بھی اس لیے جو لوگ اس جانے کے کوئی اور معنی کرتے ہیں انھیں بس "شاہ کا شاہ سے بھی زیادہ دنا دار" ہی کہا جاسکتا ہے۔ ۸۷ البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۷۱

برعکس ابن زیاد کو آپ کی پیشکش قبول نہ ہوئی۔ اور المیہ کر بلا جو کاتبِ تقدیر کے ہاتھ سے رقم ہو چکا تھا وہ وجود میں آ کر رہا۔

نوشتہ تقدیر کا راز؟

اس تقدیر کا راز اور اس کی حکمت کیا ہو سکتی ہے جو ایک الم گیز واقعہ کے لیے راہ بناتی آرہی تھی؟ سوال کافی سخت ہے۔ مگر امام ابن تیمیہ کے یہاں اس کا ایک جواب ملتا ہے جو بے تو قیاس و گمان ہی کی بات مگر امام موصوف نے بڑے اعتماد کے ساتھ پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں :-

”حسینؑ کا قتل بلا تشریح مظلومانہ قتل ہے جو ان کے حق میں شہادت، علو منزلت اور رفیع درجت ہے اور (راز اس کا یہ ہے کہ) ان کے اور ان کے بھائی کیلئے اللہ کے یہاں سعادت اور نیک نختی کا وہ بلند مرتبہ طے ہو چکا تھا جس کیلئے کسی نہ کسی طرح کی بلا اور مصیبت سے گزرنا لازم ہے۔ مگر ان دونوں کو اپنے دوسرے اہلبیت کی طرح سے اس کے مواقع اس لیے حاصل نہ ہو سکے تھے کہ ان کی زندگی اسلام اور عزت و عافیت کی گود ہی میں بسر ہوئی تھی۔ پس ایک بھائی کی وفات زہر خورانی سے ہوئی اور دوسرے کی قتل سے تاکہ اس مصیبت کے صلے میں وہ شہداء کا عیش اور سعدا کی منزلت پاسکیں۔“

گو یا حضرت حسینؑ کا کچھ نہ سمجھ میں آنے والا سفر ہو یا ابن زیاد کا اس سے بھی زیادہ ناقابل فہم روئے دونوں تقدیر الہی کے ایک منصوبے کا کرشمہ تھے جو پہلے سے طے ہو چکا تھا۔

حضرت حسینؑ کا اقدام اور ابن تیمیہ

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ابن تیمیہؒ حضرت حسینؑ کے لیے اس علو منزلت کے

قائل ہونے کے باوجود جو اُن کے مذکور بالا بیان میں نظر آتی ہے آپ کے اُس اقدام کی صحت کے قائل نہیں ہیں جس کے نتیجے میں شہادت کا مرتبہ آپ نے پایا۔ فرماتے ہیں کہ:۔

”یہ بات جان لینسی چاہیے کہ صحابہ کرام کا طبقہ ہو یا تابعین عظام کا یا بعد کے زمانوں کے اہل بیت یا غیر اہل بیت کا، ان میں سے بڑے بڑے اہل علم و دین سے بعض وقت ایسی نوعیت کا اجتہاد سرزد ہوتا ہے جس میں کچھ ظن و وہم اور کبھی کوئی باریک قسم کی ہوائے نفس شامل ہو جاتی ہے، ایسا اجتہاد اس شخصیت کی عظمت کے باوجود قابل اتباع نہیں ہوتا، لیکن جب کبھی ایسی بات پیش آ جاتی ہے تو دو قسم کے انسانوں کے لیے فتنہ بن جاتی ہے، جو لوگ اُس انسان کی عظمت کے قائل ہوتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس کے اس خاص فعل کو بھی صحیح اور قابل اتباع قرار دیا جائے۔ جو اُسے ناپسند کرنے والے ہوتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ایک اجتہادی غلطی کی بدولت اُسے ولایت و تقویٰ کے مرتبے ہی سے نہیں اہل جنت اور اہل ایمان کے زمرے سے بھی خارج کر دیں۔“

کیوں اس اقدام کی صحت کے قائل نہیں ہیں؟ مہناج السنۃ کی اسی بحث میں جس بحث سے اوپر کے دو اقتباس لیے گئے ہیں، ہمیں اس سوال کا یہ جواب ملتا ہے:۔

”حضرت محمد ﷺ اللہ علیہ وسلم کی بعثت انسانوں کی معاش و معاد (ذمیوی اور اخری زندگی) کی صلاح و فلاح کے لیے ہوئی تھی، آپ نے ہر اس بات کا حکم دیا جس میں صلاح (بھلائی) ہے اور ہر اس بات سے منع فرمایا جس میں فساد (بگاڑ اور برائی) ہے پس ایسا کوئی کام اگر سامنے آتا ہے جس میں صلاح اور فساد دونوں پہلو پائے جاتے ہیں تو اہل سنت یہ دیکھتے ہیں کہ فساد کا پہلو غالب ہے، یا صلاح کا؟ اور پھر جو پہلو غالب نظر آتا ہے اسی کے مطابق اس کام پر حکم لگاتے ہیں، صلاح اور فلاح کا پہلو

غالب ہے تو اس کام کے کرنے کو ترجیح دیتے ہیں؛ فساد اور خرابی کا پہلو غالب نظر آتا ہے تو اس کام کے ترک کو ترجیح دی جاتی ہے۔

پس اب ایک یزید یا عبدالملک اور منصور جیسا کوئی شخص خلافت کے منصب پر فائز ہو جاتا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس سے قتال کر کے کسی بہتر شخص کو اُس کی جگہ لانے کی کوشش کی جائے؟ اہل سنت اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں؛ کیونکہ ایسے فعل سے بہ نسبت بھلائی اور مصلحت کے بگاڑ اور فساد کے زیادہ امکانات ہیں۔ پوری تاریخ ہمیں بتا رہی ہے کہ کسی صاحبِ سلطنت و قوت شخص کے خلاف جب بھی خروج کیا گیا بالعموم اُس کا خیر بہت معمولی اور شہرت زیر دست ہو، مثلاً یمن و اولوں نے یزید کے خلاف جو خروج کیا یا ابن الاشعث نے عبدالملک کے خلاف عراق میں کیا یا ابن المہدی نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کی یا ابو مسلم نے خراسان میں اپنی بنو امیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، یا طیفقہ منصور کے خلاف مدینے اور بصرے سے بغاوت اٹھی۔ اُن میں ہر جگہ نہرِ محبت اور بربادی کے سوا کچھ نہ ملا۔ اور ابو مسلم خراسانی جتنا بھی تو کیا جیت اُس کی ہوئی؟ منصور کے ہاتھوں وہ خود مارا گیا اور جیت میں کس قدر آدمی اُس نے مروا دیئے! اللہ کی پناہ! الغرض ایسے لوگ

فلا تاتوا دیناً دلاً ببقوا دیناً نہ دین ہی قائم کر سکتے نہ دنیا ہی بچا سکتے حالانکہ اللہ تعالیٰ کسی ایسے کام کا حکم نہیں فرماتا کہ جس میں نہ دین کی فلاح ہو نہ دنیا کی صلاح (اور ایسے کام اللہ کو پسند نہیں ہیں) چاہے ان کے کرنے والے کیسے ہی متقی بندے اور اصحابِ جنت کیوں نہ ہوں؟ ذرا بتائے کیا یہ لوگ (جسکے نام مثلاً اوپر لے گئے) علیؑ، طلحہؓ، زبیرؓ اور عائشہؓ سے بڑھ کر ہیں جن کا تقویٰ مسلم ہونے اور جنت کی نشانتا جنھیں حاصل ہونے کے باوجود ان کے قتال ہی والے فعل کو قابلِ تعریف نہیں قرار دیا گیا؟

مسلمانوں کے اکابر اہل علم نے ہمیشہ ہی ان خروجوں کی مخالفت کی ہے، مثلاً زید کے خلافت اہل مدینہ خروج پر آمادہ ہوئے تو عبداللہ بن عمر، سعید بن مسیب اور علی بن حسین (زین العابدین) نے اُلکوا ایسا کرنے سے منع کیا، یا ابن الاشعث کی بغاوت کا فتنہ اٹھا تو حسن بصری، مجاہد وغیرہ نے سمجھایا، لہذا اہل سنت کی یہاں یہ سبب بالکل طے شدہ ہے کہ فتنے کے وقت میں تلوار اٹھانا مناسب نہیں۔ علماء اہل سنت نے اس مسئلہ کی اس درجہ اہمیت سمجھی ہے کہ اسے عقائد کی فہرست میں داخل کر کے لازم کیا ہے کہ ائمہ اور خلفاء کے جو رسوم کا مقابلہ تلوار کے بجائے صبر اور برداشت سے کیا جائے۔ حالانکہ وہ یہ جانتے ہیں کہ کیسے اور کتنے اہل علم اور اہل دین بھی فتنوں کی لڑائیوں میں شریک ہو چکے ہیں۔ انکا یہ فیصلہ اس لیے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیثوں سے اس معاملے میں یہی حکم ثابت ہوتا ہے اور جو کوئی بھی اس سلسلے کی احادیث نبویہ پر غور کرے گا وہ خود بھی اس نتیجے پر پہنچے گا کہ احادیث کا حکم بہترین حکم ہے۔

یہی وجہ تھی کہ جب حسینؑ نے عراق جانے کا ارادہ فرمایا تو اکابر اہل علم و دین مثلاً ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، ابوبکر بن عبدالرحمن بن حارث بن ہشام نے اس ارادے کے خلاف مشورہ دیا۔ انھیں صاف نظر آ رہا تھا کہ اس کا انجام آپ کی جان کو گزند پہنچنے کے سوا مشکل ہی سے کچھ اور ہوگا، چنانچہ جب آپ اپنا ارادہ بدلنے کو تیار نہ ہوئے تو بعض نے کہہ بھی دیا کہ "اچھا جائے آپ کو اللہ کے سپرد کیا، اور بعض نے کہا کہ "بات بدناما ہو جائے گی ورنہ جی چاہتا تھا کہ آپ کو زبردستی سے روک لیں۔"

ان حضرات کا یہ کہنا سوائے اس کے اور کسی وجہ سے نہیں تھا کہ حسین رضی اللہ عنہ کی اپنی اور عامۃ المسلمین کی مصلحت اسی میں تھی، اور اللہ ورسول کے یہاں مصالح کی رعایت اور مفاسد سے بچنے ہی کا حکم ہے۔ چنانچہ بالکل وہی ہوا جس کا ان حضرات

لہ استودعک اللہ من قتل۔

کو اندیشہ تھا کہ دین یا دنیا کی کوئی بھلائی تو اس اقدام سے کسی کو حاصل نہ ہوئی۔ البتہ کوئی
کے بددعاؤں کو بے اثر کر دیا اور ان کو شہید کر ڈالا۔ کاش وہ اپنے
شہر ہی میں رہتے تو وہ فساد نہ لازم آتا جو ان کے خروج اور قتل سے رونما ہوا۔

فان ما قصدہ من تحصیل الخیر انھوں نے اپنے خروج سے جس تحصیل خیر اور
ودفع الشر لم يحصل منه شیء بل دفع شر کا ارادہ کیا تھا تو وہ کچھ حاصل نہ
زاد الشر بخروجہم و قتلہم ہوا۔ اس کے بجائے اس خروج اور پھر
الخیر یذکون صا رسبباً الشر قتل سے شر بڑھا اور خیر کم ہوا۔ اور یہ
عظیم و کان قتل الحسین مآ قصہ ایک شہر عظیم کا سبب گیا یعنی قتل
ادجب الفتن کما کان قتل عثمان حسینؑ اسی طرح فتنوں کا موجب بن گیا
مما ادجب الفتن۔ جیسے قتل عثمانؓ سے فتنے اٹھے تھے۔

"یہی وہ وجہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حسنؑ کے لیے
بطور تعریف فرمایا تھا کہ "میرا یہ بیٹا سرا ہے، زمانہ آئے گا کہ اس کے ذریعہ
اللہ مسلمانوں کے ڈوبنے سے گروہوں میں صلح کرانے گا،" لیکن کسی کی بھی تعریف
آپ نے اس کے لیے نہیں فرمائی کہ وہ حالت فتنہ میں تلوار اٹھائے گا۔
یا کسی امام چار پرچہ خروج اور اس کی سربراہی ماننے سے انکار کر دے گا
بالخوارج کے سلسلے میں ضرور آپ نے صاف ارشاد فرمایا تھا کہ
ایسی جماعت مسلمانوں میں رونما ہونے سے ضرور قتال کیا جائے۔ چنانچہ ان
سے جب علی رضی اللہ عنہ نے قتال فرمایا تو وہی صحابہ جو جمل اور صفین کے قتال
میں آپ کے ہمراہ تھے اس قتال میں سب کے سب متفق ہوئے اور اسی
طرح بعد کے اہل علم نے بھی ان دونوں قتالوں میں فرق کیا۔"

۱۔ منہاج السنۃ ۲۱۲ تا ۳۱۴ سے تلخیص و انتخاب۔

ظلم کی ذمہ داری کس پر؟

امام ابن تیمیہ کی یہ بحث کہ حضرت حسینؑ کا یہ اقدام جس کے نتیجے میں آپ کی مظلومانہ شہادت پیش آئی، شرعی نقطہ نظر سے کیا حیثیت رکھتا تھا؟ اور کیوں رکھتا تھا؟ یہاں ایک ضمنی ذکر میں آجانے والی بحث تھی، ورنہ ہمارے موضوع کو اس شرعی بحث سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ مظلومانہ شہادت کی بات آنے اور اُسے مان لیے جانے کے بعد جو مسئلہ طبعی طور پر ہمارے سامنے آنا چاہئے، وہ یہ ہے کہ اس ظلم کی ذمہ داری کس پر کتنی ہے؟ یزید پر یا ابن زیاد پر؟ تاریخی شہادتوں کا جو ذخیرہ ہمارے سامنے ہے وہ کسی بھی طرح اس کی اجازت نہیں دیتا کہ اس خونِ ناحق کی ذمہ داری یزید پر ڈالی جائے، یزید نے بیشک ابن زیاد کے سپرد یہ بھی کیا تھا کہ وہ حضرت حسینؑ سے نیٹے اور کوفے میں ان کو آزادانہ داخل نہ ہونے دے۔ اس کے بعد اگر یہ بات پیش نہ آگئی ہوتی کہ حضرت حسینؑ نے اس عہم سے قطعی دستبرداری ظاہر کر کے جس کے لئے وہ مکے سے نکلے تھے، یزید کے پاس جانے اور اپنا فیصلہ اس کے ہاتھ میں رکھ دینے کی پیشکش کر دی، تب بیشک ابن زیاد کے حکم سے کی جانے والی جنگی کارروائی کی اصل ذمہ داری یزید ہی پر آتی، مگر اس کا مل طور پر تبدیل شدہ صورت میں ابن زیاد نے یزید سے رجوع کیے بغیر اور کارروائی کے اصرار علیٰ عمر بن سعد کے مشورے کے بھی بے خداتہ قتل و قتال کی کارروائی کرائی، اس کی ذمہ داری یزید پر ڈالنا ایک زیادتی ہی کی بات ہوگی۔ ہاں اگر وہ اس کارروائی سے اپنی رضامندی اور خوشنودی کا اظہار کرتا تو پھر ضرور حق تھا کہ اسی کو اصل ذمہ دار قرار دیا جائے، مگر اس بارے میں ہم گندہ شہاب میں مختلف روایتوں کا جائزہ لے کر دیکھ چکے ہیں کہ ذمہ داری کے ساتھ ایسی بات یزید کی طرف منسوب کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ متعدد قرآن و شواہد کی روشنی میں پلڑا ان روایتوں کا بھاری نظر آتا ہے جو اس واقعہ پر یزید کی نارضامندی اور ناخوشی ظاہر کرتی ہیں، اور اسی بنا پر اس باب (۱۲) کے پچھلے صفحات میں ابھی ہم لکھ کر آئے ہیں کہ:-

”یزید کے پاس آپ کا اس درجہ بچک کے ساتھ جانا کہ ایسا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیدیں، اس کا نتیجہ وقت کے تمام دستیاب شواہد و قرائن کی روشنی میں سولے اس کے کچھ نہیں ہونا تھا کہ یزید آپ کا اکرام کرتا..... اور حضرت معاویہؓ کی وصیت کے مطابق انہی کے نقش قدم پر صلحِ حنین جیسا کوئی باب یزید اور حضرت حسینؓ کے درمیان بھی ضرور رستم ہوتا۔“

پس ہمارے خیال کے مطابق اس کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا تھا کہ اگر حضرت حسینؓ کی پیشکش کے بارے میں یزید سے رجوع کیا جاتا تو وہ ابن زیاد کو اس بیٹے اور اس کاروائی کی اجازت دیتا جس کے نتیجے میں سانحہ کربلا پیش آیا۔

ابن زیاد کو سزا کیوں نہیں دی؟

یہ سوال جب کسی عام آدمی کی طرف سے سامنے آئے تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہوتی۔ مگر جب پڑھے لکھے لوگ بھی یہ سوال اٹھاتے ہیں تو پھر حیرت ہوئے بغیر نہیں رہتی، اس لیے کہ نارضا مندی اور سزا دہی کا کوئی ایسا لازمی تعلق نہیں ہے کہ ایک حاکم نے اپنے ماتحت کی کسی بات کو ناپسند کیا ہو تو وہ اُسے سزا بھی ضرور دے دے، بہت سی دفعہ ناخوشی کا اظہار بھی اُس آدمی پر کرنا مناسب نہیں سمجھا جاتا ہے۔ اور اس کی کسی قابل لحاظ مثال ہمارے سامنے موجود ہے کہ حضرت علیؓ کی فوج میں بلکہ ان کے نہایت خاص معتمدین میں بھی وہ لوگ شامل تھے جو قاتلانِ عثمانؓ کے سرگروہ شمار کیے جاتے تھے، اور خود حضرت علیؓ کو اس الزام سے انکار نہ تھا۔ مگر اس مطالبے کے جواب میں کہ ان کو سزا دی جائے یا ورنہ عثمانؓ کے سپرد کیا جائے حضرت علیؓ کو ہمیشہ یہی کہنا پڑا کہ حالات اجازت نہیں دیتے۔ یعنی سزا کا مطالبہ کرنے والے بھی موجود تھے، اصولاً حضرت علیؓ کو مطالبے سے اتفاق بھی تھا۔ پھر

بھی مصالح وقت کا مسئلہ ایسا تھا کہ آپ اس پر عمل درآمد نہیں کر سکتے تھے۔ تو اب اگر ہم یزید کے لیے کوئی جداگانہ اصول نہیں بناتے ہیں تب آسانی سے محسوس کر سکتے ہیں کہ:-

جس ابن زیاد نے یزید کے ہاتھ سے نکلنے ہوئے عراق کو نہ صرف لوٹ لیا تھا بلکہ جو طوفان وہاں یزید کے خلاف تیار ہو رہا تھا، اس کا رخ اس نے تمام تر حضرت حسینؑ کے خلاف موڑ کے دکھا دیا، یزید کیسے کیسے ممکن تھا کہ اس کا سر قلم کرنے کی بات سوچے؟ اور وہ بھی ایسی حالت میں! کہ کوئی مطالبہ کسی طرف سے ایسا نہیں ہے؟

اور

مزید برآں! ایسی حالت میں کہ اس کے ذہن پر اس قسم کا کوئی تقاضہ بھی بظاہر نہیں ہو سکتا تھا؟

اُسے واقعہ سے رنج ہوا ہو، افسوس ہوا ہو، ایک الگ بات ہے، لیکن یزید اور حضرت حسینؑ کے تعلقات کی جو تاریخ تھی (جو یزید کے والد کے زمانے سے چلی آرہی تھی اور جس کو ہم پچھلے ابواب میں دیکھ آئے ہیں) اس کے ہوتے ہوئے ایک خاندانی آدمی ہونے کے ناتے یہ توقع تو یزید سے کی جاسکتی تھی اور کی جانی چاہیے تھی کہ اُسے واقعہ پر رنج و ملال ہو مگر اس سے آگے بڑھ کر یہ توقع تعلقات کے اُس پس منظر میں کرتا کہ وہ ابن زیاد کی اس کارروائی کو ایک قابل سزا جرم سمجھے یہ تو ایک بہت ہی غیر فطری قسم کی توقع ہے۔ حضرت حسینؑ کی اُس تمام عظمت کے باوجود جس کی بنا پر ہمیں یہ خیال ہوتا ہے کہ یزید اگر کر بلا کے اس واقعے سے خوش نہیں ہوا تھا تو ابن زیاد کو اس کی طرف سے کوئی سزا یا ملامت ہونی چاہیے تھی، ہم اس فطری حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار

ہیں کر سکتے کہ جب سیاسی کشمکش کا بیج آجاتا ہے تو پھر فریقین کے ذہن سے ایک دوسرے کی قابل لحاظ عظمتوں کا نقش مٹنا چلا جاتا ہے۔

حضرت علیؑ اور حضرت معاویہؓ کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ کشمکش شروع ہوئی تو حضرت معاویہ کو پورا احساس تھا کہ ان کی اور حضرت علیؑ کی کوئی برابری ہی نہیں ہے، حضرت علیؑ نے اپنے خطوط میں انہیں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی تو انہوں نے بے تامل اعتراف کیا کہ آپ بجا فرماتے ہیں۔

اما شرفك في الاسلام و اسلام میں آپ کی بزرگی اور جناب
 قرابتك من رسول الله رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے
 صلی اللہ علیہ وسلم فلست آپ کی قرابت کا جہاں تک تعلق ہے
 ادفعہ..... اُس سے مجھے ذرا انکار نہیں۔۔۔

مگر جب اس کشمکش پر لبا عرصہ گزر گیا اور تلخی بڑھتی چلی گئی تو پھر حضرت معاویہ کے رویے میں اس اعتراف اور احساس کی جھلک ہمیں نظر آنی بند ہونے لگی، اور یہ بالکل فطری بات ہے، ہم اپنی خواہش کے ماتحت کسی جگہ پر ایک اصول فطرت کو ماننے سے انکار کریں تو یہ ہماری مرضی ہے۔ اصول اپنی جگہ اصول رہے گا۔ بہر حال ابن زیاد کو کوئی سزا نہ دینا یا ملامت نہ کرنا، اس سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ یزید کو کوئی افسوس اور سچ بھی حضرت حسینؑ کی شہادت پر نہیں ہوا یا وہ خوش ہوا اور اس کی اپنی مرضی بھی فی الواقع وہی رہی ہو جو ابن زیاد کے ہاتھوں ہو گیا۔

ابن زیاد کیوں لبصد ہوا؟

باب کے ابتدائی صفحات میں جو ہم نے لکھا کہ، بظاہر تو ابن زیاد کو ہنایت خوشی کے اس بات پر راضی ہونا چاہیے تھا کہ حضرت حسینؑ اگر یزید کے پاس جانا چاہتے ہیں تو

ضرور چلے جائیں۔ لیکن واقعہ اس کے برعکس ہو تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کب نہ تقدیر الہی کے اور کیا کہا جائے، جس میں گویا حضرت حسینؑ کا مرتبہ شہادت پانا مفقود ہو چکا تھا۔ ہمارے اس لکھنے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ابن زیاد کے ذہن میں بھی اپنے اس رویے کی کوئی وجہ نہ رہی ہوگی اور بس یونہی تقدیری جبر سے وہ یہ کام کر بیٹھا ہوگا۔ بے شک اس کے ذہن میں کوئی بات اور اپنے اس رویے کا جواز ہونا چاہیے۔ او ہمیں اس کی تلاش ہے۔ اس تلاش میں کامیابی کی منزل تو اب تک ہاتھ نہیں آسکی ہے۔ لیکن اس تلاش اور غور و فکر کے دوران میں بعض باتوں کی طرف نظر جاتی ہے، جن کا یقیناً بہت کچھ دخل ابن زیاد کے اس رویے میں ہونا چاہیے۔

۱۔ اس نے اپنے باپ سے وراثت میں ایک سخت گیر منتظم (ADMINISTRATOR) کا مزاج پایا تھا۔ نظم و نسق اور امن و امان کا قیام اور اس کا تحفظ باپ کی طرح ابن زیاد کی نظر میں بھی ایک حاکم کا سب سے بڑا فریضہ اور سب سے بڑی نیکی تھی۔ اس کے باپ زیاد کو جب حضرت معاویہؓ نے بصرے کا حاکم مقرر کیا تو بصرے کے امن و امان کا حال اس وقت بے حد خراب تھا۔ اس نے وہاں پہنچ کر ایک زبردست تقریر میں اپنی پالیسی کا بیان کیا۔ اس بیان کے ماتحت رات کو عشاء کے بعد سے صبح فجر تک باہر نکلنا ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ اور اس کی خلاف ورزی کی سزا قتل۔ ایک اعرابی یعنی بصرہ شہر سے باہر کا آدمی جو اس قصے سے بے خبر تھا۔ کسی کام سے بصرے آیا تھا۔ رات میں چلتا پھرتا پایا گیا۔ گرفتار ہوا اور زیاد کے پاس لایا گیا، اس نے اپنی صفائی دی۔ زیاد نے کہا میں سمجھتا ہوں کہ تیرا بیان سچا ہے تو بے خبر تھا۔ مگر نظم و نسق کا تقاضا یہ ہے کہ میں تجھے بھی نہ چھوڑوں۔ چنانچہ قتل کر دیا گیا۔ اس مزاج اور طبیعت کا

۱۲۶ ج ۶ طبری ج ۶ اس واقعہ کو بیان کر کے طبری لکھتے ہیں۔

"زیاد پہلا حاکم تھا جس نے حکومت کی آواز کو ذرا دیا۔ معاویہ کے (باقی اُردو صفحہ پر)

ان میں سے کوئی چیز ابن زیاد کے ساتھ نہیں پائی جاتی تھی۔ وہ ایک ساقط النسب آدمی کا بیٹا تھا۔ حضرت معاویہؓ نے اس (نسبی) سلسلے میں اُس پر اور اُس کے باپ پر جو احسان کیا تھا اُس کا یہ اثر عین قرین قیاس ہے کہ آدمی کو بادشاہ سے زیادہ بادشاہ کا وفادار بنادے۔ اور اس لیے قرین قیاس ہے کہ حضرت معاویہؓ اور یزید کے تحت ان باپ بیٹوں کی انتظامی سختی میں ان کے اپنے سخت گیر انتظامی مزاج کے علاوہ کچھ اس احسان مندی کا بھی دخل ہو، اور خاص طور سے وہ اشخاص ان کے لیے کسی بھی پاس و لحاظ کے مستحق نہ رہ جاتے ہوں جو اس حناندان کے اقتدار کو چیلنج کرتے ہوں۔

ان باتوں سے یہ عفتدہ تو حل نہیں ہوتا کہ جب حضرت حسینؓ کی سہ گانہ پیش کش گویا پکار کر کہہ رہی تھی کہ اب اُن سے کوئی خطرہ محسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تو پھر کون سی انتظامی مصلحت کا یا بادشاہ کی بادشاہ سے بھی زیادہ کون سی وفاداری کا تقاضہ تھا کہ اس پیش کش کو قبول کرنے کی نرمی دکھانے کے بجائے وہی سختی دکھائی جائے جو عام عادت بن گئی تھی۔ مگر ان باتوں کی طرف توجہ سے عقیدے کی سختی کچھ کم بہر حال ہو جاتی ہے۔

آہ یہ بے توفیقی!

بہر حال یہ بڑا ہی المناک حادثہ ہے کہ جب اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت حسینؓ رضی اللہ عنہ کے لیے وہ جرأت آسان فرمادی جو بہت ہی شاذ و نادر اہل جرأت کو بھی نصیب ہوتی ہے، کہ حالات کو یکسر بدلا ہو ادیکھ کر اُن کی مطابقت میں وہ فیصلہ فرمائیں جس میں ملت کی صلاح و فلاح ہے نہ یہ کہ اُن بدلے ہوئے حالات میں اپنی آن کا مسئلہ مقدم رکھیں، تب ابن زیاد کو یہ توفیق نہ ہو سکی کہ وہ

ملت کی صلاح و اصلاح کے لیے حضرت حسینؓ کی اس عظیم جذباتی قربانی کی قدر جان لیتا اور اپنی بے جا ضد سے اس واقعہ کا ذمہ دار نہ بنتا جس نے عالم اسلام پر ایک بار پھر خونِ فتنوں ہی کے دروازے نہیں کھول دیئے بلکہ اعتقادی فتنوں کی رگول میں بھی ایک نیا خون دوڑا دیا۔

اللهم احفظنا من شرور انفسنا ومن

سيئات اعمالنا

وصلِّ اللهم وسلم على عبدك ونبيك

سيدنا محمد وعلى اله واصحابه

واذ واجه اجمعين



اختتامیہ

(کتاب کا خلاصہ اور کچھ توضیحات)

کتاب الحمد للہ تکمیل کو پہنچ گئی۔ اس کے اہم نکات و مباحث کو اگر ہم تھوڑے سے لفظوں میں سمیٹ کر بیان کرنا چاہیں تو یوں بیان کر سکتے ہیں کہ:

۱- حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت علی مرتضیٰ کی خلافت کے آغاز ہی سے مسلمانوں میں خانہ جنگی کی جو المناک صورت برپا ہوئی تھی، آنحضرت ﷺ کی پیشین گوئی کے مطابق، اس کا خاتمہ حضرت علیؑ کے جانشین سیدنا حسن بن علیؑ کے ہاتھوں سے ہوا۔ اور وہ اس طرح کہ آپ نے خلافت کا ادارہ تمام تر حضرت معاویہؓ کے لیے چھوڑ کر خود کو اس نزاع سے دستبردار کر لیا۔ یہ ۴۱ھ کی بات ہے جسے اسلامی تاریخ میں ”عام الجملۃ“ (اجتماعیت واپس آنے کا سال کہا گیا ہے)۔

۲- حضرت حسنؓ کے چھوٹے بھائی حضرت حسینؓ اپنے بڑے بھائی کے اس فیصلہ سے متفق نہ تھے مگر جب حضرت حسنؓ کی طرف سے فیصلے پر عملدرآمد ہو گیا تب سے وہ بھی اس کے احترام کو لازم جانتے رہے اور رفتہ رفتہ حضرت معاویہؓ کے ساتھ تعلقات میں خوشگوار کی کیفیت بھی پیدا ہو گئی۔

۳- مصالحت اور خوشگوار کی یہ فضا پندرہ سال تک چلتی رہی۔ جبکہ اس دوران میں حضرت حسنؓ نوے سال میں انتقال فرما گئے تھے۔ مگر سولہویں سال (۵۱ھ) میں حضرت امیر معاویہؓ نے جب اپنے بڑھاپے کے احساس سے اپنے بعد کے لئے کسی کو جانشین اور ولی عہد نامزد کرنے کے لئے سوچا اور پھر اپنے بیٹے یزید کو اس کے لئے موزوں قرار دیا تو نئے سرے سے ایک اختلاف کی صورت پیدا ہونا شروع ہوئی۔ اختلاف کرنے والوں میں صرف حضرت حسینؓ ہی نہیں تھے بلکہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے بیٹے عبدالرحمن بن ابی بکر، حضرت عمر فاروقؓ کے بیٹے عبداللہ بن عمر، حضرت زبیر بن عوامؓ کے بیٹے عبداللہ بن زبیرؓ بھی اس میں شامل تھے۔

۴- اس اختلاف کی سب سے اہم اصولی بنیاد یہ تھی کہ باپ اپنے بعد کے لئے بیٹے کو بطور ولی عہد خلافت نامزد کرے یہ اسلامی خلافت کا نہیں قیصر و کسریٰ کی سلطنت کا دستور ہے۔ دوسری ایک بنیاد بظاہر یہ بھی تھی کہ اصحابِ نبی ﷺ کی موجودگی میں انہی میں سے کوئی منصب خلافت کے لئے موزوں ہو سکتا ہے نہ کہ بعد میں پیدا ہونے والا ایک نو عمر۔ ان دو کے علاوہ ایک تیسری یہ بات جو اس سلسلے میں بیحد مشہور ہے کہ اس اختلاف کی ایک اہم بنیاد یہ بھی تھی کہ یزید بڑا فاسق و فاجر ہے۔ یہ بات کہیں اس اختلاف کی رواداد میں آخر آخر تک نہیں پائی جاتی۔ محض ”زیب داستاں“ کے طور پر بڑھائی گئی بات ہے۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ حضرت امیر معاویہؓ کا نقطہ نظر ان حضرات کے بالمقابل بظاہر یہ تھا کہ خلافت کے سلسلے میں سب سے زیادہ قابل لحاظ چیز مضبوط انتظامی اہلیت اور گرفت ہے۔ اور اس معیار کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ یزید ہی کی خلافت کی شکل میں امید کرتے تھے کہ ادارہ خلافت مضبوط رہے گا اور وہ افراتفری نہیں پھیلے گی جو حضرت عثمانؓ کے بعد پیدا ہو گئی تھی۔ مؤرخین نے اگرچہ یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ حضرت معاویہؓ کے اس فیصلے میں محبتِ پدری کا بھی دخل تھا۔ مگر خود انہوں نے اس طرح کے کسی محرک سے اپنی برأت کا ظہار کیا ہے۔

۵- یہی اختلاف تھا جس سے واقعہ کربلا کی داغ بیل پڑی اور یہ خاص کراہل کو فہ تھے جنہوں نے اس اختلاف کا سلسلہ کربلا کے میدان سے ملادینے میں پورا کردار ادا کیا۔ کو فہ چونکہ حضرت علیؓ کا دار الخلافہ رہا تھا اس لئے قدرتی طور پر حضرت حسینؓ سے قریبی تعلق رکھنے والے لوگ وہاں پائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ یہاں کے لوگوں کی ایک مستقل خصوصیت شوریدہ سری اور تلون مزاجی اور حکمرانوں سے چپقلش بھی تھی۔ اس کی بنا پر ان مذکورہ بالا پندرہ سالوں میں بھی لازماً وہاں ایک بڑا حلقہ ایسے لوگوں کا ہو جانا چاہئے تھا جو حضرت امیر معاویہ کے خلاف کوئی بڑا محاذ قائم ہو جانے کا خواہشمند ہو۔ مزید برآں عبداللہ بن سبا (یہودی منافق) کی ریشہ دوانیوں نے حضرت عثمانؓ کی خلافت کے دور ہی سے وہاں ایک ایسا کالم پیدا کر دیا تھا جسے مرکز خلافت سے محاذ آرائی ہی میں ”اسلام کی خدمت“ نظر آتی تھی۔ ان متعدد عوامل کے تحت کچھ لوگوں نے اولاً تو حضرت حسنؓ کی وفات کے فوراً بعد ہی چاہا تھا کہ حضرت حسینؓ کو از سر نو امیر معاویہ کے خلاف متحرک کر دیں جس میں وہ ناکام رہے۔ اس کے بعد ولی عہدی کے مسئلہ میں اختلاف پر ان لوگوں کی توقعات پھر زندہ ہوئیں اور

حضرت حسینؑ سے رابطہ پیدا کر کے چاہا کہ اس مسئلہ پر آپ کو حضرت معاویہؓ کے خلاف میدان میں اتار دیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اسلامی جمعیت کی حفاظت فرمائی اور ان کا یہ حربہ بھی کارگر نہیں ہو سکا۔ البتہ اس ضمن میں یہ بات ضرور سامنے آگئی کہ اس ولی عہدی کے مسئلہ نے حضرت حسینؑ کی سوچ کو بھی بہر حال اس راہ پر لگا دیا ہے اور حضرت معاویہ کے بعد نکر او کی صورت پیش آجانے کے کافی امکانات ہیں۔

۶- ولی عہدی کے مسئلہ پر جو ایک روایت صحابی رسول حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کو ملزم ٹھہراتی ہوئی ملتی ہے، کہ یزید کی ولیعہدی کی تجویز دراصل ان کے دماغ سے نکلی تھی اور صرف اپنا عہدہ (کوفہ کی گورنری) بچانے کے لئے انہوں نے، یہ جانتے بوجھتے کہ اس کا انجام اسلامی جمعیت کے لئے تباہ کن ہو سکتا ہے، یہ تجویز دی تھی۔ اس روایت کی جانچ کی جاتی ہے تو یہ ایک انتہائی مہمل افسانے سے زیادہ کچھ نہیں نکلتی۔ جبکہ حضرت مغیرہ خود قرآن پاک کی رو سے ایسے درجے کے فضائل والے صحابی ہیں کہ کوئی مضبوط روایت بھی ہو تو ان آیتوں کے مقابلے میں اس روایت کو دیوار سے مار دینے کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہوگا۔

۷- حضرت معاویہؓ نے یزید کی ولیعہدی کے بارے میں مملکت کے ایک بڑے حلقے کا رسمی Formal اعتماد حاصل کر کے اپنے فیصلے کو قطعیت کا درجہ دے دیا مگر اس اعتماد کے ووٹ میں کے اور مدینے کی کمی رہی۔ تب آپ نے وہاں کا ایک سفر کیا تاکہ اس کمی کو (خاص کر مدینہ منورہ کے اعتماد کی کمی کو) دور کیا جاسکے۔ جس کی نمائندگی عبدالرحمن بن ابی بکرؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ اور حسین بن علیؑ کی طرف سے مخالفت کی شکل میں ہو رہی تھی۔

اس سفر کا اور وہاں ان چاروں حضرات سے ملاقات وغیرہ کا جو قصہ تاریخی روایتوں میں مذکور ہے، اس کا بڑا حصہ نہایت مضحکہ خیز اور چاروں بزرگوں کے نام کو قطعی بند لگانے والا ہے۔ البتہ اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح ہوگا کہ ایک طرف تو یہ چاروں حضرات — بشرطیکہ حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ بھی اس وقت زندہ رہے ہوں ورنہ باقی تینوں حضرات — اپنے موقف پر قائم رہے۔ اور دوسری طرف حضرت معاویہؓ بھی اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ یہ اختلاف ختم نہیں ہو سکے گا اور یزید کو اقتدار میں آنے پر اس مخالفت کا سامنا کرنا ہی ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی موت کا وقت آنے پر ان حضرات کے سلسلے میں یزید کو مناسب وصیتیں بھی فرمائیں جن میں حضرت حسین کے لئے ہر ممکن طور سے

حسن معاملہ کی تاکید تھی۔

۸- ولی عہد کی نامزدگی کے چار سال بعد (۶۱۰ھ میں) حضرت معاویہؓ نے انتقال فرمایا اور یزید نے زمامِ خلافت ہاتھ میں لے کر حاکمِ مدینہ کو حکم بھیجا کہ عمائدین مدینہ خاص کر حضرت عبداللہ بن عمرؓ عبداللہ بن زبیرؓ اور حسین بن علیؓ جنہوں نے ولی عہد کی بیعت نہیں کی تھی، ان سے اب خلافت کی بیعت لی جائے (چوتھے حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ کا اس وقت انتقال ہو چکا تھا) حاکمِ مدینہ نے اہل الرائے کے مشورے سے طے کیا کہ عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں تو کسی جلدی کی ضرورت نہیں ہے بے ضرر ہستی ہیں۔ البتہ باقی دونوں حضرات کے بارے میں عجلت اور چوکسی کی ضرورت ہے۔ مگر یہ دونوں حضرات کچھ حاکم کی زمی اور کچھ اپنی حکمتِ عملی کی وجہ سے اس بیعت سے بچنے اور مدینے سے نکل کر مکے پہنچ جانے میں کامیاب ہو گئے۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا تو پیچھا بھی کرنے کی کوشش حکومت کی طرف سے کی گئی جو کامیاب نہ ہو سکی۔ مگر حضرت حسینؓ کے بارے میں کسی تعاقب کی روایت نہیں پائی جاتی۔

۹- شعبان ۶۱۰ھ کے پہلے ہفتہ میں مکہ معظمہ پہنچ جانے کے بعد ۸ رزی الحجہ تک حضرت حسینؓ کا قیام وہیں رہا۔ اور اس درمیان میں رمضان المبارک سے اہل کوفہ کے وفد اور خطوط آپ کے پاس آنا شروع ہو گئے، جن میں کوفہ آکر ان لوگوں کی سربراہی سنبھالنے کی درخواست تھی اور یقین دلایا گیا تھا کہ سارا کوفہ آپ کے ساتھ ہے، جیسے ہی آپ آئیں گے یہاں کے یزیدی حاکم کو نکال کر باہر کر دیا جائے گا۔ آپ نے پوری طرح اطمینان حاصل کرنے کے لئے اپنے چچا زاد بھائی مسلم بن عقیل کو کوفہ بھیجا اور ان کی طرف سے اطمینان کا خط آنے پر حج سے ایک دن پہلے، ۸ رزی الحجہ کو، آپ کوفہ کے لئے روانہ ہو گئے لیکن ٹھیک اسی ۸ رزی الحجہ کو، جبکہ حضرت حسینؓ کوفہ والوں کے اعتماد پر سفر کا قدم اٹھا رہے تھے، مسلم بن عقیل کوفہ والوں کی بے وفائی کا شکار ہو کر حاکم کوفہ عبید اللہ بن زیاد کی گرفت میں آچکے تھے۔ اور دوسرے ہی دن ان کی زندگی کا چراغ بھی گل کر دیا گیا تھا۔ حضرت حسینؓ کو اس کا پتہ راستے کی کافی منزلیں طے کرنے کے بعد چلا اس پر آپ نے واپسی کا ارادہ فرمایا۔ مگر برادرانِ مسلم کے جذبات انتقام آڑے آگئے۔ (جو یہ چاہتے تھے کہ یابد لیس گے یا مر جائیں گے۔) چنانچہ آپ سفر جاری رکھنے پر مجبور ہوئے اور پھر دوسری بار جب آپ نے یہی ارادہ کوفہ سے کچھ قریب پہنچ کر اس وقت کیا جب آپ کو اس بات کی مزید شہادت ملی کہ کوفہ تو پوری طرح عبید اللہ

بن زیاد (حاکم کوفہ) کی گرفت میں ہے اور آپ صرف گرفتار ہو کر ہی اندر جاسکتے ہیں، تب واپسی کیلئے کوئی گنجائش اور کوئی راہ باقی نہیں رہی تھی۔ آپ کی گرفتاری کے لئے فوجی دستے حرکت میں آچکے تھے، آپ نے اس وقت فوری طور پر ایک غیر معمولی فیصلہ کیا یعنی اپنا رخ یزید کے دار الخلافہ دمشق کی طرف موڑ دیا۔ مگر ان فوجی دستوں نے پیچھا کر کے آپ کو جلد ہی رک جانے پر مجبور کر دیا جو ابن زیاد کے حکم کے ماتحت چاہتے تھے کہ آپ کوفہ چلیں۔ یہی جگہ جہاں آپ کو قدم روک لینے پڑے اور جسے آپ کی شہادت گاہ بننا مقدر تھا کر بلا کے نام سے جانی جاتی ہے۔

۱۰- فوجی دستوں کے سردار عمر بن سعد بن ابی وقاص جن کے بارے میں روایتیں یہ تاثر دیتی ہیں کہ ان کے دل میں حضرت حسینؑ کے لئے نہایت نرم گوشہ تھا انہوں نے اندھا دھند کوئی کارروائی کرنے کے بجائے معاملے کو پر امن طریقے سے سلجھانے کی کوشش میں حضرت حسینؑ سے رابطہ قائم کیا اور آپ کی طرف سے یہ خواہش سامنے آنے پر کہ آپ کی تین باتوں میں سے کوئی ایک قبول کر لی جائے۔ یعنی:

۱- واپس ہونے دیا جائے۔

۲- یزید کے پاس چلا جانے دیا جائے یا لے چلا جائے۔

۳- کسی مملکت کی سرحد پر بھیج دیا جائے جہاں آپ مقیم ہو جائیں اور جہادی مہمات میں حصہ

لے کر عمر گزاریں۔

عمر بن سعد نے ابن زیاد (حاکم کوفہ) کو اس کی اطلاع اس طور سے بھیجی کہ جیسے یہ ایک نہایت عمدہ اور قابل قبول بات ہو۔ روایتوں کے مطابق ابن زیاد کو بھی اس صورت حال سے خوشی ہوئی، مگر شمر جیسے مشیر ان نے اس کی رائے پلٹ دی بلکہ عمرو بن سعد سے بھی اسکو کچھ بدگمان کر دیا جس کے نتیجے میں شمر ہی کو بھیجا گیا کہ وہ عمر سے اصل حکم کی تعمیل کرائے۔ یعنی مفاہمت سے یا طاقت سے، جس طرح بھی ممکن ہو حسین اور ان کے ہمراہیوں کو زندہ یا مردہ گرفتار کر کے کوفہ لایا جائے۔ اور یہ چیز اس قتل و قتال کا موجب بن گئی جس نے کر بلا کا نام امر کر دیا۔

۱۱- کر بلا کے میدان کا واقعہ بہت سادہ اور بہت مختصر ہے اور جتنے قصے کہانیاں اس سلسلے میں بیان کی جاتی ہیں جب ان کی جانچ اس وقت اور ماحول کے امکانات و مواقع، روایتوں کے تقابلی، انسانی فطرت اور حضرت سیدنا حسینؑ اور ان کے اہل بیت کے دینی شعور کی روشنی میں کی جاتی ہے تو

یہ تمام کے تمام قصے ایک ایسی من گھڑت داستان بن کے رہ جاتے ہیں جسے بس ابن سبا یہودی کے شیطانی منصوبے کے مطابق ہی گھڑا جاسکتا تھا۔

۱۲- کوفے کے دروازہ بند پا کر اولاً حضرت حسینؑ کی طرف سے خود اپنی کوشش کہ یزید کے پاس دمشق چلے جائیں اور اس میں رکاوٹ پڑنے کے بعد رکاوٹ ڈالنے والی کوفی فوج کے سردار عمر بن سعدؓ کو ان تین باتوں کی پیش کش جن میں سے ایک یہ تھی کہ آپ کو یزید کے پاس بھیج دیا جائے، اس کے بعد حاکم کوفہ کے لئے کوئی جواز باقی نہیں رہتا تھا کہ ان باتوں پر غور کرنے سے پہلے اپنی اطاعت قبول کرنے کی شرط عائد کرے اور کوئی بے جواز وجہ بھی حقیقت میں ایسی نظر نہیں آتی جس سے یہ سوال حل کیا جاسکے کہ جب بات یزید کے ہاتھ میں جارہی تھی اور ایک بھاری مسئلہ بغیر قتل و قتال کے طے ہونے کے پورے امکانات پیدا ہو گئے تھے تو ابن زیاد نے ایک قتل و قتال کو دعوت دینے والی یہ شرط کیوں عائد کر دی؟ لیکن اس کہانی میں یہی تہا ایک مقام نہیں ہے جس کا عقدہ حل کرنے سے عقل عاجز رہی جاتی ہو۔ ہم نے حضرت حسینؑ کے اعزہ و احباب اور خیر خواہ بزرگوں میں کتنوں ہی کو پایا ہے کہ وہ کوفے کی طرف آپ کے ارادہ سفر سے حیران و پریشان ہیں اور ان کی بالکل سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ ارادہ کیسے ایک مناسب ارادہ ہو سکتا ہے؟ اور انہیں اس اظہار حیرانی پر کوئی ایسا جواب بھی نہیں ملتا کہ کچھ مطمئن ہو سکیں۔ (اور آج بھی آدمی خالی الذہن ہو کر پورے قصے کو پڑھے تو وہ حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، یہ الگ بات ہے کہ کوئی اس کے اظہار کو بے ادبی سمجھے)۔

حضرت حسینؑ اور یزید کے قصے پر غور کرنے والے اہل علم و فکر میں سے امام ابن تیمیہؒ نے بھی اس مشکل کو بڑی شدت سے محسوس کیا ہے اور پھر وہ یہ خیال پیش کر کے اسے حل کرتے ہیں کہ:

”حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے لئے اللہ کے یہاں سعادت اور نیک بختی کا وہ بلند مرتبہ طے ہو چکا تھا جس کے لئے کسی نہ کسی طرح کی مصیبت سے گزرنا لازم ہے۔ مگر ان دونوں کو اپنے دیگر اہل بیت کے برخلاف اس کے مواقع حاصل نہ ہو سکے تھے ان کی زندگی اسلام کی اور عزت و عافیت کی گود میں بسر ہوئی تھی۔ بس اس لئے ہی ایسا ہوا کہ ایک بھائی کی موت زہر خورانی سے اور دوسرے کی مظلومانہ قتل سے ہوئی تاکہ اس کے صلہ میں وہ شہداء کا عیش اور اہل سعادت کی منزلت

پائیں۔“

یعنی اس نہ سمجھ میں آنے والے پورے قصے کا ازان کے خیال کے مطابق یہ تھا کہ حضرت حسین مرتبہ شہادت پر فائز ہوں ورنہ یہ قصہ پیدا ہونے کی کوئی بات ہی نہ تھی۔ یا تو حضرت حسینؑ اپنے ہمدردوں کی رائے کے مطابق کوفے کے سفر سے رک گئے ہوتے اور یا پھر ابن زیاد بے وجہ کی ضد پر آمادہ نہ ہوا ہوتا۔

۱۳- اس قتلِ ناحق میں یزید کا کیا کردار ہے؟ اگر بے لاگ انصاف کی نظر ڈالی جائے اور کم از کم شبہ کا فائدہ جو ہر ملزم کو دیا جاتا ہے یزید کو بھی دیا جائے تو اس کا کوئی کردار اس معاملے میں ثابت نہیں ہوتا۔ اور اس کی سب سے کھلی اور سامنے کی دلیل خود حضرت حسین کی آخری وقت کی یہ کوشش اور خواہش ہے کہ آپ کو یزید کے پاس پہنچ جانے کا موقع مل جائے اگر آپ کے لئے ذرا بھی اس خیال و گمان کی گنجائش ہوتی کہ کوفے کی سرکار (انتظامیہ) کی طرف سے جو کچھ آپ کے ساتھ معاندانہ اور سنگدلانہ رویہ اختیار کیا جا رہا ہے اس میں یزید کی مرضی شامل ہے، تو آپ کی طرف سے اس سرکار کوفہ کے نمائندوں کو یہ پیش کش بالکل ناقابل قیاس تھی کہ میں یزید کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دینے کو تیار ہوں۔ ابن زیاد کے ہاتھ اور یزید کے ہاتھ میں یہ تفریق تو آپ اسی اعتماد کی بنیاد پر کر سکتے تھے کہ آپ کی طرف سے مصالخانہ رویہ سامنے آنے کے بعد یزید کی طرف سے کسی غیر شریفانہ رویہ کا سوال نہیں ہے۔

۱۴- اور یہی حقیقت ان روایتوں کو محض خرافات ثابت کرنے کے لئے بھی کافی ہے جو بتاتی ہیں کہ سانحہ شہادت کے بعد حضرت حسینؑ کا سر مبارک اور آپ کے باقیاتِ اہل بیت کو یزید کے پاس پہنچایا گیا تو اس نے توہین اور طعن و تشنیع کا رویہ اختیار کیا۔ ویسے یہ روایتیں فنی معیار پر بھی خرافات ہی ثابت ہوتی ہیں جیسا کہ متعلقہ باب میں ان پر کی گئی بحث سے بالکل صاف ظاہر ہو جاتا ہے۔

حرفِ آخر

کتاب کی تلخیص ختم ہوئی۔ لیکن چند باتیں اور اسی ضمن میں درج کر دینے کی ضرورت ہے۔
۱- کربلا کے حادثے کے سلسلے میں ایک عام تصور یہ ہے کہ یہ حادثہ یزید کی مرضی سے پیش آیا اور اس کا کلیجہ اسکی خبر سے ٹھنڈا ہوا۔ آپ کے ہاتھ کی یہ کتاب، اسکے برعکس، جیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا، یہ ظاہر کرتی ہے کہ واقعے کی ساری روایتوں کو، جو کہ بہت متضاد ہیں، اگر خالی الذہن ہو کر

(یعنی پہلے سے کوئی بات طے نہ کر کے) پڑھا جائے تو ایسا ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض قرآن سے اس کے رنجیدہ ہونے کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

متضاد روایتوں والے اس واقعے کی اصل حقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے، ہمارا کہنا صرف اپنے مطالعے کے نتیجے کے طور پر ہے، جس کا اظہار اس واقعے پر گفتگو کرتے ہوئے ایک علمی اور اخلاقی ذمہ داری تھی۔ ورنہ ظاہر ہے کہ یزید سے ہمارا کوئی رشتہ نانا نہ نہیں کہ اس کو بے تصور بنانے کی فکر کریں اور ان بہت سے لوگوں کی ناراضگی مول لیں جو ایک روایتی تصور کے خلاف بات نہیں سن سکتے۔ بلکہ اسے حسینؑ دشمنی (معاذ اللہ) گردانتے ہیں۔

۲- دوسرا یہ ایک تصور بھی اس قصے میں اتنا ہی عام ہے کہ یزید سخت فاجر و فاسق قسم کا انسان تھا۔ اور یہی ایک بڑی بنیادی بات تھی کہ حضرت حسینؑ اور ان کے دوسرے ہم خیال اس کی خلافت تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔ ہمیں اپنے مطالعے میں اس کی کوئی ادنیٰ شہادت نہیں مل سکی کہ ایسی کوئی بات تھی جو اختلاف کی بنیاد بنی۔ اس لئے اس نتیجے کا اظہار بھی نہ صرف ایک علمی اور اخلاقی ذمہ داری تھی بلکہ اس ذمہ داری کا ایک دینی پہلو بھی تھا۔ جسکی بنا پر نہ صرف اسکا اظہار کرنا بلکہ زور دے کر اظہار کرنا ہمیں لازم تھا۔ اور وہ پہلو یہ تھا کہ اہل سنت و جماعت نے اصحاب نبی ﷺ کو ان کے مرتبوں کے ساتھ ساتھ عادل اور راست باز بلا تفریق مانا ہے اور یزید کو منصب خلافت کے لئے ولی عہد نامزد کرنے والے حضرت امیر معاویہؓ بلا اختلاف اصحاب نبی ﷺ میں شامل ہیں۔ اس لئے اگر ہمارا مطالعہ ہمارے نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ کم از کم حضرت معاویہؓ کی زندگی تک بلکہ حضرت حسینؓ کی زندگی تک بھی جو حضرت معاویہؓ کے بعد بس چھ مہینے اور تھی، یزید کے اندر فسق و فجور کہلانے والی بات کی شہادت نہیں ملتی (۱)۔ تب ہماری یہ ایک دینی ذمہ داری بھی ہے کہ اپنے مطالعے کے اس نتیجے کو پورے زور سے بیان کریں، تاکہ ایک صحابی رسولؐ کی عدالت اور راست بازی پر جو یہ حرف آ رہا تھا کہ انہوں نے ایسے نالائق شخص کو منصب خلافت کے لائق ٹھہرایا، اس سے ان کا دامن صاف ہو جائے اور اصحاب نبیؐ کا جو مقام اہل سنت کے دل میں ہے اس میں بال نہ آنے پائے۔ کیونکہ ان کا یہ مقام ہی ہمارے دین کا پشتہ ہے۔ رہی یہ بات کہ حضرت معاویہؓ کا انتخاب عمومی مصلحت کے لحاظ سے کیسا تھا؟ اس میں گفتگو ہو سکتی ہے اور ہم نے بھی اس میں گفتگو کی

(۱) اور ہماری ساری گفتگو اسی وقت کے بارے میں ہے۔ اس کے بعد کا دور ہماری کتاب کے موضوع سے خارج ہے۔

ضرورت سمجھی ہے۔

۳۔ کتاب کی اولین اشاعت (۱۹۹۲ء) ہی پر مصنف کے وہم و گمان سے بھی بالاتر جو اہمیت اس کو بفضل خدا ملی اس کے پہلو بہ پہلو اس طرح کے تبصرے بھی، جو غیر متوقع ہرگز نہیں تھے، سامنے آئے کہ: اس میں یزید اور حضرت معاویہؓ کی طرفداری زیادہ ہو گئی ہے۔ ایسے تبصروں والے حضرات سے اگرچہ ہم باوجود خواہش کے یہ نہیں معلوم کر سکے کہ ان کا اشارہ کن باتوں کی طرف ہے، لیکن بظاہر انکا اشارہ کتاب کے انہی دو پہلوؤں کی طرف تھا۔ اور ان کے بارے میں ہماری پوزیشن یہی ہے جس کا اوپر اظہار کیا گیا، اسکو ہماری وضاحت سمجھا جائے یا ہماری معذرت! ۳۔ ایک بالکل غیر متوقع بات بھی سامنے آئی۔ اور وہ یہ کہ متعدد اصحاب نے یزید کے ذکر میں بے احترامی کا شکوہ کیا۔ یعنی یہ کہ واحد غائب کے صیغوں اور ضمیروں (تھا۔ نہیں تھا۔ اس اور جس) کا استعمال کیا گیا ہے۔ بلکہ ایک صاحب نے تو اس سے بھی بڑھ کر گرفت کی آپ نے یزید کے اولین خطبے کے حوالے سے جو یہ لکھا ہے کہ:

”رہا یہ کہ وہ کوئی بڑا متقی، پرہیزگار ہو، یہ اس خطبے سے نہیں نکالا جاسکتا۔ ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا۔ اور غالب گمان یہ ہے کہ ایسا نہیں تھا۔“ (۱) تو اس ”غالب گمان“ کی کوئی دلیل دیئے بغیر آپ نے اس بدگمانی کا اظہار کیسے جائز سمجھا؟۔“ (۲)

میرے پاس واقعی دلیل نہیں تھی۔ اسلئے اس (تازہ) ایڈیشن میں یہ غالب گمان والے الفاظ نکالنا اپنا فرض سمجھا اور اس ترمیم کا اظہار یہاں اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ یزید کی طرفداری کا احساس کرنے والے حضرات اس ترمیم کے پس منظر سے واقف ہو جائیں۔

۵۔ طرفداری کا احساس کرنے والے ایک صاحب نے نشاندہی کی کہ یزید کے ایک نائب حاکم مکہ عمر بن سعید العاص الاشدق کی طرف سے حضرت حسینؓ کے ساتھ نرمی اور بھلائی کا سلوک دکھا کر (ص ۱۷۰) تو آپ نے نتیجہ نکالا ہے کہ یہ بغیر یزید کی رضا کے نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر جب عبید اللہ بن زیاد حاکم کوفہ وہ سنگدلی اور سفاکی کرتا ہے جس سے آپ کو بھی انکار نہیں تو آپ کہتے ہیں کہ اس میں یزید کی رضا شامل نہیں تھی! یہ کیسے؟ (۳) سوال بظاہر معقول تھا مگر مجھے یہ بھی

(۱) طبع اول ص ۱۳۱ (۲) یہ خط بھی اور اس سے قبل والے اعتراض کے خطوط بھی القرائن کی جلد ۱۹۹۲ء کے بعض شماروں میں شائع ہو چکے ہیں۔ (۳) یہ اودھ کے ایک خاندان سادات سے تعلق رکھنے والے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے شعبہ انگریزی کے ایک استاذ تھے۔

اطمینان تھا کہ میں نے کہیں دوہرا معیار نہیں برتا ہے۔ کہیں دانستہ ناانصافی نہیں کی ہے۔ اس لئے عرض کیا کہ سوال تو آپ کا معقول ہے مگر جواب میں کتاب دیکھ کر دے سکتا ہوں، میرے ذہن میں موقع کی پوری عبارت نہیں ہے۔ کتاب دیکھنے کا موقع ملا تو میں نے محسوس کیا کہ نہ ان صاحب نے غلط کہا نہ مجھ سے بے انصافی ہوئی۔ میرا قلم کو تانی کر گیا۔ یعنی حاکم مکہ کے رویے سے متعلق عبارت میں چند الفاظ کی کمی رہ گئی جس کے نتیجے میں یہ سوال کسی بھی ناقدانہ ذہن والے قاری کے دل میں پیدا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اب یہ عبارت بریکٹ والے الفاظ بڑھا کر اس طرح کر دی گئی ہے:

”ہمارے خیال میں (یزید کے بارے میں حضرت حسینؑ کے سخت مخالفانہ رویے کے پس منظر میں) یہ بات نہیں سوچی جاسکتی تھی کہ مقامی حکام احترام، نرمی اور چشم پوشی کا رویہ مرکزی حکومت اور دار الخلافہ دمشق کی مرضی کے بغیر کر رہے ہوں۔“

اس ترمیم کے بعد امید ہے کہ کسی کو بھی ان دونوں جگہوں کا فرق سمجھنا مشکل نہ رہے گا اور وہ فرق یہ ہے کہ یزید کی بابت حضرت حسینؑ کے سخت مخالفانہ رویے کو، جو اس کی نامزدگی کے وقت سے چلا تھا، سامنے رکھا جائے تو یہ ممکن نہیں معلوم ہوتا کہ یزید کی حکومت کا کوئی حاکم بغیر اس کی مرضی جانے کوئی ایسا کام کھلے طور پر اور پھر مدت دراز تک کرے گا جس سے حضرت والا کے بارے میں اس کی نرمی اور چشم پوشی کا اظہار ہوتا ہو۔ لیکن سختی کا کوئی قدم ایسے حالات میں کوئی حاکم اٹھاتا ہے تو اس کے بارے میں یہ سمجھنا بالکل بھی ضروری نہیں ہوگا کہ اس خاص قدم کی بھی اوپر سے ہدایت ملی ہے۔ جبکہ وہ حاکم خاص طور سے حضرت حسینؑ کے خطرے سے بچنے ہی کے لئے مقرر بھی کیا گیا ہو۔ جیسا کہ ابن زیاد کا تقرر برائے کوفہ خاص اسی مقصد سے ہوا تھا۔ اس کے علاوہ حضرت حسینؑ کا ابن زیاد کے ہاتھ میں ہاتھ دینے سے انکار کرنا اور یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دینے کے لئے بخوشی تیار ہونا یہ خود اس بات کی کھلی علامت ہے کہ آپ ابن زیاد کے سخت رویہ میں یزید کی مرضی کا عکس نہیں دیکھتے تھے۔

۶- مذکورہ بالا اعتراض ایک درجہ میں معقول اعتراض تھا اور اس کا ذکر اسلئے مناسب سمجھا گیا کہ کسی اور کو بھی متعلقہ مقام پر یہ خیال گزرے تو اس کا دفعیہ ہو جائے۔ لیکن ایک اعتراض اور بھی تھا جو تباہ نکلنے ہی ایک ایسے صاحب کے قلم سے سامنے آیا جو نہ صرف خوب عالم و فاضل بلکہ ہماری ایک نامور علمی و دینی درسگاہ کے نظام تعلیم کے نگران ہیں۔ اس کا ذکر عبرت کے لئے کرنا

مقصود ہے۔ کہ شیعیت نے ہمارے اچھے اچھوں کے دل و دماغ پر کیسا جادو کر رکھا ہے، کہ جب کربلا کے موضوع میں کوئی بات اس کے پھیلانے ہوئے تصورات کے برعکس آجائے تو ایسے لوگ بھی اپنی حیثیت اور اپنے منصب کے تقاضے بھول کر کیا کیا باتیں کرنے پر آجاتے ہیں! یہی کتاب جس کے بارے میں ابھی آپ نے پڑھا کہ اس پر ایک صاحب کو اعتراض ہوا کہ اس میں یہ کیسے لکھ دیا گیا کہ ”غالب گمان یہ ہے کہ وہ (یزید) کوئی بڑا متقی، پرہیزگار نہیں تھا۔“ اور یہی کتاب جس میں مصنف حضرت حسینؑ کے عزیزوں، ہمدردوں اور خیر خواہوں کی وہ منتیں، ساجتیں، وہ فہمائشیں اور گزارشیں دیکھتے ہوئے جو آپ کے قصہ کوفہ پر نظر ثانی کی طالب ہو رہی تھیں اور پھر یہ دیکھتے ہوئے کہ آپ اس وقت اگرچہ نہیں رکتے مگر ایک منزل پر راستے سے ہلنے کا ارادہ فرماتے ہیں تو عجیب عجیب قسم کی رکاوٹیں حائل ہو جاتی ہیں اور پھر یہ دیکھتے ہوئے کہ آپ قضیہ ختم کرنے کے لئے از خود ایک مصالمانہ انداز میں یزید کے پاس چلے جانا چاہتے ہیں تو ابن زیاد کی بیجا ضد سدراہ ہو جاتی ہے (یہ سب دیکھتے ہوئے) اپنے آپ کو بیران و پریشان پاتا ہے کہ آخر ان تمام باتوں کی جو بظاہر نہیں ہونی چاہئے تھیں کیا توجیہ کرے، اور پھر اس وقت جا کر اسے اطمینان کا سانس نصیب ہوتا ہے جب امام ابن تیمیہؒ کے یہاں اس کی توجیہ اسے نظر پڑتی ہے، جو قارئین نے سب سے آخری باب (۱۲) میں پڑھی ہوگی (کہ یہ سب اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے انہیں شہادت کا مرتبہ بلند دینے کی فیہی تدبیر تھی) اسی کتاب کے بارے میں مذکورہ تبصرہ نگار نے لکھا کہ:

”کتاب کا مفروضہ تحقیقی نتیجہ بحث (HYPOTHESIS) یہ ہے کہ یزید ایک مسلمان، خدا ترس، پاک سیرت، خلیفہ برحق تھا..... اور اس کے مقابلے میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ ایک ناعاقبت اندیش، شہنشاہیت کے طالب، بلاوجہ اپنے جان گوانے والے شخص تھے۔“

کتاب کے کسی ایک جملے کا بھی سہارا لئے بغیر، کسی ایک حسبِ مطلب لفظ کی بھی نشاندہی کئے بغیر، یہ خالص انفر اپردازانہ ”نتیجہ بحث“ اس کے ذمے ڈالنے پر بھی تبصرہ نگار کی رگ شیعیت سکون نہیں پاسکی۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر اس نے یہ بھی کہہ ڈالا کہ یہ حضرت حسینؑ کی مخالفت کے پردے میں دراصل رسول اللہ ﷺ سے عناد و عداوت کا اظہار ہے:

”وہ لوگ جو رسول اللہ ﷺ سے دل صاف نہیں رکھتے اور نہ ہی آپ سے بیزاری و کراہیت ظاہر کرنے کی جرأت رکھتے ہیں۔ وہ اس راستے سے اپنے دل کا بخار

نکالتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب مصطفیٰ ﷺ سے فرمایا:

قَدْ نَعَلِمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِي هُمْ كُورِخِ
يَقُولُونَ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَكِنَّ
الظَّالِمِينَ بَيِّنَاتٍ اللَّهُ يَجْحَدُونَ. بلکہ ظالم خدا کی آیتوں سے انکار کرتے ہیں۔

اسی طرح یہ لوگ سیدنا حسینؑ سے نہیں رسول اللہ ﷺ سے عناد کا اظہار کرتے ہیں۔“

یہ عبارت جو کبھی ایک دوسرے تنقید نگار نے ایک ایسے مصنف کے حق میں، اپنے برہم جذبات کے ماتحت لکھی تھی جس نے حضرت حسینؑ کی شہادت کو شہادت ماننے کے بجائے بغاوت کی شرعی سزا بتاتے ہوئے ”قُتِلَ بِسَيْفِهِ جَدِّهِ“ (وہ تو اپنے نانا ہی کی تلوار سے قتل ہوئے) کے الفاظ استعمال کئے تھے۔ اسی عبارت کو یہ ہمارا تبصرہ نگار اس کتاب اور اس کے مصنف کے حق میں دوہرا رہا ہے جس میں کسی ایک لفظ تک کی نشاندہی بھی آج تک کسی ناقد کی طرف سے نہیں ہو سکی جو حضرت حسینؑ کی ادنیٰ شان کے بھی خلاف پڑتا ہو چہ جائیکہ (معاذ اللہ) ان سے عناد کا اظہار! (۱)

ہمیں یہ سمجھنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ کتاب کے بارے میں جو افترا پردازانہ بات تبصرے کے پہلے اقتباس میں ملتی ہے وہ افترا پردازی کی نیت ہی سے لکھی گئی ہے اور نہ ہی اس کے بعد والے مذکورہ بالا اقتباس کے حق میں یہ خیال ہے کہ یہ دانستہ طور سے محض مصنف کو بدنام کرنے کی ایک کوشش ہو۔ بلکہ یہ محض اس شیعیت کے جراثیم کی کار پردازی فی الواقع ہے جس کی رو سے حضرت حسینؑ وہ امام مامور من اللہ ہیں کہ ان کا قول وارشاد اللہ ورسول کا ارشاد ہے اور اس سے اختلاف اللہ ورسول سے جنگ و عناد۔ اور اس کتاب میں ظاہر ہے کہ حضرت حسینؑ کے حضرت معاویہؓ سے اختلاف اور پھر یزید سے اختلاف کا بیان اس شیعہ عقیدے کی رعایت سے الحمد للہ بالکل خالی تھا۔ دوسرے فریق کی بات کو بھی سمجھنے کی کوشش کی گئی تھی اور حضرت حسینؑ کے اپنوں اور ہمدردوں نے آپ کی رائے سے جو اختلاف آپ کی خیر خواہی میں ظاہر کیا اسے بھی بیان میں لایا گیا تھا۔ اس لئے شیعیت کے جراثیم جس دل و دماغ میں پیوست ہوں اس کا رد عمل ایمان داری سے یہی ہونا چاہئے جو اوپر کے اقتباسات میں نظر آتا ہے۔ بلکہ اگر جرأت سے محرومی نہ ہوتی تو اس تبصرہ نگار نے کتاب کے مصنف سے بھی پہلے حضرت امام ابن تیمیہؒ کو ان تیروں کا نشانہ بنایا ہوتا۔ اس لئے کہ مصنف نے

(۱) صادر واقعہ یہ ہے کہ اصلاً جس مصنف کے حق میں یہ عبارت کسی نے لکھی تھی اس کی برہمی تو اس مصنف کے خلاف بجا تھی۔ مگر ان الفاظ میں اس برہمی کا اظہار قطعاً ناروا اور حدود شرعی سے قطعی تجاوز تھا۔ اللہ دونوں کو معاف فرمائے۔

تو کہیں نہیں لکھا کہ اس قصے میں کون صحیح تھا کون غلط تھا۔ بلکہ فیصلہ قارئین پر چھوڑا۔ مگر امام ابن تیمیہ کا ایک اقتباس جو کتاب میں ضمنا آیا ہے اس میں انہوں نے حضرت حسینؑ کے موقف سے شرعا اختلاف کا اظہار بھی ان کو شہید برحق ماننے کے ساتھ ساتھ لیا ہے۔ الغرض یہ جب حسینؑ کے قابل احترام پردے میں شیعیت ہے جو اس طرح کے رد عمل کو عین دین و ایمان سمجھتی ہے۔

۷۔ اور اسی ضمن میں ایک خیال آتا ہے جس کے حوالے سے یہ مذکورہ بالا حقیقت اور بھی روشن ہوتی ہے۔ وہ خیال یہ ہے کہ واقعہ کربلا کو عام طور پر ہم سنیوں کے یہاں بھی ہر سال اس تصور کے ماتحت بطور ایک معرکہ حق و باطل یاد کیا جاتا ہے کہ ایک فاسق و فاجر نے اسلامی تخت خلافت پر قبضہ کر لیا تھا جس سے اسے آزاد کرانے کی خاطر حضرت حسینؑ نے تلوار اٹھانے کی ٹھانی۔ مگر اسی میدان کا ایک اور مرد بھی، جس کا نام عبداللہ بن زبیرؓ ہے۔ جس نے یزید سے لیکر عبدالملک بن مردان تک کے اموی حکمرانوں کے خلاف بارہ برس تک تلوار چلائی۔ اور جب تک سر ہی تن سے جدا نہ ہو گیا تلوار اس کے ہاتھ سے نہ چھوٹی۔ پر اس کی شہادت (جمادی الاولیٰ ۳۷ھ) کا دن آنے پر اسے اور اس کی معرکہ آریوں کو یاد کرنے کا دستور ہم نے کہیں نہیں دیکھا! اور پھر اسی کی معرکہ آریوں کے دور میں واقعہ کربلا کے تین سال بعد وہ واقعہ حرہ پیش آتا ہے جس میں بلا کسی اختلاف روایت کے یزید ہی کے حکم سے مدینہ منورہ (زادھا اللہ تشریفا و تکریمًا) تاراج ہو اور ساکنان مدینہ پر تین دن مسلسل قیامت ٹوٹی۔ مگر ہم نے نہیں دیکھا کہ جب وہ دن سال میں، عشرہ محرم کی طرح، لوٹ کر آتے ہوں تو ان کی یاد میں بھی کوئی روٹا ہو۔ اور ان دنوں کے حوالے سے بھی یزید کو فاسق و فاجر اور ملعون و مردود بتانے کے لیے جلسوں اور مجلسوں کا اہتمام ہوتا ہو! حالانکہ یہی وہ موقع تھا کہ اس کے حوالے سے یزید کو فاسق و فاجر وغیرہ کچھ بھی کہا جاتا تو اس کا جواز فراہم تھا۔ مگر وہ دن تو کسی کو بھی بھول کر یاد نہیں آتے۔ رہے شیعہ تو وہ کہاں اس کے یاد کرنے والے۔ اس سے تو ان کا کام بگڑتا۔ ہاں اگر حضرت علی بن الحسینؑ (زین العابدینؑ) کو خدا انخواستہ اس قصے میں کچھ ہو جاتا تو بیشک یہ دن بھی محرم والا مقام پالیتے مگر ان کے بارے میں یزید کی اپنے کمانڈر کو سخت ہدایت تھی کہ کسی طرح کا گزند نہ پہنچے۔ سو الحمد للہ آپ عافیت سے رہے۔

پتہ نہیں ہم میں سے کتنے ہوں جو اس بہتر سالہ جو ان مرد (عبداللہ بن زبیرؓ) کو کچھ ٹھیک سے جانتے بھی ہوں۔ وہ بذات خود کچھ کم صاحب فضائل آدمی نہ تھے۔ جہادی معرکوں سے تو کتاب

زندگی بھری ہوئی تھی ہی، ذوق عبادت کا بھی عالم یہ تھا کہ شہادت کی خبر پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بھی، جو ان کی یزید وغیرہ کے خلاف معرکہ آرائی کو پسند نہیں کرتے تھے ”صدام و قوام“ (شب زندہ دار اور دن کے روزہ دار) کے حوالے سے اظہارِ افسوس کیا ہے۔ رہا حسب و نسب تو باپ کی طرف سے آپ بیٹے تھے آنحضرت ﷺ کے پھوپھی زاد حضرت زبیر بن العوامؓ کے، جو حواری رسول کا لقب رکھتے تھے اور ان دس صحابہ میں سے ایک تھے جنہیں جنت کی بشارت ملی۔ اور ان کی طرف سے حضرت اسماء بنت ابی بکر الصدیقؓ کی اولاد، جو بنت صدیق ہونے کے علاوہ ”ذات النطاقین“ کا وہ لقب بھی رکھتی تھیں جس سے آنحضرت ﷺ کے سفرِ ہجرت کی ایک خاص یاد وابستہ ہے۔ مرد میدان ہونے کا عالم یہ تھا کہ بہتر سال کی عمر میں بھی بالکل اکیلے رہ جانے کے باوجود دشمن کی فوج قابو پانے سے عاجز تھی۔ اور اس لئے جب یہ شیر مرد پتھروں کی چوٹ کھا کر گرا۔ اور پھر دشمن قابو پاسکا تو یہ اتنی بڑی کامیابی دشمن کو لگی کہ نعرہٴ تکبیر بلند ہوا۔ یاد آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر نے جب یہ تکبیر سنی اور وجہ معلوم ہوئی تو فرمایا کہ یہی وہ تھا جس کی پیدائش پر بھی مدینے میں تکبیر بلند ہوئی تھی۔ کیونکہ مہاجرین کے گھر میں یہ پہلی پیدائش تھی۔ اور غیر معمولی خوشی کا سبب یہ تھا کہ یہود مدینے نے یہ شہرت دے رکھی تھی کہ ان کے عاملوں نے مہاجر ماؤں کے رحم بند کر دئے ہیں۔

الغرض یہ تھے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما جو ہمیں یزید دشمنی کے حوالے سے بھی کبھی یاد نہیں آتے۔ پھر بھی خبردار جو ہمیں شیعیت کا عیب لگایا، خبردار جو قصے کہانیوں سے پردہ اٹھایا۔

ع طاروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا

☆☆☆

اشاریہ

(INDEX)

صفحات	موضوعات
از ۲۹۶ تا ۳۰۲	۱۔ اشخاص
۳۰۳ " ۳۰۲ "	۲۔ مقامات و ممالک
۳۰۴ " ۳۰۳ "	۳۔ اقوام، طبقات، قبائل، مسالک، فرق
۳۰۷ " ۳۰۴ "	۴۔ متفرقات

نوٹ

یہ اشاریہ ہمارے محبت و مہربان جناب قطب الدین ملاح صاحب (بیدگامی) کی محنت و شائقہ کا نتیجہ ہے۔ موصوف نے تو مذکورہ بالا عنوانات سے کہیں زیادہ عنوانات کے ماتحت مواد مرتب کیا تھا مگر ہمیں بس نہایت ضروری پر اکتفا کرنا پڑا۔

- ۳۶۔ ابو جعفر: دیکھے حضرت محمد الباقر
 ۳۷۔ امام اعظم ابو حنیفہ: ۱۲۲
 ۳۸۔ ابو جناب الکلبی: ۱۵۱
 ۳۹۔ (حضرت) ابو سعید الخدریؓ: ۲۶۵، ۲۱۸، ۱۸۷
 ۴۰۔ ابو سفیان: ۷۲، ۴
 ۴۱۔ ابو عبداللہ: دیکھے حضرت امام حسینؓ
 ۴۲۔ ابو عبید: ۹۵
 ۴۳۔ ابو جحیف: ۱۵۱، ۲۹، ۲۷، ۲۶
 ۴۴۔ ابو مسلم خراسانی: ۲۷۰
 ۴۵۔ (حضرت) ابو موسیٰ اشعریؓ: ۱۳۳، ۷۳، ۴۹، ۴۸، ۱۳۳، ۷۳، ۴۹، ۴۸، ۱۳۳، ۷۳، ۴۹، ۴۸
 ۴۶۔ (حضرت) اشع بن قیسؓ: ۱۰۸، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۴
 ۴۷۔ امام احمد بن حنبلؓ: ۱۲۲، ۸۳
 ۴۸۔ حکیم) احمد حسین الہ آبادی (حاشیہ) ۱۵
 ۴۹۔ (شیخ) احمد زینی دحلان: ۱۶
 ۵۰۔ (حضرت) اسامہ بن زیدؓ: ۳۸
 ۵۱۔ (حضرت) اسمعیل علیہ السلام (حاشیہ) ۲۳۵
 ۵۲۔ (حضرت) اسحاق بن ابوبکر صدیقؓ: ۲۹۶
 ۵۳۔ اشتر (مالک بن اشتر) ۳۳
 ۵۴۔ اشعث بن قیس: ۱۸۱
 ۵۵۔ علامہ اقبال: (حاشیہ) ۱۱
 ۵۶۔ المذری بن مشمعل: ۱۹۶
 ۵۷۔ (جسٹس) امیر علی: ۲۳۸، ۲۸
 ۵۸۔ (حضرت) انس بن مالکؓ: ۲۱۸
 ۵۹۔ انور حسین: (فقرو) ۱۲
 ۶۰۔ انور اجندی: (حاشیہ) ۲۳۳
 ۶۱۔ باقر شریف القرشی: ۱۸۳، ۶۷، ۵۳
- ۶۲۔ امام بخاریؓ: (حاشیہ) ۱۳۳
 ۶۳۔ مولانا برہان الدین سنہلی: ۳۱
 ۶۴۔ مولانا محمد تقی عثمانی: (حاشیہ) ۱۲۷
 ۶۵۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ: ۲۶۵، ۲۱۸، ۱۸۷
 ۶۶۔ جعفر بن زبیرؓ: ۱۶۱
 ۶۷۔ (حضرت) جعفر طیار: ۲۳۲، ۲۲۲، ۲۱۸
 ۶۸۔ جویریہ بن بدر تمیمی: ۲۱۳
 ۶۹۔ (حضرت) حبیب: دیکھے حبیب بن مسلمہؓ
 ۷۰۔ (مولانا) حبیب الرحمن اعظمیؓ: ۱۳۳
 ۷۱۔ (حضرت) حبیب بن سلمہ: ۱۳۰، ۳۳
 ۷۲۔ حبیب بن مظاہر: ۲۱۸، ۱۶۹
 ۷۳۔ حجاج: دیکھے، حجاج بن یوسف
 ۷۴۔ حجاج بن یوسف: ۲۶۳، ۱۶۷
 ۷۵۔ حجار بن الجبر ثعلبی: ۱۸۲، (حاشیہ) ۲۲۲، ۲۱۹
 ۷۶۔ حجر بن عدی: ۱۶۳، (حاشیہ) ۱۷۷، (حاشیہ) ۲۲۵
 ۷۷۔ حر بن یزید تمیمی: ۲۰۲
 ۷۸۔ حر بن یزید حظلی: ۲۲۳، ۲۱۳، ۲۱۲، ۲۰۷
 ۷۹۔ (حضرت) حسن بصری: ۲۷۱، ۲۳۶
 ۸۰۔ (حضرت) حسن بن علیؓ: ۴، ۳، ۲، ۳۳، ۳۷، ۴۷
 ۸۱۔ حسن مجتبیٰ: دیکھے حضرت حسنؓ
 ۸۲۔ (حضرت) حسینؓ: ۱۷۳، ۱۶۲، ۶۰، ۵۵، ۵۳
 ۸۳۔ (حضرت) حسینؓ: ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۸، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳

۳۲۔ زورد: ۱۹۹	۳۷۔ لندن: ۱۳۰، ۳۰، ۳۰
(س)، (ش)، (ص)، (ط)، (ع)	(م)، (ن)، (د)، (و)، (ی)
۳۳۔ سنجبل: ۳۱، ۱۲، ۱۱	۳۸۔ مدائن: ۱۷۳
۳۴۔ شام: ۳۶، ۵۰، ۱۱۳، ۱۱۸، ۱۱۳ (حاشیہ)	۳۹۔ مدینہ: ۳۳، ۳۵، ۳۵، ۵۱، ۵۰، ۹۸، ۹۰، ۱۰۵ (حاشیہ)
۳۴ (حاشیہ) ۲۶۳، ۲۰۹، ۲۰۵، ۱۷۰، ۱۷۰	۴۰ (حاشیہ) ۱۰۰، ۱۱۰، ۱۱۳، ۱۱۸، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۳، ۱۵۹، ۱۵۹
۳۵۔ صفحہ: ۱۹۶، ۱۹۵	۴۱۔ ۱۶۵، ۱۶۷، ۱۶۷، ۱۸۳، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۱ (حاشیہ)
۳۶۔ صفحہ: ۳۶	۴۲۔ ۲۹۵، ۲۸۳، ۲۸۳، ۲۷۰، ۲۶۳، ۲۶۲
۳۷۔ طائف: ۷۳، ۷۱	۵۰۔ مراد آباد: ۱۱
۳۸۔ عراق: ۳۳، ۳۶، ۳۶، ۷۳ (حاشیہ)	۵۱۔ مزدلفہ: ۱۹۳
۳۹۔ عرب: ۵۴، ۵۲، ۵۱	۵۲۔ مصر: ۶۲، ۷۷
۴۰۔ عرفات: ۱۹۳	۵۳۔ مکہ: ۱۶، ۳۳، ۱۵۰، ۷۱، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۹ (حاشیہ)
۴۱۔ غوطہ دمشق: ۱۲۷	۱۰۰، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۳، ۱۲۰، ۱۲۰، ۱۵۹، ۱۶۳، ۱۶۵، ۱۶۹، ۱۷۷، ۱۷۷، ۱۸۳، ۱۸۳، ۱۸۵، ۱۸۹، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۸، ۱۹۸
	۲۸۳، ۲۸۳، ۲۰۹
(ف)، (ق)، (ک)، (ل)	۵۴۔ منی: ۱۸۳، ۱۸۷، ۱۹۳
۴۲۔ فارس: ۲۰۳ (حاشیہ)	۵۵۔ موصل: ۲۰۹
۴۳۔ قادسیہ: ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۵، ۲۰۹، ۲۶۶	۵۶۔ نخلہ: ۱۱۹، ۹۷، ۹۳
۴۴۔ کربلا: دیکھئے متفرقات میں واقعہ کربلا۔	۵۷۔ نخلہ شامیہ: ۹۶
۴۵۔ کوفہ: ۱۷۰، ۲۰۰، ۳۳، ۵۶، ۵۸، ۶۱، ۶۲، ۶۵، ۶۶	۵۸۔ نخلہ محمود: ۹۶ (حاشیہ)
۴۳، ۴۳، ۴۶، ۴۷، ۴۷، ۴۹، ۵۱، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۷، ۵۸	۵۹۔ نینوی: ۱۰۹
(حاشیہ) ۱۰۵، ۱۲۱، ۱۳۹، ۱۵۹، ۱۶۵، ۱۷۷، ۱۸۳، ۱۸۳	۶۰۔ وادی قاطرہ: ۹
۱۸۷، ۱۹۰، ۱۹۲، ۱۹۵، ۱۹۷، ۲۰۱، ۲۰۵، ۲۰۹، ۲۰۹، ۳۰۱	۶۱۔ نئی دہلی: ۹
۲۱۳ (حاشیہ) ۲۱۱، ۲۲۰، ۲۲۲، ۲۲۶، ۲۷۲، ۲۷۳	۶۲۔ ہندوستان: ۳۰، ۳۱، ۱
۲۹۲، ۲۸۸، ۲۸۵، ۲۷۸	۶۳۔ یمن: ۱۹۰ (حاشیہ) ۱۹۱
۳۶۔ لکنؤ: ۳۳، ۲۲، ۲۱، ۱۹	۶۴۔ یوپی: ۱۱۰

۱۷۵	۳۴- بنی عبدالمطلب:	۱۲۹	۵۳- سرداران قبائل:
۱۵۷	۳۵- بنی عبدمناف:	۲۹۵، ۲۵۵، ۲۳۸، ۳۰، ۱۳	۵۴- سنی:
۱۲۷	۳۶- بنی کلب:	۱۳۰، ۱۲۹	۵۵- شیخین:
		۲۵۷	۵۶- شہدائے کربلا:
	(ت)، (ث)	۱۷۶، ۱۶۹، ۸۸، ۳۳	۵۷- هیعان علیٰ- هیعان عراق:
		۷۷، ۵۷، ۵۶، ۵۳، ۳۳، ۳۲، ۱۱	۵۸- شیعہ اہل تشیع:
۲۶۹، ۱۰۶، ۱۰۵	۳۷- تابعین:	۲۳۸، ۲۳۷، ۲۳۶، ۲۳۶، ۲۲۹، ۲۱۶، ۲۱۵، ۱۹۶، ۱۹۳	
۲۰۷	۳۸- ترک:	۲۶۰، ۲۵۹، ۲۵۵، ۲۵۳	
۲۶۳	۳۹- ثقفی:	۲۲۷، ۱۳۹، ۲۳ (جذبہ، نقطہ نظر وغیرہ)	۵۹- شیعہ (جذبہ، نقطہ نظر وغیرہ):
		۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۳، ۶، ۵، ۴	۶۰- شیعیت:
	(ح)، (خ)	۲۹۶، ۲۹۳، ۲۹۳، ۲۹۲ (حاشیہ)	۳۵، ۸۱، ۲۲، ۲۳۲ (حاشیہ):
			(ص)
۱۰۰	۴۰- حبشی:		
۱۱	۴۱- خثلی:		
۲۹۲	۴۲- خاندان سادات:	۷۱- صحابہ، صحابی، اصحاب کرام:	۷۰، ۴۹، ۳۳، ۳۱، ۵، ۴
۲۶۲، ۲۵۷، ۲۳۸	۴۳- خاندان، خانوادہ نبوت:	۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱	
۱۳۰	۴۴- خلفائے اربعہ:	۲۸۹، ۲۸۲، ۲۷۸	
۲۶۳، ۱۳۷، ۵۸	۴۵- خلفائے راشدین:		
۲۷۲، ۱۷۳، ۵۲، ۴۷	۴۶- خارجی، خوارج:		
			(ع)
	(د)، (ر)، (س)، (ش)		
۲۰۷	۴۷- دہلم:	۶۲- عباسی (خاندان)	۱۳۱
۸۰، ۱۳	۴۸- رافضی، رافضیت:	۶۳- عثمانی، عثمانی الاصل:	۲۲۷، ۲۲۶
۳۵	۴۹- رصہاں واجبار:	۶۴- عشرہ مبشرہ:	۲۹۶، ۱۲۹
۱۳۲، ۷۷، ۷۳	۵۰- سائبین اولین:	۶۵- عمائدین قریش:	۱۵۷
۲۳۲، ۲۳۱	۵۱- سپائی:		
۲۷۲، ۲۲۵	۵۲- سبط رسول:		
			(ف)، (ق)
		۶۶- قاسق:	۱۱۷

۶۷۔ فاسق و قاجر: ۳۳، ۳۳، ۱۲۳، ۲۸۹، ۲۹۵	۶۸۔ فقہاء: ۱۸۶، ۳۰
(ن)، (و)، (ی)	۶۹۔ قاتلان حسین: ۱۴، ۲۳، ۲۳، ۲۳
۸۹۔ نصاریٰ نصرانی: ۲۳۵، ۲۱۱، ۶	۷۰۔ قاتلان عثمان: ۲۷۳، ۵۰
۹۰۔ درغاء عثمان: ۲۷۳	۷۱۔ قاتلہ قاتلہ حسین: ۱۶۲، ۱۶۷، ۱۸۱، ۱۸۳، ۱۸۹، ۱۹۳
۹۱۔ وفد و فود: ۵۱، ۸۵، ۸۶، ۸۸، ۹۸، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۶، ۱۰۷	۷۲۔ قاتلہ (حاشیہ): ۲۰۹، ۲۰۹، ۲۲۶، ۲۲۸، ۲۳۹
۱۶۹، ۱۰۷	۲۳۰
۹۲۔ بیعتی: ۱۹۲	۷۳۔ قاتلہ حسین کی باقیات: ۲۵۲، ۲۵۲، ۲۵۲، ۲۶۲
۹۳۔ یہود، یہودی: ۱۶، ۳۶، ۳۱۱	۷۴۔ قبائل قبائل: ۶۱، ۱۷۳
	۷۵۔ قبیلہ ثقیف: ۸۷
	۷۶۔ قبیلہ مذحج: ۲۵۹
	۷۷۔ قرآن: ۲۲۵
	۷۸۔ قریش، قریش مکہ، قریشی: ۷۱، ۷۸، ۱۳۰، ۱۳۳
	۲۶۶، ۱۵۹، ۱۵۶، ۱۵۲

۲۔ اہم متفرقات

بیعت، جنگیں، خروج، شرائط مصالحت، شہادت و قتل، صلح و فتح، ولیعہدی

الف — بیعت

۱۔ بیعت الرضوان: ۷۰، ۷۹
۲۔ بیعت عثمانی: ۱۲۹
۳۔ بیعت برائے حضرت حسین: ۱۷۱، ۱۷۷، ۱۷۸
۴۔ بیعت برائے یزید: ۶۹، ۸۸، ۹۸، ۹۹، ۱۰۲، ۱۰۸، ۱۰۹
۱۳۶، ۱۱۵، ۱۱۳

ب — جنگیں

۱۔ غزوہ واحد: ۵، ۳
۲۔ غزوہ بدر: ۵، ۳، ۲۲۳
۳۔ غزوہ تبوک: ۷۲، ۷۶، ۷۹
۴۔ جنگ جمل: ۳۳، ۳۶، ۳۸، ۶۳، ۱۶۳
۲۷۲
۵۔ جنگ صفین: ۳۳، ۳۶، ۳۸، ۶۳، ۱۶۳
۲۷۲، ۲۲۸، ۱۸۱

(م)

۷۸۔ متاخرین: ۱۳۲
۷۹۔ نجوسی: ۲۱۱
۸۰۔ محدثین: ۲۳
۸۱۔ مرتد: ۳۸، ۷۷
۸۲۔ مصری: ۳۳
۸۳۔ معصومین: ۳۱
۸۴۔ طہ، طہ اسلام: ۷۰، ۱۳۰، ۱۳۲، ۲۲۵، ۲۷۹
۸۵۔ منافق: ۷۷، ۲۲۳
۸۶۔ مؤرخین: دیکھئے اہل تاریخ
۸۷۔ مومنین: ۳۵
۸۸۔ مہاجرین: ۷۲

کتابیات

وہ کتابیں جن کا کوئی حوالہ اس کتاب میں دیا گیا ہے

۱- القرآن المسجید

- (ش)
- ۲۰- شرح فتح البلاغہ (عربی) از ابن حدید
- ۲۱- شہید انسانیت (اردو) سید علی نقی صاحب مجتہد
- ۲۲- شیخ محمد بن عبد الوہاب اور ان کے خلاف پروپیگنڈہ (اردو) — از مولانا محمد منظور نعمانی
- (س)
- ۲۳- صحیح بخاری (عربی) از امام محمد بن اسماعیل بخاری
- ۲۴- صحیح مسلم (عربی) از امام مسلم قشیری
- (ع)
- ۲۵- العواصم والتواصم (عربی) از ابو بکر بن العربی
- (ف)
- ۲۶- الفاروق (اردو) از مولانا شبلی نعمانی
- ۲۷- فتح الباری (عربی) از حافظ ابن حجر عسقلانی
- (ل)
- ۲۸- لسان المہدیان (عربی) از حافظ ابن حجر عسقلانی
- (م)
- ۲۹- مروج الذهب (عربی) از المسعودی
- ۳۰- مشکوٰۃ الصالح (عربی) از خطیب ہمدانی
- ۳۱- مصنف عبدالرزاق (عربی) از ابو بکر بن عبدالرزاق
- ۳۲- المعارف (عربی) از ابن قتیبہ
- ۳۳- معجم البلدان (عربی) از احمد بن یعقوب
- ۳۴- مشق الحسین (عربی) از عبدالرزاق موسوی المقرم
- ۳۵- مقدمہ ابن خلدون (عربی) از ابن خلدون
- ۳۶- منہاج السنہ (عربی) از امام ابن تیمیہ
- ۳۷- مؤطا (عربی) از امام مالک
- ۳۸- میزان الاعتدال (عربی) از حافظ ذہبی
- ۳۹- فتح البلاغہ (عربی) از شریف الرضی
- ☆☆☆
- (الف)
- ۲- الاصابہ فی تمییز الصحابہ (عربی) از ابن حجر عسقلانی
- ۳- اسپرٹ آف اسلام (انگریزی) از جنس امیر علی
- (ب)
- ۴- البدایہ والنہایہ (عربی) از حافظ ابن کثیر دمشقی
- (ت)
- ۵- تاریخ ابن خلدون (عربی) از عبد الرحمن بن محمد بن خلدون
- ۶- تاریخ طبری (عربی) از ابو جعفر بن جریر طبری
- ۷- تاریخ کامل (عربی) از ابن اثیر
- ۸- تقریب التہذیب (عربی) از حافظ ابن حجر عسقلانی
- (ج)
- ۹- جامع ترمذی (عربی) از امام ابو عیسیٰ محمد ترمذی
- (ح)
- ۱۰- حیا الامام حسین از باقر شریف قرشی
- ۱۱- حضرت معاویہ اور تاریخی حقائق (اردو) از مولانا محمد تقی عثمانی
- (خ)
- ۱۲- خلاصۃ الکلام (عربی) از شیخ زینی دحلان
- ۱۳- خلافت و ملوکیت (اردو) سید ابو الاعلیٰ مودودی
- ۱۴- خلافت معاویہ و یزید (اردو) محمود احمد عباسی
- (د)
- ۱۵- الدرر المستنیر (عربی) از شیخ زینی دحلان
- (ر)
- ۱۶- روح اسلام (اردو) از محمد ہادی حسن
- ۱۷- رجوع المدینین از مولانا سید حسین احمد مدنی
- (س)
- ۱۸- سنن ابوداؤد (عربی) از امام ابوداؤد سجستانی
- ۱۹- سیر اعلام النبلاء (عربی) از حافظ ذہبی

یہ کتاب

ہندوستانی پاکستانی مبصرین کی نظر میں

”اردو تصنیفات میں تحقیق کی ہمیشہ شدید کمی محسوس کی گئی ہے۔ اور اگر اس تحقیق کا تعلق اسلامی تاریخ کے ایک ایسے المناک واقعہ سے ہو جس کے اندوہناک اثرات تنازع، اختلاف اور تشدد آمیز رد عمل کی صورت میں رونما ہوئے ہوں تو اس کی ضرورت اور اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ مولانا عتیق الرحمن نے اپنی اس تصنیف میں، جسے اُن کے وسیع مطالعہ کا شاہکار کہنا چاہئے، اس علمی ضرورت کو پورا کیا ہے۔“.....

”مولانا عتیق الرحمن کی کتاب فکر انگیز، پُر از معلومات اور تاریخ پر مبنی ہے۔ کربلا کے واقعہ پر تحقیق کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔“ (یونیورسٹی میگزین - کراچی - بابت جولائی ۹۲ء سے ترجمہ)

”اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اصحاب رسول کے سلسلہ میں اُمت کے اجماع عقیدہ احترام و اعتبار کو قارئین کے ذہنوں میں راسخ کرانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے، اور یہی وہ ایک خدمت ہے جو انشاء اللہ اجراءِ خروی سے خالی نہ ہوگی، کیونکہ واقعہ کربلا جیسے اہم نزاعی اور ہنگامہ خیز و ہنگامہ پرور عنوان پر قلم اٹھانے کے بعد ”سبائی اور خارجی“ دونوں فکروں سے دامن بچا کر اہلسنت کی معتدل فکر کو اپنا کر نباہ دینا، اور مقام صحابیت کے سلسلہ میں بنو امیہ و بنو ہاشم کے درمیان تفریق نہ برتنا، اور یک چشمی و کور باطنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بنو ہاشم سے اظہار عقیدت کے لیے بنو امیہ کو، یا بنو امیہ سے اظہار عقیدت کے لیے بنو ہاشم کو مطعون کرنے کی غیر معتدل بلکہ غیر اسلامی فکر سے عافیت کے ساتھ دامن بچالے جانا ہی ایک بہت اہم اور لائق مبارک باد کارنامہ ہے۔“

(ماہنامہ البدر کا کوری بکھنٹو۔ بابت اپریل مئی ۹۲ء)

”واقعہ کربلا اسلامی تاریخ کا ہمیشہ ایک نازک مسئلہ بنا رہا اس لیے اس پر قلم اٹھانا بڑا نازک بلکہ تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ اس لیے کہ یہ مسئلہ دو انتہاؤں کے درمیان ایک راہ اعتدال قائم کرنے کے ہم معنی ہے، اور جب کسی مسئلہ کے سلسلے میں دو انتہاؤں کے ماننے والوں نے اپنی بات کو حقیقت سمجھ لیا ہو تو پھر درمیانی راہ اختیار کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے..... مولانا عتیق الرحمن صاحب نے اس کتاب میں تلوار کی دھار پر چلتے ہوئے بھی اپنے قلم کو بڑی حد تک انتہا پسندی سے بچائے رکھا ہے۔“

(ماہنامہ الرشاد اعظم گڑھ۔ بابت اپریل ۹۲ء)

”فاضل مصنف نے دو انتہاؤں کے درمیان ایک ایسی راہ اعتدال تک پہنچنے کی کوشش کی ہے جس سے نہ کسی صحابی رسول کے کردار پر حرف آئے اور نہ بے جا تعصب سے کام لیا جائے۔ وہ یقیناً اس کوشش میں کامیاب رہے ہیں۔“

(ماہنامہ تدبر لاہور۔ بابت مئی ۹۲ء)